
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
فروری 2024
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944









بانی ——— محمود ریاض
مدیرِ اعلیٰ ——— آذر ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ——— عدنان
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز







فروری 2024
جلد 51 شمارہ 10
قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

افسانے

نظمیں غزلیں

پکوان

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

مُدیر



خواتین ڈائجسٹ فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

لاکھوں سال پرانی دنیا ایک عجوبہ ہے۔ ایک طلسم کدہ ہے۔ جسے دیکھنے کا، ہر انسان کا زاویہ نگاہ اور سوچ مختلف ہے۔ انسان نے اس دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ حیرت کی حدوں کو چھوتی ترقی کی ہے۔ لیکن بلند وبالا پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے والا چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا انسان اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہ سیکھ سکا۔ روز ازل سے آج تک وہ اپنی بشری کمزوریوں پر قابو نہ پاسکا۔ آج بھی اسے اختیار اور اقتدار مل جائے تو وہ اپنے جیسے کمزور انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تل جاتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اسے جو کچھ ملا ہے۔ اس کی مدت بہت مختصر ہے۔ دنیا میں اس کا قیام عارضی ہے۔ دنیا میں وہ ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔

وطن عزیز ایک بار پھر فیصلہ کن موڑ پر ہے۔ ایک بہت اہم مرحلہ سر ہونے جا رہا ہے۔ فیصلہ کیا ہونا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہار جیت، کمال اور زوال اسی کی عطا ہیں۔ بات بس اتنی ہے کہ کمال ہو یا زوال ہمارا سر عجز سے جھکا رہے کہ ہار، جیت زندگی نہیں، زندگی کا حصہ ہے نہ جیت بھی حتمی ہوتی ہے نہ ہار دائمی، جیت ہار میں بدل سکتی ہے۔ اور ہارنے والا جیت بھی سکتا ہے۔

ایک خوش حال اور باوقار زندگی ہم سب کا حق ہے۔ ایک خوش حال معاشرے کی تعمیر میں آپ کا کردار بہت اہم ہے۔ پوری ذمہ داری سے اپنا کردار ادا کریں۔ زندگی سے آپ کی توقعات پوری نہ ہوں تو دل برداشتہ نہ ہوں۔ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ امید کا دامن تھامے رکھیں اور دعا کرتی رہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے بہتری لے کر آئے۔

سالگرہ نمبر

خواتین ڈائجسٹ کا ایک اور سال مکمل ہونے والا ہے۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں

☆ نمرہ احمد کا مکمل ناول......مالا

☆ صوفیہ بٹ کا مکمل ناول......احد

☆ آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول......رفاقتیں

☆ دل کا آنگن سونا ہے......حمیرا شفیع کا ناولٹ

☆ انگنا پھول کھلیں گے......راحت جبیں کا ناول

☆ راشدہ رفعت، صائمہ نور، عمارہ امداد، عنبرین ابدال اور جویریہ مریم کے افسانے

☆ آپ کی پسندیدہ مصنفہ نگہت سیما سے ملاقات

☆ باتیں احمد رفیق سے

☆ کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نماز سے گناہوں کی معافی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے جو فائدہ دینا ہوتا، دے دیتا اور جب مجھے کوئی اور آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ اگر وہ قسم کھاتا تو میں اس پر اعتبار کر لیتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بھی شخص کوئی گناہ کر لیتا ہے، پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتا ہے اور اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے ضرور بخش دیتا ہے۔" (ابو داؤد)

فوائد و مسائل: 1۔ حدیث نبوی قبول کرنے میں احتیاط اور صحیح غلط میں امتیاز کا عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شروع ہوا ہے۔

2۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لیے قسم نہیں لیتے تھے کہ انہیں صحابہ کی روایت پر یقین نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگ حدیث کی اہمیت کو محسوس کریں، اور وہی حدیث بیان کریں جو انہیں خوب اچھی طرح یاد ہو، اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر وہ حدیث کسی کو سنائیں تو پورے اعتماد سے سنائیں کہ حدیث صحیح ہے۔

3۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت پر اتنا یقین تھا کہ ان کی سنائی ہوئی حدیث بے چوں و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔

4۔ وضو اور نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔

5۔ نماز کے باوجود دل میں نادم ہوتے ہوئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرنا ضروری ہے، البتہ بعض چھوٹے گناہ صرف وضو سے یا صرف نماز سے بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

نماز پڑھنا

حضرت عاصم بن سفیان ثقفی رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں نے ذات سلاسل کی جنگ کی لیکن یہ لوگ (عاصم اور ان کے کچھ ساتھی) جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ (بعد میں پہنچے، چنانچہ) وہ لوگ (کچھ عرصہ) محاذ پر مورچہ زن رہے (لیکن دوبارہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تو) پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آگئے۔ اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت ابوایوب اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ عاصم رحمتہ اللہ نے کہا۔

"ابوایوب! ہم تو اس سال جہاد سے محروم رہ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جو شخص چار مسجدوں میں نماز پڑھے، اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے۔"

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "بھتیجے! میں تجھے اس سے آسان عمل بتاتا ہوں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے، جو شخص وضو کرے جس طرح حکم دیا گیا ہے اور نماز اس طرح پڑھے جس طرح حکم دیا گیا ہے تو اس کے گزشتہ عمل معاف ہو جائیں گے۔" عقبہ! کیا یہ حدیث اسی طرح ہے؟ انہوں نے کہا ہاں (اسی طرح ہے۔)" (مسند احمد)

فوائد و مسائل: 1۔ ایک غزوہ ذات سلاسل ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ یہ اور جنگ ہے جو ذات سلاسل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔

2۔ "سلاسل" کا مطلب ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ ہے۔ یہ دونوں جنگیں صحرائی علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے ذات سلاسل کے نام سے معروف ہوئیں۔

3۔ حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا جنگ میں شریک نہ ہونا گناہ نہیں تھا کیونکہ ہر جہاد میں کچھ مجاہد شریک ہوتے ہیں، کچھ ہنگامی حالات کے لیے یا کسی اور جنگ میں شریک ہونے کے لیے یا دوسرے فرائض انجام دینے کے لیے پیچھے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں حضرت عاصم رحمتہ اللہ کا پیچھے رہ جانا شاید ان کی کسی کوتاہی کی وجہ سے پیش آیا ہوگا کہ وہ ارادہ رکھنے کے باوجود شریک نہ ہو سکے ہوں گے، اس لیے انہوں نے اپنا ایک گناہ شمار کیا۔

4۔ چار مساجد سے مراد مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا ہیں جن کی زیارت کے لیے جانے کی ترغیب احادیث میں مروی ہے۔

5۔ حکم کے مطابق وضو اور نماز سے مراد اچھی طرح آداب وسنن کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضو کرنا اور نماز پڑھنا اور نماز میں توجہ اور خشوع وخضوع کا اہتمام کرنا ہے، یعنی بہترین انداز سے وضو کر کے بہترین انداز سے نماز ادا کی جائے۔

6۔ سنت کے مطابق وضو اور نماز اتنا بڑا عمل ہے کہ اس سے بعض بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

گناہوں سے معافی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بھلا بتاؤ! اگر کسی کے گھر کے سامنے (صاف پانی کا) ایک دریا بہتا ہو، وہ اس میں روزانہ پانچ بار غسل کرے تو اس (کے جسم) پر کتنی میل باقی رہ جائے گی؟"

حاضرین نے کہا "بالکل نہیں رہے گی۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نماز گناہوں کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے، جس طرح پانی سے میل کچیل ختم ہو جاتی ہے۔"

فوائد و مسائل: 1۔ مسنون وضو اور نماز سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

2۔ شرعی مسئلہ مثالیں دے کر بیان کرنے سے

زیادہ سمجھ میں آتا ہے اور زیادہ یاد رہتا ہے۔ دوسرے علمی مسائل کی بھی یہی کیفیت ہے۔

نماز قائم کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا سے کم تر ناجائز حرکت کی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے کس حد تک غلطی کی، تاہم زنا نہیں کیا، پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کردی۔

''دن کے کناروں میں بھی نماز قائم کیجیے اور رات کی گھڑیوں میں بھی، یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔'' (سورہ ہود:114)

صحابی نے کہا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ (رعایت) صرف میرے لیے ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو بھی اس پر عمل کرے، اس کے لیے ہے۔''

فوائد و مسائل: 1۔ مرد کا کسی عورت کو اور عورت کا کسی مرد کو گناہ آلود نظر سے دیکھنا، چھونا اور بوس و کنار وغیرہ کرنا یہ سب گناہ کے کام ہیں اور حدیث میں انہیں بھی ''زنا'' قرار دیا گیا ہے، تاہم یہ بدفعلی سے کم درجے کے گناہ ہیں، اس لیے جب کوئی شخص ایسی حرکت کا ارتکاب کرکے دل میں نادم ہو، توبہ کرے اور وضو کرکے نماز پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف ہوجائے گا، البتہ ناجائز جنسی عمل کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ضروری ہے، حد لگ جانے سے وہ بھی معاف ہوجاتا ہے۔

2۔ مومن کے دل میں اللہ کا خوف ہونا چاہیے۔ اگر نفس امارہ اور شیطان کے غلبے سے غلطی ہوجائے تو فوراً اس کے ازالہ اور معافی کی فکر ہونی چاہیے۔

3۔ دن کے کناروں کی نمازیں فجر اور عصر کی ہیں جن کے درمیان ظہر کی نماز آجاتی ہے اور رات کی نمازیں مغرب اور عشاء ہیں، یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

پانچ نمازوں کی فرضیت اور محافظ کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

1۔ آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا: ''اس نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔'' انہوں نے فرمایا: ''اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔'' میں دوبارہ اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے نصف نمازیں معاف فرمادیں۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا۔ انہوں نے فرمایا ''اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔'' میں پھر اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے فرمایا ''یہ (ادا کرنے میں) پانچ ہیں اور یہی (ثواب میں) پچاس ہیں۔ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا۔'' میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ انہوں نے فرمایا: ''اپنے رب کے پاس واپس جائیے۔'' میں نے کہا ''مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہوتی ہے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل: 1۔ یہ حدیث واقعہ معراج کا ایک حصہ بیان کرتی ہے۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا کہ آپ کی امت زیادہ نمازیں پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بنی اسرائیل سے اس قسم کا تجربہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے مطابق نمازیں ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ (صحیح مسلم، حدیث:162)

3۔ پچاس نمازوں کا حکم تبدیل کرکے پانچ

کردینا اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے اور مسلمانوں پر اللہ کا احسان عظیم ہے۔ اس احسان کا شکر صرف اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ پانچوں نمازیں پابندی سے اور پورے آداب کا لحاظ رکھ کر بروقت ادا کی جائیں۔

4۔ پانچ نمازوں کو پچاس قرار دے کر فرمایا کہ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اسی کا قانون ہے کہ صحیح انداز سے خلوص کے ساتھ ادا کی ہوئی نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا لکھا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

"جو نیکی لے کر حاضر ہوا، اس کا دس گنا (بدلہ) ملے گا۔" (الانعام، ۱۶۰)

5۔ آخری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تخفیف کی درخواست کرنے سے اجتناب فرمایا، کیونکہ پانچ پر پچاس کے ثواب کی خوشخبری میں یہ ارشاد تھا کہ اب مزید تخفیف نہیں کی جائے گی۔

عہد

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا۔

"پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں تو جو شخص انہیں اس طرح لے کر حاضر ہوا کہ ان کے حق کو غیر اہم سمجھ کر ان میں کمی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے وعدہ فرمائے گا کہ اسے جنت میں داخل کردے گا اور جو انہیں اس طرح لے کر آیا کہ ان کے حق کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان میں کمی کی (پوری نمازیں ادا نہ کیں) تو اسے اللہ کے ہاں کوئی عہد حاصل نہیں ہوگا، (اللہ کی مرضی ہے) چاہے اسے عذاب دے، چاہے بخش دے۔" (ابوداؤد)

فوائد ومسائل: 1۔ صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ باقی سب نفل ہیں لیکن بعض نمازوں کی تاکید زیادہ ہے بعض کی کم، تاہم ان کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کرنا جائز نہیں کیونکہ فرضوں کی کمی نوافل سے پوری ہوگی۔

2۔ کمی کرنے سے مراد بعض نمازیں ترک کردینا نماز کی ادائیگی کے دوران میں خشوع وخضوع وغیرہ کا خیال نہ رکھنا ہے۔

3۔ دین کے فرائض کو کما حقہ اہمیت نہ دینا اللہ کی رضا سے محرومی کا باعث ہے۔

4۔ نماز صحیح طریقے اور پابندی سے ادا کرنے والا یقیناً جنت میں جائے گا اگرچہ بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے جہنم میں بھی بھیج دیا جائے گا۔

5۔ نماز کو اہمیت نہ دینا مغفرت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے ترک نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح کافر جنت میں نہیں جاسکتا، اسی طرح بے نمازی بھی عذاب کا مستحق ہوگا۔

اسلام

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ انہوں نے فرمایا: ہم مسجد میں بیٹھے تھے کہ اسی اثناء میں ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے مسجد میں اونٹ بٹھایا، اس کا گھٹنا باندھا، پھر کہا۔ "آپ لوگوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ سفید فام جو ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔"

اس آدمی نے کہا "عبدالمطلب کے بیٹے!" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(بات کرو) جواب دے رہا ہوں۔"

اس آدمی نے کہا: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ سے کچھ دریافت کروں گا اور سوال میں سختی ہوگی، آپ دل میں (ناراضی) محسوس نہ کیجیے گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو چاہو پوچھ لو۔" آدمی نے کہا "آپ کو آپ کے رب کی اور آپ سے پہلے لوگوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں (یہی بات ہے۔)“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں (ایسا ہی ہے)“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سال میں اس مہینے (رمضان) کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ گواہ ہے، ہاں۔“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے یہ صدقہ (زکاۃ) لے کر ہمارے غریبوں میں تقسیم فرمائیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے، ہاں“

اس شخص نے کہا:

”میں آپ کی لائی ہوئی (شریعت) پر ایمان لے آیا ہوں اور میں اسے پیچھے اپنی قوم کے افراد کی طرف سے پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔ میں بنوسعد بن بکر (قبیلہ) کا ایک فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں۔“ (صحیح بخاری)

فوائد ومسائل: 1۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد سادہ اور کچی تھی، اس لیے اونٹ وغیرہ کے آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے اونٹوں کے بٹھانے کے لیے جگہ مخصوص ہو۔ اس بنا پر آج کل مسجد کے ساتھ سائیکلوں، اسکوٹروں اور گاڑیوں وغیرہ کے لیے جگہ خاص کی جاسکتی ہے۔

2۔ مجلس میں معزز شخصیت کے لیے نمایاں نشست مخصوص کی جاسکتی ہے تاکہ آنے والے اجنبیوں کو پہچاننے میں مشکل نہ ہو۔

3۔ اگر سائل سوال کرتے ہوئے ادب واحترام کا مناسب خیال نہ رکھ سکے تو عالم کو چاہیے کہ ناراضی محسوس نہ کرے۔

4۔ ایک راوی کی روایت (خبر واحد) قابل قبول ہے جب کہ وہ راوی قابل اعتماد (ثقہ) ہو۔

5۔ عالم کے پاس سفر کر کے جانا اور اس سے مسائل کی تحقیق کرنا مستحسن ہے۔

6۔ نازل سند کے ساتھ حدیث معلوم ہو تو عالی سند حاصل کرنے کی کوشش کرنا اچھی بات ہے۔

7 قرات علی الشیخ بھی حصول علم کا ایک درست طریقہ ہے۔

8۔ جب قوم کسی فرد کو اپنا نمائندہ منتخب کرلے تو پھر اس کی کارروائی پر اعتماد کرنا چاہیے، الا یہ کہ اس سے واضح غلطی سرزد ہوجائے۔

افضل

”میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا، دوسری مسجدوں میں پڑھی جانے والی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔“ (مسلم)

فائدہ: 1۔ ”میری اس مسجد“ سے مراد مسجد نبوی کا صرف وہ حصہ نہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسجد میں شامل تھا بلکہ اس میں ہونے والے بعد کے تمام اضافے بھی شامل ہیں کیونکہ ان اضافوں کی حیثیت الگ مسجد کی نہیں، اس لیے مسجد نبوی کے پرانے یا نئے جس حصے میں بھی نماز ادا کی جائے، یہ ثواب حاصل ہوجائے گا، البتہ اگلی صفوں کی افضلیت جس طرح دوسری مساجد میں ہے، وہاں بھی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

2۔ مسجد نبوی کی ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر نہیں، بلکہ ہزار نمازوں سے بہتر ہے، اسی طرح مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہے، تاہم خشوع وخضوع، آداب وارکان کے لحاظ اور توجہ وانابت وغیرہ کی کمی بیشی کی بنا پر اس ثواب میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

☆☆

آپ خیریت سے ہیں

انشاجی

ایک شخص کے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک گومڑ نکل آیا تھا۔ کسی نے کہا اسپتال جا کر اسے کٹوا دو۔ معمولی سا آپریشن ہوگا۔ پس وہ اسپتال چلا گیا۔ آپریشن کے لیے اس کو بے ہوش کرنے کی دوا دی گئی۔ جس سے اس کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا گیا۔ جس میں ہڈیوں کی سوزش کے جراثیم پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ اسے وہ بیماری لگ گئی۔ اسے اسٹریچر پر لے جا رہے تھے کہ اسٹریچر الٹ گیا۔ جس سے اس کی ٹانگ اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس ضرب سے اس کو دل کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ دم تحریر وہ اس عالم میں ہے کہ اس کے ایک نلکی سانس لینے کے لیے لگی ہے، ایک نلکی پیشاب خارج کرنے کے لیے۔ ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہے۔ اور بازو پٹی میں بندھا گلے کا ہار ہو رہا ہے۔ اب رہا وہ گومڑ۔ اسے سب بھول گئے ہیں۔ وہ جہاں تھا، وہیں ہے۔

یہ خبر ارجنٹائن کی ہے اور کسی کے بارے میں ہے۔ لیکن یہ یہاں کی بھی ہو سکتی تھی اور ہم خوش قسمت نہ ہوتے تو ہمارے بارے میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اپنی ٹانگ کو لیے ہم ایک مقامی اسپتال میں بھی ہو آئے ہیں۔ جہاں ہر کوئی ہر کسی سے شاکی تھا۔ زیادہ تفصیل میں اس لیے نہیں جاتے کہ ہمیں تجربے نے بتا دیا ہے کہ کبھی اسپتالوں کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ کبھی پولیس اور تھانے کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ کسی حاکم وقت کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے بلکہ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب کے مشہور افسانے ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔“ میں ہے، کسی پٹواری کے بارے میں بھی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہر پھر کر واسطہ ان ہی لوگوں سے پڑتا ہوتا ہے۔ شہاب صاحب کے سائل نے جس کی زمین پٹواری نے کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ شکایت تو گورنر کے نام بھیجی تھی، انہوں نے اپنے سیکریٹری کو برائے ضروری کارروائی بھیج دی۔ سیکریٹری نے کمشنر کو، کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو، ڈپٹی کمشنر نے تحصیل دار کو اور تحصیل دار نے اسی پٹواری کو منتقل کر دی کہ اس پر ”ضروری کارروائی کی جائے۔“

پٹواری نے درخواست دہندہ کو بلایا۔ ایک جوتا لگاتا تھا اور درخواست دکھاتا تھا کہ اور دے درخواست گورنر کو۔ بڑا آیا ہماری شکایتیں کرنے والا۔ اس ضروری کارروائی کے بعد درخواست یہ لکھ کر گورنر صاحب کو لوٹا دی کہ مناسب تحقیق کی گئی۔ مدعی جھوٹا ہے۔ جھوٹی درخواستیں دینے کا عادی ہے۔ شکایت داخل دفتر کی جائے۔

☆☆☆

ہم کوئی دس دن سے اپنی ٹانگ سمیت بستر پر پڑے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر منیر الحق ہمیں دیکھ جاتے ہیں اور دلاسا دیتے ہیں کہ چند روز اور میری جان، فقط چند ہی روز۔ انہوں نے نصیحت بھی کی کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم نے نہیں اڑائی۔ لیکن اگر پرایا پھڈا خود آ کر ہماری ٹانگ میں اڑ جائے تو کیا کر سکتے ہیں۔

ایک اور دوست نے فرمایا کہ یہ جو تم دعوے کرتے پھرتے ہو کہ تم کو دولت مل رہی تھی، تم نے اس پر لات مار دی، کوئی بڑا عہدہ مل رہا تھا، اس پر لات مار دی۔ تو ایسے کاموں کا تو یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ہم نے کہا، نہیں صاحب یہ بات نہیں، زبان سے کہنے کی بات اور ہے۔ ہم عزت، شہرت یا عہدے پر لات مارنے والے آدمی نہیں ہیں۔ بات فقط اتنی ہے کہ 31 جنوری کو ریڈیو پاکستان کے سامنے ٹیکسی لینے کے لیے ہم سڑک پار کر رہے تھے کہ غلط سائڈ سے آ کر ٹیلی فون کے محکمے کی ایک جیپ

نے ہمیں ٹکر ماردی اور دور اچھال دیا۔ رپورٹ ہم نے اس لیے نہیں کی کہ اس مقام پر جہاں پانچ طرف سے ٹریفک آتا ہے اور سڑک عبور کرنے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ نہ کوئی زیبرا کراسنگ ہے، نہ کوئی ٹریفک کا آدمی ہوتا ہے۔ ہوتا بھی تو رپورٹ کا کچھ مقام نہ تھا۔ قصور ہمارا تھا۔ ہم کیوں گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ الٹا ہم نے جیپ والے کا شکریہ ادا کیا کہ ہمیں زندہ رہنے دیا۔ خبر اس واردات کی اس لیے کسی کو نہ ہوئی کہ ہمارے شہر میں اگر کوئی گاڑی کسی کو ٹکر مار دے تو یہ خبر نہیں ہے۔ ہاں کوئی آدمی کسی گاڑی کو ٹکر مارے تو خبر بنتی ہے۔

☆☆☆

عباسی شہید اسپتال بہت بڑا عالی شان اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان کر ہماری طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ لیکن اسپتال صرف سنگ و خشت نہیں ہوتا۔ ایکسرے کرنے والا آدمی پون گھنٹے کی تلاش کے بعد ملا اور ملا تو ہم سے ایمرجنسی کی فیس چارج کی۔ لیبارٹری کا نظام جیسا اس اسپتال میں ہونا چاہیے ویسا نہیں ہے۔ ماہر ڈاکٹروں کی بھی کمی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنے بڑے علاقے کے لیے اتنا بڑا اسپتال بنا ہے تو کچھ ماہرین جناح اسپتال اور سول اسپتال سے یہاں منتقل کر دیے جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جناح اسپتال مرکزی حکومت کا ہے۔ سول اسپتال صوبائی حکومت کا اور عباسی اسپتال میونسپل کارپوریشن کا۔ یہاں اکثر ڈاکٹر نئے ہیں۔ بعض تو شاید اسی سال فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ تجربہ کم رکھتے ہیں، لیکن ایک صاحب نے کہا کہ چند سال چیر پھاڑ کرتے رہیں گے اور دوائیں آزماتے رہیں گے تو ان کو بھی تجربہ ہو جائے گا۔ انسان گاتے گاتے ہی کلاونت ہوتا ہے، ویسے ان طالب علم نما ڈاکٹروں کو دیکھ کر ہمیں وہ مریض یاد آتا جو آپریشن ٹیبل پر لیٹا تو کہنے لگا، ڈاکٹر صاحب مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے، کیونکہ یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا بھی تو یہ پہلا آپریشن ہے۔ میں کوئی گھبرا رہا ہوں؟

☆☆☆

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں، لیکن اس تقریب سے بستر پر پڑے سارا سارا دن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے اہل وطن کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے اہل وطن ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم مشرقی تہذیب کے آدمی ہیں۔ ''پہلے آپ'' کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں بھی پہل کرنے کا موقع اہل وطن ہی کو دینا چاہتے ہیں۔ قومی خدمت کا جذبہ ہم میں ایک تو فراغت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ کچھ یار عزیز الحاج جمیل الدین عالی کی صحبت سے جو ہمیں برابر دیکھ رہے ہیں۔ حج کرنے کے بعد سے ہم ان میں نمایاں فرق دیکھ رہے ہیں۔ لہو ولعب کی طرف ان کو رغبت مطلق نہیں رہی۔ خیالات فاسدہ ان میں پہلے بھی نہیں تھے، اب تو اور بھی نہیں رہے۔ غزلوں، دوہوں کو لاحاصل قرار دے کر انہوں نے عزم کیا ہے کہ آئندہ صرف قوالوں کی فرمائش گراموفون کمپنیوں کے لیے لکھا کریں گے۔ ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے دنیا بالکل ٹھیک ہو جائے۔ ہر طرف عربی ہی عربی رائج ہو جائے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی خرابی باقی نہ رہے۔ تبلیغی تقریریں اس جذبے سے کرتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ اگر آپ کو کوئی شخص عربی لباس میں رجز پڑھتا ہوا ننگی شمشیر ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار بحر ظلمات کا راستہ پوچھتا نظر آئے تو نام پوچھنے کی ضرورت نہیں اور کون ہو سکتا ہے۔

☆☆

معروف اداکار

باتیں احمد رفیق سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''احمد رفیق۔''
2 ''پیار کا نام؟''
''احمد ہی بلاتے ہیں۔''
3 ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''9 نومبر/ 1997ء۔''
4 ''قد/ستارہ؟''
''چھ فٹ ایک انچ/عقرب۔''
5 ''مادری زبان؟''
''پنجابی اور اردو۔''
6 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''ہم دو بھائی ہیں میں بڑا ہوں۔''
7 ''فیلڈ میں آمد/گھر والوں کا ردعمل؟''
''بچپن سے ہی پرفارمنگ آرٹ کا شوق تھا اور گھر والے بھی ہمیشہ سے سپورٹ کرتے تھے۔ اس لیے اتنی کامیابی ملی۔''
8 ''تعلیم؟''
''بی اے، سوشل سائنس اینڈ فلم میکنگ۔''
9 ''شہرت کس نے دی؟''
''پہلا ڈرامہ ''وفا کر چلے'' اور شہرت ڈرامہ سیریل ''بدنصیب'' نے دی۔''
10 ''بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟''
''اندھیرے سے۔''
11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''100 درہم کمائے تھے اور اپنے والدین کے ہاتھ میں رکھے تھے۔''
12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''کارٹون۔''
13 ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''تقریباً 11 بجے۔''
14 ''کس چیز کے بغیر صبح ادھوری لگتی ہے؟''
''کافی کے بغیر۔''
15 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''غصہ۔''
16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''امن اور بس امن۔''
17 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''ایمان داری کی بات ہے ابھی تک تو کسی کی بھی نہیں۔''
18 ''2023ء میں کیا کھویا کیا پایا؟''
''چند دوست کھوئے اور بھرپور نعمت پائی۔''
19 ''شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟''
''سب اچھا ہے بس پیسے تھوڑے لیٹ ملتے ہیں۔''
20 ''کھیلوں سے آپ کا لگاؤ/کون سا کھیل پسند ہے؟''
''اسپورٹس سے تو شدید لگاؤ ہے۔ کرکٹ، فٹ بال دونوں ہی بہت پسند ہیں۔''
21 ''زندگی سے کیا سیکھا؟''
''زندگی ہر موڑ پر کچھ نہ کچھ سکھاتی ہی ہے۔''
22 ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''میٹرپیلسٹک (مادی) چیزوں سے خواب نہیں جوڑنے چاہیں۔''
23 ''کس کی خاطر شوبز کو چھوڑ سکتے ہیں؟''
''ایسی آزمائش کبھی آئی نہیں اور نہ ہی کبھی آئے گی۔ ان شاء اللہ۔''

24 "گھر میں کس کی نیند گہری ہے؟"
"چھوٹے بھائی کی نیند گہری ہے باقی سب کی کچی ہے۔"

25 "پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟"
"چار سال کا تھا تو اسٹیج پہ پرفارمنس دی تھی۔ کیفیت تو یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ مزہ بہت آیا تھا۔"

26 "گھر میں کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟"
"چھوٹے بھائی کی۔"

27 "زندگی میں کچھ واپس ملنے کا موقع ملے تو؟"
"بیتے ہوئے بچپن کے کچھ پل۔"

28 "گھر میں آپ کے فیصلے پہ مداخلت کون کرتا ہے؟"
"الحمدللہ کوئی بھی نہیں سب ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔"

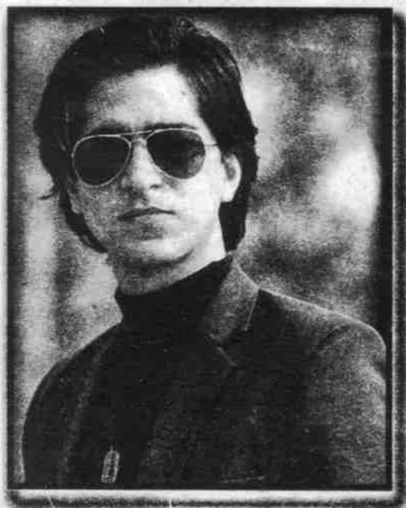
29 "بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟"
"بالکل صحت ہے تو سب کچھ ہے۔"

30 "آپ کے اب تک کے ڈراموں، کمرشلز اور فلمز کی تعداد؟"
"15 سے زیادہ ڈرامے کیے ہیں۔ اور ورلڈ کپ کے وقت ایک کمرشل کیا تھا۔"

31 "کردار کون سے اچھے لگتے ہیں، نیگیٹو یا پوزیٹو؟"
"جس میں پرفارمنس کا مارجن زیادہ ہو۔"

32 "ادب سے آپ کا لگاؤ/کس کو زیادہ پڑھا؟"
"زیادہ تر انگلش لٹریچر پڑھا ہے۔ فکشن ناولز پڑھے ہیں۔ البتہ شاعری سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔"

33 "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"
"ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"



34 "کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟"
"صرف کھانا کھانے کا شوق ہے بھی شیف بننے کا شوق پیدا ہی نہیں ہوا۔"

35 "کبھی سوچا کہ اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟"
"ہیومن کنورسیشن زیادہ ہوتی اور اچھا لگتا۔"

36 "کس شخصیت پہ چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں نکال سکتے؟"
"انسان ہوں غصہ آ ہی جاتا ہے۔ چاہے جو بھی ہو۔"

37 "میٹھے اور نمکین کھانوں میں کیا پسند ہے؟"
"میٹھے میں چاکلیٹ ویفرز اور نمکین میں گوشت پسند ہے۔"

38 "ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں؟"
"جان ہے تو جہاں ہے صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔"

39 "کبھی غربت میں دن گزارے؟"
"الحمدللہ، اللہ نے کبھی سر پر چھت اور پیٹ بھر کھانے سے محروم نہیں کیا۔"

40 "اسٹوڈنٹ لائف میں کس مضمون سے نفرت تھی؟"
"کمپیوٹر اسٹڈیز۔"

41 ''ڈاکٹر حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر اعتبار ہے؟''
''سب ایک ہی فیلڈ کے لوگ ہیں۔ لیکن میں ڈاکٹرز پر زیادہ یقین رکھتا ہوں۔''
42 ''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''
''دووقت کا کھانا (وہ تو سیلانی والے بھی دے دیتے ہیں)''
43 ''کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟''
''لوگوں میں بولنے اور سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ موقعہ ہمیشہ دینا چاہیے۔''
44 ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟''
''چند قریبی دوستوں سے۔''
45 ''مستقبل میں باہر رہنے کا موقع ملے تو آپ کی ایکٹیویٹی کیا ہوگی؟''
''میڈیا سے متعلق کچھ بھی کرلوں گا۔''
46 ''غصے میں آپ کا ردعمل؟''
''منحصر ہے اس بات پر کہ غصہ آ کس پر رہا ہے۔''
47 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''
''عمران اشرف بہترین اینکر ہیں۔''
48 ''آپ کا رازدار کون ہے؟''
''چند دوست۔''
49 ''فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟''
''رعب تو نہیں ہے البتہ پیار اور احترام کا رشتہ ہے۔''
50 ''کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟''
''میں اس معاملے میں بہت برا ہوں۔ چند دوستوں یا لوگوں کی برتھ ڈے یاد رہتی ہے۔''
51 ''ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتے ہیں؟''
''دال، روٹی رائتہ کے ساتھ۔''

52 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟''
''ہر بار لگتا ہے کہ اگلی بار بہتر ہو جائے گا۔''
53 ''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟''
''شکر کرتا ہوں۔''
54 ''کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟''
''کسی بھی اسپورٹس چینل پر خاص طور پر جہاں کرکٹ میچ دکھایا جا رہا ہو۔''
55 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''
''کبھی خوشی کبھی غم۔''
56 ''کوکنگ میں کیا اچھا پکا لیتے ہیں؟ کھانے میں کیا پسند ہے؟''
''صرف انڈے بنانے آتے ہیں اور چکن کو بوائل کرنا آتا ہے۔''
57 ''کون سا کردار کرنے کی خواہش ہے؟''
''کوئی تاریخی رول کرنا چاہتا ہوں۔''
58 ''آپ کا نا قابل فراموش کردار؟''
''عاجو اور بھولا'' میں آجو کا کردار۔''
59 ''کس کردار کو کرنے سے انکار کیا؟''
''تھے کچھ ناپسندیدہ کردار جن کو انکار کر دیا میں نے۔''
60 ''کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتے ہیں؟''
''عمران۔''
61 ''چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟''
''وہاں گریویٹی کم ہے پتھر وہیں گھومتا رہے گا۔''
62 ''کس کام کو کرتے وقت بہت سوچتے ہیں؟''
''کھانا ڈیسائڈ کرتے وقت بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔''
63 ''فلاحی کاموں سے آپ کا لگاؤ؟''
''لگاؤ ہونا بہت ضروری ہے جو لوگ کرتے ہیں

ان کی میرے دل میں بہت قدر و منزلت ہے۔ خود بھی کوشش کرتا ہوں کرنے کی، جتنا مجھ سے ہوسکتا ہے۔"

64 "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"
"زیادہ نہیں صرف شیو کرتے وقت آئینہ دیکھتا ہوں۔"

65 "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"
"بالکل نہیں، اصل میں نئی نسل کی ابتدا ہوتی ہے اور زندگی ایک نئے موڑ پر لے آتی ہے۔"

66 "اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"
"اچھی صحت اور پرسکون زندگی کی دعا کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ صحت ہے تو سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

67 "سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟"
"سڑکوں کا اور مانگنے والوں کا۔"

68 "بچپن میں فلم ٹی وی کے کون سے فنکار پسند تھے؟"
"شاہ رخ خان، رتھک روشن۔"

69 "خواتین رائٹرز میں کون پسند ہیں؟"
"عمیرہ احمد اور فرحت اشتاق۔"

70 "بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلتے تھے؟"
"پلے اسٹیشن 2 کی گیمز وغیرہ فیفا وغیرہ۔"

71 "شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو کس کا خیال پہلے آتا ہے؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ کون سا تہوار چل رہا ہے۔ میں زیادہ شاپنگ کرتا ہی نہیں۔"

72 "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"
"کئی بار لیکن جان بوجھ کر نہیں...... ہاہاہا۔"

73 "کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"
"جب ایک کام کے دوران دوسرے کام کی



آفر کنفرم انداز میں آجائے تو۔"

74 "اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟"
"کھانے پر۔"

75 "ڈ-تھ سین آسانی سے کر لیتے ہیں؟"
"جی ...... صرف آنکھوں میں آنسو لانے ہوتے ہیں۔"

76 "نیند کتنی پیاری ہے؟"
"شدید پیاری ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔"

77 "آپ کے گھر میں کون کون اس فیلڈ سے وابستہ ہے اور کون آنا چاہتا ہے؟"
"کوئی بھی فیلڈ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی آنا چاہتا ہے۔"

78 "بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟"
"ابھی تک تو کسی شکل میں نہیں کی۔ بچت نہیں ہو رہی صرف پیسے اڑا رہے ہیں۔ ہاہاہا۔"

79 "شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟"
"میں کسی بھی رسم کو پسند نہیں کرتا۔ بس سادہ طریقے سے نکاح ہو جانا چاہیے۔"

80 "اگر آپ کا اپنا ریسٹورینٹ ہو تو کھانے

کی کون سی ڈش نہیں رہیں گے؟"
"Sushi" (سوشی)۔"
81 "صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟"
"الحمدللہ۔"
82 "آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟"
"کل کی۔"
83 "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"
"میں" اور میری "مما۔"
84 "کچن سے لگاؤ؟"
"کھانا کی پلیٹ میں ڈال کے لانے کی حد تک کا تعلق ہے میرا کچن سے...... بس۔"
85 "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"
"ایسا کوئی خواب نہیں ہے۔"
86 "پسندیدہ تہوار؟"
"جب بھی اپنے والدین سے ملتا ہوں وہ دن میرے لیے کسی تہوار سے کم نہیں ہوتا۔"
87 "پسندیدہ جانور؟"
"جانور بالکل بھی پسند نہیں ہیں مجھے۔"
88 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"
"دونوں سے۔"
89 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"کافی۔"
90 "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟"
"ایک دن چھوڑ کر یعنی ایک دن گھر پر ایک دن باہر۔"
91 "کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"موبائل۔"
92 "کہاں کھانا پسند کرتے ہیں؟ بیڈ، چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"بیڈ۔"
93 "گھر میں کس کی خاطر اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟"
"کسی کے لیے نہیں ہاہاہا۔"
95 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو کوئی بات نہیں، سب کچھ صرف دو دن کا ہے اور یہ بات ایکسپٹ کر چکا ہوں میں۔"

☆☆

مقبول مصنفہ

نگہت سیما سے ملاقات

شاہین رشید

سورج کو چراغ دکھانے والا محاورہ آپ سب نے سنا ہے۔ یہ محاورہ نگہت سیما پر صادق آتا ہے۔ ان کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے ،ان کا کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے بہت لکھا اور بہت اچھا لکھا،وہ لسی رائٹر ہیں۔اپنی تحریروں میں ہمیشہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اس بار ہم نے آپ کے لیے نگہت سیما سے کچھ باتیں کی ہیں۔تو آیئے نگہت سیما سے ملاقات کرتے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمدللہ......''

''روزمرہ اور آج کل کی مصروفیات کے بارے میں بتائیں؟''

''آج کل کوئی الگ سے مصروفیات نہیں ہیں۔وہی روزمرہ کے کام،دن چھوٹے ہیں تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ہم بہت صبح اٹھتے ہیں اس لیے آٹھ بجے تک ناشتے سے فارغ بھی ہو جاتے ہیں۔(ہم سے مراد میں اور شاہدہ) پھر مختلف کام جیسے کھانا تیار کرنا،گھر کے مختلف کام کرنا،کام والی سے صفائی ستھرائی کروانا۔ بھتیجے کی بیٹیاں جو تین چار سال کی ہیں آجاتی ہیں تو ان کے ساتھ انجوائے کرنا اور یوں فارغ ہوتے ہوتے تین چار بج جاتے ہیں۔

اس پر جب کوئی ملنے والا کہتا ہے کہ برتن ،صفائی اور کپڑے استری کرنا وغیرہ کوئی اور کرتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں سارا دن ،ایک ہانڈی ہی تو بنانی ہوتی ہے۔تو غصہ بھی آتا ہے اور ہم ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ اب ان کو کیا بتائیں سوائے یہ کہنے کہ ''مصروف یوں رہے کہ سدا کچھ نہیں کیا۔''

تین بجے کے بعد ہمارا ریسٹ ٹائم شروع ہو جاتا ہے۔ اس ٹائم میں ڈائجسٹ اور دیگر کتابیں پڑھنا،موبائل پہ فیس بک اور یوٹیوب دیکھنا،اس دوران ،عصر،مغرب اور عشاء سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں۔عشاء کے بعد کچھ لکھ لیتی ہوں۔ جو تقریباً گیارہ بارہ بجے تک کبھی کبھار جاری رہتا ہے ورنہ عموماً میں دس گیارہ بجے تک سو جاتی ہوں۔

فیملی بیک گراؤنڈ؟

میرے والد صاحب پاکستان بننے سے پہلے انڈیا (کلکتہ) میں تھے پاکستان آکر مختلف کام کیے اور کراچی میں اپنا کاروبار سیٹ کیا۔ والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ بہت نرم مزاج،کم گو تھیں اور کبھی اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔ بہت ذہین اور ہر فن مولا تھیں۔ سلائی کڑھائی،کوکنگ،سب میں بہت ماہر تھی اماں جی اور ابا جی پر تو الگ سے ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

میں 25 اگست کو چکوال میں پیدا ہوئی اور اس شہر میں پلی بڑھی۔ میں نے بی اے بی ایڈ اور اردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ کسی حویلی کے مالک نہیں ہیں ہم لوگ،اندرون شہر ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ اسے ہم نے دیکھ رکھا ہے۔

ہم آٹھ بہن بھائی ہیں ماشاء اللہ سے۔ اور میرا نمبر ساتواں ہے دو بڑے بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ابا جی 2001ء میں اور اماں جی 2002 میں انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔اور درجات بلند فرمائے (آمین) میری شادی نہیں ہوئی۔

بچپن کیسا گزرا؟

بچپن بہت مزیدار گزرا،کاش وہ بے فکری کے دن لوٹ کر آ سکتے ،چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھوٹے چھوٹے دکھ،بچپن میں اس دور کے سب ہی کھیل کھیلے،گھر میں

کیرم بورڈ، ڈرافٹ، شطرنج، کروڑ پتی اور کارڈز وغیرہ کھیلے۔ اباجی ہر نئی گیم ہمارے لیے لے کر آتے تھے جیسے واٹر گیم اور ایسے ہی کئی گیمز، ایک بار اردو انگریزی کے الفاظ والے تعلیمی تاش لے آئے۔ پھر ہر وقت چھوٹی چھوٹی ڈکشنریاں ہاتھوں میں لیے رٹا لگایا جا رہا ہوتا تھا۔

بڑے بھائی اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے اور ہم چھوٹے کھیل کود، خصوصاً گرمیوں کی چھٹیوں میں جو کہ کچھ زیادہ ہی طویل لگتی تھیں اس زمانے میں۔ کبھی امی فارغ ہوتیں تو ان کے ساتھ ان کو پارٹنر بنا کر لڈو بھی کھیل لیا کرتے تھے اور مزید فراغت میں کچھ نہ کچھ میگزین ہاتھ میں لے کر مزیدار کہانیاں پڑھ لیا کرتے تھے۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ اس دور کے بہت کھیل کھیلے جیسے آنکھ مچولی، اسٹاپو، پٹھو گرم، گوائرہ چھپا کی، رسی کودنا، ہم تم کو لینے آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ...... گڑیا بازار سے لائی ہوئی اور ہاتھ سے بنائی ہوئی بے شمار تھیں۔ گڑیوں کی شادیاں بھی کیں اور ان کو جہیز میں ہر چیز دی جیسے ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، بیڈ، بیڈ شیٹس، ان کے کپڑے سلائی کرنا اور موتی ٹانکنا، جیولری لینا، آج کی نسل تو ان گیمز اور ان کے نام سے بھی ناواقف ہے۔

ہمارے بچپن میں ہمارے گرمیوں کے اور سردیوں کے کپڑے اباجی کراچی سے اپنے دوست ٹیلر سے سلوا کر لاتے تھے۔ اور جو کپڑا بچ جاتا اس کے گڑیوں کے کپڑے بھی سلوا کے لاتے تھے اور ہمارے لیے ہر طرح کی جیولری بھی لے کر آتے تھے۔

بہن بھائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ بھائی بڑے تھے اور وہ نہ صرف خیال رکھتے تھے بلکہ بہت محبت بھی کرتے تھے البتہ چھوٹے بھائی طارق سے میری کبھی کبھار لڑائی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ مجھے مرغی سے بہت ڈر لگتا تھا اور وہ مرغی میرے اوپر پھینکتا تھا۔ میں آگے آگے بھاگتی اور وہ میرے پیچھے پیچھے۔

اس وجہ سے اباجی سے ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی۔ اباجی سے ہمیں کبھی ڈانٹ یا مار نہیں پڑی۔ بھائیوں کے لیے اباجی کی ہدایت تھی کہ مغرب سے پہلے گھر آ جائیں۔ کوتاہی ہونے پر انہیں ڈانٹ ضرور پڑتی تھی جبکہ وہ گراؤنڈ میں ہاکی یا فٹ بال کھیل رہے ہوتے تھے۔

میں بچپن میں نہ لڑاکا تھی نہ ہی جھگڑالو اور نہ ہی ضدی۔ میرے پاس جو چیزیں ہوتی تھیں وہ کسی کے پاس نہیں ہوتی تھیں۔ پنسلیں، شاپنرز، ٹافیاں، چاکلیٹ، چیونگم اباجی کراچی سے لاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ کھلاڑیوں کی تصاویر والی پنسلیں لے کر آئے تھے۔ فضل محمود کے دور کے کھلاڑیوں والی درجنوں کے حساب سے لاتے تھے۔ جو سالوں تک پڑی رہتی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھی کھلاڑیوں کی تصویر والی پنسل ابو کی الماری سے نکلی ہے۔

میں پڑھا کو نہیں تھی البتہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی تھی، تقریریں، ڈرامے، کھیل، کلاس میں چوتھی یا پانچویں پوزیشن لیتی تھی۔ ہینڈ رائٹنگ اچھی نہیں تھی اس لیے نمبر کٹ جاتے تھے۔ لیکن جب پانچویں کلاس میں اسکالرشپ ملی۔ اس وقت اسکالرشپ کا امتحان لینے جہلم یا راولپنڈی سے ٹیچرز آتی تھیں۔ اسکالرشپ ملی تو خود سے وعدہ کیا کہ اب فرسٹ آنا ہے۔ لیکن کہاں کا وعدہ کیسی وفا۔

ہائی اسکول میں غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے میدان وسیع تھا۔ تقاریر، مباحثے، ڈرامے، اسپورٹس ہر چیز میں حصہ لیا۔ کلاس سکس میں ہی اسکول کی نیٹ بال کی جونیئر ٹیم میں شامل ہو گئی تھی۔ سالانہ اسپورٹس میں لانگ جمپ، ہائی جمپ، ڈسکو تھرو سائیکلنگ میں بھی حصہ لیتی تھی۔ تو پھر پڑھائی میں نویں دسویں پوزیشن میں آتی تھی۔ میٹرک تک یہی حال رہا۔

گھر والوں کو یہ کہہ کر بہلا دیا کہ آتا سب ہے بس رائٹنگ کی وجہ سے نمبر کٹ جاتے ہیں۔ اور کلاس میں بہت پڑھاکو لڑکیاں ہیں بورڈ ٹاپ کرنے والی تو ہماری دال بھلا کیسے گلے گی۔ دراصل میری بہن شاہدہ ٹاپرز میں تھی تو میں تو نالائق ہی سمجھی جاتی تھی میٹرک میں مجھ سمیت سب کا خیال یہ تھا کہ مکمل فیل نہ ہوئی تو ایک دو مضامین میں لازمی آ جائے گی کہ سارا سال تو نصاب کو ہاتھ نہیں لگایا تو ایک دن پڑھ کر کون سا کارنامہ انجام دے پائے گی۔

تب میرے بھائی جان جمیل نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میرے، بہن بھائی آنکھیں بند کر کے الٹے ہاتھ سے بھی لکھیں گے تو بھی فیل نہیں ہوں گے۔ تو ان کا یہ یقین سچ ثابت ہوا۔ اور کالج جا کر کچھ پڑھا تو ایف اے میں اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ سب حیران رہ گئے۔ اچھا یہ بتاؤں کہ امی کی لکھائی بہت خوب صورت تھی۔ اباجی کی اچھی نہیں تھی تو میری لکھائی ابوجی پر گئی۔ میں کسی بھی دور میں نہ سنجیدہ تھی نہ شرارتی بس نارمل تھی۔"

"گھر کا ماحول کیسا تھا ادبی، تعلیمی یا نارمل؟"

"گھر کا ماحول تعلیمی بھی تھا اور ادبی بھی۔ ہوش سنبھالتے ہی سب کے ہاتھ میں کتابیں دیکھیں۔ امی سمیت سب ہی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے۔ اباجی کے پاس ان کے زمانے میں چھپنے والی ساری ہی کتابیں موجود تھیں۔ ان میں مذہبی، تاریخی، ادبی، ہر طرح کے موضوع پر کتابیں ان کے پاس تھیں۔ افسانوں کے مجموعے بھی اور شاعری کی کتابیں بھی۔

اباجی کے پاس اپنے دور کے سب رسالے، ہفتہ روزہ اخبار، اور وہ ان سب کی جلد کروا کے اپنے پاس رکھتے تھے۔ شاہدہ اور طارق بھائی بہت دلچسپی سے ان کو پڑھتے تھے مگر مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ سب کچھ بہت مشکل لگتا تھا۔ میں تاریخی اور جاسوسی ناول پڑھتی تھی۔ پانچویں جماعت تک میں نے نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے وہ سب تاریخی ناول پڑھ لیے تھے جو گھر میں تھے۔ بلکہ خاک وخون اور یلغار تو کئی کئی بار پڑھ لیے تھے۔

پانچویں جماعت سے ہی ابن صفی کے ناول پڑھنے کا چسکا پڑ گیا۔ طارق بھائی لے کر آتے اور جہاں کہیں چھپا کر رکھتے میں ڈھونڈ لیتی تھی۔ "ابن صفی" کے ناول بڑے ہونے کے بعد دوبارہ پڑھے۔

ہم سب بہن بھائیوں کو اباجی اور ماں جی سے ہی مطالعہ کا شوق ملا۔ بڑے بھائیوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن جب میں کلاس تھری میں تھی، اباجی نے میرے نام تعلیم وتربیت لگوادیا تھا۔ اباجی ہر سال ایک ایک رسالہ سب کے نام جاری کروا دیتے تھے۔ طارق ون میں تھا تو اس کے نام بچوں کی دنیا لگوادیا اور شاہدہ پانچویں میں تھی تو اس کے نام "حور" اور زیب النساء لگوادیا۔ اصل میں یہ میگزین امی کے پسندیدہ تھے۔

کبھی کبھی ہم اپنے جیب خرچ سے بھی میگزین خرید لیا کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اپنے اپنے میگزین کو کور چڑھا کر الماری میں بہت سنبھال کر رکھ دیتے تھے۔ جب بھی "دادی" ہمارے گھر آتیں تو ان کی فرمائش پر طارق بھائی لائبریری سے "اے آر خاتون" اور زبیدہ خاتون کے ناول کرایے پر لے آتے تھے اور رات کو شاہدہ پڑھ کر سناتی تھی اور ہم اپنے بستر میں لیٹے لیٹے سنا کرتے تھے۔ اور شاہدہ کو انگریزی ناول پڑھنے کا بھی شوق تھا تو وہ پھر ہمیں اور دادی جان کو ترجمے کے ساتھ سناتی تھی۔

گرمیوں کی راتوں میں ہم تینوں بہن بھائی چھت پر سوتے تھے تو "بیت بازی" کا مقابلہ کرواتے اور جب کوئی شعر یاد نہیں آتا تو خود سے بنا کر سنا دیتے تھے ردیف قافیہ کا تو پتا نہیں تھا بس شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ تو بس اس طرح کا ماحول تھا ہمارا۔ اور اسی ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔

بچپن کی ایک اور یاد...... ریڈیو سننے کا بہت شوق تھا۔ ٹی وی کمپیوٹر، انٹرنیٹ ہمارے ہی سامنے کی ایجادات ہیں۔ ہماری نسل نے بے شمار ایجادات اور تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ چھوٹی سی ٹیپ، ریڈیو میرے ذاتی اثاثے میں شامل تھے اور ابھی تک ہیں۔ لتا، رفیع، طلعت محمود، سے لے کر عابدہ پروین، ٹینا ثانی تک کے کیسٹ پڑے ہیں ابھی تک، ہر ماہ ایک دو خرید لیتی تھی۔ پھر سی ڈیز آگئیں ڈی وی ڈی آ گئے اب سب بیکار ہو گئے ہیں۔

"پہلی تحریر کیا تھی اور کب لکھنے کا ادراک ہوا؟"

پہلی تحریر جب لکھی تو چھپنے کی خوشی ہی لکھنے کا سبب اور محرک بنی۔ اسکول سے آتے ہوئے مہاجر بک ڈپو پر سجے ہوئے بچوں کے رسالے دیکھ کر جی للچاتا تھا کہ ہمارے گھر میں صرف تعلیم وتربیت اور

بچوں کی دنیا ہی آتا تھا اور یہاں کھلونا، غنچہ اور جانے کی کون کون سے میگزین رکھے تھے۔ تو بس ایک دن ''غنچہ'' خرید لیا۔ اس میں ہر ماہ کہانیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ دیے ہوئے عنوان پر کہانی لکھنا ہوتی تھی اور اول، دوم اور سوم آنے والوں کو کہانیوں کی کتابیں تحفے میں دی جاتی تھیں۔ تو میں نے ان کتابوں کے لالچ میں کہانی لکھی۔

اور پہلی کہانی پر ہی اول انعام مل گیا۔ گھر والے سب بہت خوش ہوئے۔ اباجی نے زور قلم اور زیادہ کی دعا دی۔ بس پھر ہر ماہ کہانی لکھنی شروع کر دی اور ہر ماہ ہی کوئی نہ کوئی انعام مل جاتا تھا تو اس طرح لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے لکھاری بنانے میں غنچہ'' کا بڑا ہاتھ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے شہزادوں اور شہزادیوں والی کہانیاں پسند نہیں تھیں اس لیے غنچہ میرا پسندیدہ رسالہ بن گیا۔

اباجی کراچی میں کراچی جنگ لیا کرتے تھے اور بچوں کا صفحہ سنبھال کر رکھ لیا کرتے تھے۔ اور جب گھر آتے تھے تو وہ صفحات بھی لے آتے تھے۔ کیا زبردست ادبی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ تو یوں میں نے جنگ راولپنڈی بچوں کے صفحہ پر کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ پھر اگلے قدم پر خواتین کے اور ادبی صفحے پر لکھنا شروع کر دیا۔ خواتین کے صفحے پر مضامین بھی لکھے۔ چند ایک نظمیں غزلیں بھی شائع چھپوائیں جو کہ بس بھرتی کی ہوتی تھیں۔ مضامین معاشرتی مسائل پر ہوتے تھے۔

ڈائجسٹ کی دنیا میں کیسے اور کب آئیں؟

ڈائجسٹ کی دنیا میں اس طرح آئی کہ ہمارے گھر میں ''سیارہ ڈائجسٹ'' اور ''اردو ڈائجسٹ'' آتے تھے تو میں نے ایک کہانی سیارہ ڈائجسٹ میں لکھ کر بھیجی۔ سید قاسم محمود اور ستار طاہر (مرحوم) ایڈیٹر تھے، انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ کہانی کا نام ''غریب سپاہی'' تھا ان کی حوصلہ افزائی سے میں نے مزید کہانیاں بھی بھیجیں جو کہ باقاعدگی سے چھپنے لگیں ''بھرم'' اور ''اولڈ ایج ہاؤس'' میری ایسی کہانیاں تھیں کہ اگر میں آج بھی اس موضوع پر لکھوں تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتی۔ ''بھرم'' میں ایک جملہ لکھا تھا لکھا تھا جو آج بھی میرے دل پر اثر کرتا ہے ''اس کا وجود تو بی بی کے خالی ڈبوں سے زیادہ حقیر ہو گیا تھا جنہیں بھابھی بیگم نے گیلے کپڑے سے چمکا کر رکھ لیا تھا۔'' اباجی کراچی سے ہمارے لیے BP کی ٹافیاں لاتے تھے۔ بہت خوب صورت چوکور گولڈن کے امتزاج کے ساتھ گرین اور بلو ڈبے ہوتے تھے دو دو پونڈ والے یا کچھ خالی ہونے پر اماں جی ان میں دالیں وغیرہ رکھ لیتی تھی۔

اس طرح شوکت بھائی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے گئے۔ ماسٹرز اور ایم فل کیا۔ وہاں سے واپس آ کر انہوں نے ''اولڈ ایج ہاؤس'' اور وہاں رہنے والے بوڑھے بوڑھیوں کے متعلق بتایا جو کہ ہمارے لیے بالکل نئی بات تھی۔ تو پھر میں نے ''اولڈ ایج ہاؤس'' کی کہانی لکھی۔ جس کے متعلق جمیل بھائی جان نے اباجی سے کہا تھا کہ آپ اسے ضرور پڑھیں۔ اٹ از آ گریٹ اسٹوری سید قاسم (سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر) ہمارے گھر آتے تو انہوں نے اس کے متعلق ایک جملہ کہا تھا۔ ''اس عمر میں اولڈ ایج ہاؤس'' جیسے موضوع کا چناؤ حیران کن ہے۔'' اس طرح کی حوصلہ افزائی لکھنے کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔

اب میں نے دوشیزہ اور ''اوراق'' میں بھی لکھنا شروع کر دیا کہ میں ان دنوں بہت کہانیاں لکھتی تھی۔ ''اوراق'' ادبی پرچا تھا تین چار ماہ بعد آتا تھا تو دوشیزہ نظر آ گیا اس میں بھی مختصر کہانیاں چھپتی تھی۔ ''وزیر آغا'' صاحب نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ ہر کہانی ملنے پر ان کا جوابی خط ضرور آتا تھا جس میں ایک مختصر سا جملہ کہانی کے بارے میں ہوتا تھا اور وہ جملہ میرے لیے بہت قیمتی ہوتا تھا۔

پھر ایک دوست نے ''آنچل'' کے متعلق بتایا تو اس میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ''آنچل'' میں اقبال بانو بھی لکھتی تھیں۔ تو انہوں نے آنچل والوں سے میرا

ایڈریس لے کر مجھے خط لکھا اور ''خواتین ڈائجسٹ'' سے مجھے متعارف کرایا۔ یہ مئی B3 1ء کی بات ہے۔ خواتین سے پھر شعاع اور پھر پاکیزہ، کرن میری ایک کولیگ خریدتیں تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس میں بھی لکھو کہ یہ میں لیتی ہوں۔ تقریباً 40 سال ہوگئے ہیں خواتین کے ادارے سے وابستہ ہوئے۔ ''حنا'' آنگن، بیسویں صدی وغیرہ میں چند ایک کہانیاں لکھیں اور دوسرے پرچوں میں بھی۔

سیارہ ڈائجسٹ میں چھپنے والی پہلی کہانی کا ''اعزازیہ'' 50 روپے ملا تھا۔ خوش گوار سی حیرت اور خوشی ہوئی جب منی آرڈر ملا۔ تب سوچا کہ اچھا اچھی کہانی لکھنے پیسے بھی ملتے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ میں جو آخری کہانی لکھی چھپی اس کا اعزازیہ ''500 روپے ملا تھا۔ ''آنچل سیارہ ڈائجسٹ کے بعد دوسرا پرچا تھا جس نے اعزازیہ پہلی کہانی سے ہی دینا شروع کردیا۔ خواتین اور شعاع نے بھی پہلی کہانی سے ہی اعزازیہ دینا شروع کردیا تھا۔

''لکھنے کے کیا اوقات ہیں پسندیدہ موضوعات کیا ہیں اور پلاٹ کب ذہن میں آتے ہیں؟''

''لکھنے کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا اور نہ ہی ہے۔ جب وقت ملا لکھ لیا۔ زیادہ تر رات کے وقت ہی لکھتی ہوں اس کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کچن میں بھی بیٹھ کر لکھ لیتی۔ مگر اب دل چاہتا ہے کہ لکھتے وقت خاموشی ہو اور آس پاس شور نہ ہو۔

''میں نے ہر موضوع پر لکھا۔ معاشرتی، رومانی، نفسیاتی، کرنٹ افیئرز، وغیرہ، میں بنیادی طور پر شارٹ اسٹوری رائٹر تھی لیکن جب خواتین کے پرچوں میں لکھنا شروع کیا تو پھر طویل افسانے، ناولٹ اور ناول لکھے اور لکھنے کے لیے پلاٹ خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں، کبھی کسی کی مسکراہٹ، کسی کا کہا ہوا جملہ کوئی خوب صورت شعر کہانی لکھنے کا محرک ہوجاتا ہے۔ پاکستان اور دنیا میں ہونے والے واقعات بھی پلاٹ کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ میں نے کشمیر، عراق، فلسطین، ویت نام سب پر لکھا۔ کارگل اور وزیرستان بھی میری کہانی کا موضوع بنے۔ سقوط ڈھاکہ اور بوسنیا بھی۔

ایسا خوش قسمت دن میری زندگی میں کبھی نہیں آیا کہ پلاٹ ذہن میں آتے ہی لکھ بھی لوں۔ کئی بار چلتے پھرتے کام کرتے پوری کہانی کا تانا بانا ذہن میں تھا لیکن لکھ نہیں پائی۔ ایک نشست میں تو اب کوئی کہانی مکمل نہیں کرپاتی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ (ہاں کبھی مختصر کہانیاں ایک ہی نشست میں لکھ لیتی تھی اور بچوں والی کہانیاں ایک سے دو تین دن میں بھی لکھ لیا کرتی تھی) اسی لیے سات آٹھ فائلوں میں آدھی ادھوری کہانیاں لکھی ہوئی پڑی ہیں۔ آج کل ''آنچل'' کے کہنے پر کچھ کام مکمل کررہی ہوں۔ کچھ بیکار لگتی ہیں تو انہیں پھینک دیتی ہوں۔

دلچسپ بات بتاؤں کہ میں نے زیادہ تر کہانیوں کے عنوان پہلے سے سوچے اور کہانیاں بعد میں لکھیں وجہ یہ کہ لکھنے کا آغاز عنوان سے کیا تھا۔ بہت کم کہانیاں ہیں جن کا عنوان بعد میں رکھا۔ اور عنوان بھی کسی شعر سے ذہن میں آتا ہے کبھی کسی ایک لفظ سے جیسے ''گلی گرل''، ''ڈیکوریشن پیس''، ''اسٹیچو ٹل ڈسٹ بن وغیرہ یہ سب میری کہانیوں کے عنوان ہیں۔''

''ہمیشہ لکھتا ہی رہا، یا کبھی تعلیم کا فائدہ بھی اٹھایا؟''

''میں کافی ٹائم تک بلکہ میں نے چالیس سال جاب کی وہ بھی ایک پرائیوٹ اسکول میں۔ ٹیچنگ کی جاب انتہائی تھکا دینے والی تھی۔ بی ایڈ کا رزلٹ بعد میں آیا پہلے میں نے جاب کی۔ میری بڑی بھابی کے رشتے دار تھے ان کا اسکول تھا۔ سوچا فارغ ہوں تو جاب ہی کرلوں۔ پڑھانا کبھی میرا پیشہ نہیں رہا۔ بہت مشکل لگتا تھا میں تو صحافی بننا چاہتی تھی یا ڈرامہ ڈائریکٹر مصور یا فوٹو گرافر، کچھ بھی مگر ٹیچر نہیں۔ بی ایڈ میں بھی اس لیے ایڈمیشن لیا تھا کہ میری فرینڈز جارہی تھیں۔ میں نے تو پنجاب یونی ورسٹی میں

ایڈمیشن کے لیے کاغذات جمع کرائے تھے۔ خالہ جان نے بھی کہا کہ کرلو۔ ایک دن رہتا تھا بی ایڈ کے کاغذات جمع کرانے میں، یہ کیسے جمع ہوئے یہ الگ کہانی ہے۔

میرٹ لسٹ لگی تو میرا نام دوسرے نمبر پر تھا اور جس دوست کے کہنے پر میں بی ایڈ کرنے کے لیے تیار ہوئی تھی اس کا ایڈمیشن ہی نہیں ہوا تو ہم نے کالج فون کر کے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میری جگہ اس کا ایڈمیشن ہو جائے کیونکہ جاب اس کی ضرورت ہے اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے تو جواب میں پرنسپل صاحب نے ،خوب باتیں سنائی کہ کس کے لیے کیا بہتر ہے یہ اللہ جانتا ہے۔ اس کی تو چھ ماہ بعد شادی ہوگئی اور میں نے چالیس سال جاب کی اور جاب سے یہ نقصان ہوا کہ بہت کچھ جو میں کرنا چاہتی تھی وہ کر نہیں پائی۔ اماں جی اور ابا جی کو زیادہ وقت نہ دے پائی۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے اچھا وقت گزر گیا۔

سوچا تھا کہ جاب سے فارغ ہو کر بہت کچھ لکھوں گی ،ادھوری کہانیاں مکمل کروں گی۔ لیکن جاب سے فارغ ہوئی تو لکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ معروفیت جیسے زیادہ ہوگئی تھی اور لوگوں کے رویے۔ خیر اب پھر سے لکھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تو ادھوری کہانیاں مکمل کی ہیں اور کر رہی ہوں پھر کچھ نیا بھی لکھ ہی لوں گی۔"

"ٹی وی کی دنیا سے کیوں دور ہیں؟ کیا آپ ڈرامے لکھتی ہیں؟"

"میں نے بچپن میں غنچہ کے لیے چھوٹے چھوٹے تین چار مزاحیہ ڈرامے لکھے تھے۔ بس پچیس سال پہلے۔ بچوں کے پراہلم پر لکھی جانے والی میری کہانیوں پر پشاور سے کسی نے ڈرامائی تشکیل کے لیے کہا یہ پہلی بار تھا۔ اس کے بعد کئی بار مختلف پروڈکشنز ہاؤس سے آفر ہوئی لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ پھر سیونتھ اسکائی کے لیے "باروفا" لکھا۔ سب اقساط کی پے منٹ بھی ہوگئی لیکن شوٹ پر نہ جاسکا۔ کیوں؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اسکول میں ہونے والے فنکشنز کے لیے ڈرامہ لکھے اور بچوں کو تیار کروایا بس ٹی وی کے سوال پر میری یہی کہانی ہے۔ تو بس جو ملا ہے اللہ کا شکر ہے اور جو نہیں ملا اس کے لیے کبھی تمنا نہیں کی۔

اور پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھے تھے سب، نیلام گھر، کسوٹی، بچوں کے پروگرام وغیرہ...... پھر پرائیویٹ چینلز آگئے تو ٹاک شوز دیکھے، کچھ ڈرامے بھی دیکھے۔ ایک دو تر کی ڈرامے بھی دیکھے۔ لیکن پھر یک دم ٹی وی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اب تو کچھ عرصے سے ٹی وی کیبل نہیں ہے۔ تو گرین چینل کے ایک دو ڈراموں کی تعریف سنی تو انہیں یوٹیوب پر دیکھا۔"

"امور خانہ داری سے کتنا شغف رہا۔ سگھڑ ہیں؟"

"ہر کام سیکھنے کا شوق تھا اور سیکھا۔ سلائی، کڑھائی، پینٹنگ گلاس ورک فلاور میکنگ سب کچھ کیا۔

کوکنگ بی اے کے بعد باقاعدہ کی ورنہ پہلے تو اماں بی اور شاہدہ ہی کرتی تھیں۔ میں نے بس تھوڑا بہت ہاتھ ہی بٹایا۔ اب تو ہر طرح کے کھانے بنالیتی ہوں۔ جیسے دیسی، چائنیز، بیکنگ سب کچھ۔

چھبیس، ستائیس سال پہلے ابھی پیزا پاکستان میں آیا ہی تھا لیکن اس سے پہلے شیریں ہالینڈ گئی تھی تو وہاں کسی لبنان کی لڑکی سے سیکھا تھا تو ہم گھر میں بناتے تھے۔

سیاست سے دلچسپی تھی۔ مگر اب نہیں ہے سیاحت کا بہت شوق تھا۔ دنیا گھومنے کے علاوہ پاکستان کا ہر شہر ہر گاؤں دیکھنے کا شوق ہے۔ موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ گاڑی روک کر ہر گاؤں میں جا کر دیکھوں شام کے وقت سفر کرتے ہوئے دور کسی گھر سے اٹھتا ہوا دھواں اور پرانے گھر، پرانی عمارتیں، مجھے بہت فیسی نیٹ کرتی ہیں۔ ابا جی ہماری چھٹیوں میں ہمیں لاہور شہر سیر کرانے کے لیے لائے تھے۔ اپنے ہوش میں چکوال کے بعد یہ پہلا شہر دیکھا تھا۔ ہوٹل میں قیام تھا تو چار پانچ دن میں انہوں نے سب تاریخی عمارتیں دکھادیں

تھیں واپسی میں پہلی بار ٹرین کا سفر کیا تھا اپنی زندگی میں وہ بھی لاہور سے راولپنڈی تک۔ خوشی اور مسرت کا یہ عالم تھا کہ اندھیرے میں کھڑکی سے چپٹے باہر ہی دیکھتے رہے تھے۔"

"ہم عصر رائٹرز میں کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟"

"میں نے کسی ہم عصر رائٹرز سے متاثر ہو کر لکھنا شروع نہیں کیا بلکہ میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ میں نے انعام ملنے کے لالچ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ویسے میں اپنی تقریباً سب ہی ہم عصر رائٹرز سے متاثر ہوں، پسند کرتی ہوں اور ینگ رائٹرز میں بھی کئی کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔"

"گھر میں آپ کے علاوہ کس کو لکھنے کا اور ادب پڑھنے کا شوق ہے؟"

"گھر میں سب کو ہی ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شیرین نے ایک مضمون خواتین ڈائجسٹ میں لکھا تھا مزاحیہ سا، تو اس پر نوٹ لکھا تھا (احتل نے یا شاید ریاض صاحب نے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں) "کہ ایں ہمہ خانہ آفتاب است"

میرے سب بھائیوں نے اپنے کالج کے زمانے میں شاعری کی اور کالج کے میگزین کے لیے لکھا۔ جاوید بھائی نے دس سال کی عمر میں ایک واقعے پر نظم لکھی تھی جو اباجی کے پاس محفوظ تھی جسے بعد میں انہوں نے مکمل کیا تھا۔ "رقاصہ" کے نام سے اور مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ فیض، یا عدم ان میں سے ایک ان کے اسکول میں آئے تھے مشاعرے میں تو بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ آپ اچھے شاعر بن سکتے ہیں۔ مگر پھر انہوں نے توجہ ہی نہیں دی اپنی جاب اور مصروفیات کے چکر میں وہ "جیالوجسٹ" تھے جاب ٹف تھی۔ لیکن جب "تربیلا" میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بن کے گئے تو کچھ فرصت ملی اور ان کی شاعری غازی میگزین میں چھپنے لگی۔

جمیل بھائی نے بھی خوب صورت نظمیں لکھیں لیکن چھپوائی نہیں۔ طارق بھائی نے تو اپنی شاعری کی کتاب پریم پنگھٹ کی گوری اور شب فرقت چھپوائی۔ ان میں صلاحیت بہت تھی اچھے شاعر اور ادیب بن سکتے تھے۔ اور اب ذکر کروں گی اپنی بڑی بہن شاہدہ طلعت کا ان کی تحریریں بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ شعاع، خواتین، پاکیزہ، آنچل اور دوشیزہ میں لکھا۔ مگر پھر یکدم ہی چھوڑ دیا۔ اس کی تحریر کی خوب صورتی پر ہمیشہ ہی مجھے رشک آیا۔ اس کے پاس بھی ڈھیروں آدھی ادھوری کہانیاں پڑی ہیں۔ میں نے احتل نے بھی کہا کہ ان کو مکمل کر دو۔ لیکن اس کا موڈ ہی نہیں بنا۔ وہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہے نظمیں، غزلیں بلکہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اس نے سب کچھ چھوڑ کر اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک ہائیکو یاد آ رہی ہے آپ کو بھی سناتی ہوں بلکہ لکھتی ہوں۔

جب دیکھا کہ ان لکیروں میں
نام تیرا کہیں رقم ہی نہیں
اپنے ہاتھوں کو میں نے کاٹ لیا
اور غزل کا ایک شعر
فقط نوید نہ دیتا وہ موسم گل کی
وہ میرے خواب کی تعبیر ہو گیا ہوتا"

"اپنی کتابوں کے بارے میں بتائیں کیا کیا منظر عام پر آ چکا؟"

میری اب تک اکتالیس کتابیں چھپ چکی ہیں۔ تین افسانوی مجموعے ہیں باقی ناول، ناولٹ ...... پہلی کتاب 2000 میں چھپی تھی۔ "مراجعت" اس سے پہلے سید قاسم محمود، ستار طاہر اور امراؤ طارق صاحب نے میری کتاب چھپوانے کے لیے منتخب کیں اور چونکہ ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے سو اسے 2002 میں ہی چھپنا تھا۔"

"میرے ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو کہ بچوں کے لیے لکھی ہے۔ "حدیث کہانیاں" یہ پہلا حصہ تھا۔ دوسرا حصہ چھپنے کا کئی سالوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ میری خواہش اپنی مختصر کہانیوں کا مجموعہ

چھپوانے کی ہے لیکن پبلشرز کی ڈیمانڈ ناول ہے۔"

"اپنی ہی تحریر میں کیا خامی کیا خوبی دیکھتی ہیں؟ یا تنقید ہوتی ہے؟"

اللہ کا کرم ہے تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ مجھے اپنی تحریر میں ایک خامی ضرور نظر آتی ہے اور یہ خامی میں ہی جانتی ہوں اور وہ یہ کہ ہمیشہ سے ہی میری یہ عادت رہی ہے کہ جب میں لکھنے لگتی ہوں تو ڈائریکٹ ہی لکھ لیتی ہوں۔ اس کی وجہ شاید وقت کی کمی ہے یا میری مصروفیات ہیں یا پھر میری سستی ہے۔ کچھ بھی سمجھ لیں۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ میری کئی کہانیاں ڈاک میں گم ہو گئیں اور انہیں دوبارہ نہ لکھ سکی۔ ایک پبلشرز میری ایک اسٹوری کئی سالوں سے دبا کر بیٹھے ہیں اور چونکہ میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے اور وہ نہیں چھپی بھی نہیں تو بس وہ بے کار ہو گئی۔ اب تو واپس مانگنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

کئی بار احساس ہوا کہ اسے دوبارہ لکھ لیتی تو زیادہ اچھا لکھ لیتی گھر میں بھائی بھی کہتے تھے کہ دوبارہ لکھا کرو۔ نقل رکھا کرو، مگر میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اور یہ میری کوتاہی تھی۔

انور عنایت اللہ صاحب نے میری دو کہانیوں انگریزی میں ترجمہ کیا تھا ایک "ہیرالڈ" میں چھپوائی۔ ورلڈ شارٹ اسٹوریز رائٹرز کے نام سے یا کچھ اس طرح کا نام تھا، امریکہ سے چھپی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے نیا نیا بی ایڈ کیا تھا اور اس وقت بہت خوشی ہوئی تھی۔ امراؤ طارق صاحب نے بھی میری ایک کہانی "قلعی گر" کا ترجمہ کیا تھا۔ اور بھی کئی کہانیاں منتخب کی تھیں۔ لیکن پھر میرا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

مجھے بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح، شاعری کا بہت شوق تھا۔ پہلی نظم "غنچہ" میں لکھی تھی عنوان تھا۔ "عید آئی ہے" قافیہ ردیف کا اس وقت کچھ پتا نہیں تھا لیکن چھپ گئی۔ البتہ تنقید بہت ہوئی تھی۔ اسکول میں مضامین میں شعر لکھنے کے بجائے خود شعر بنا کر لکھا کرتی تھی۔ کالج کے مشاعروں میں ہمیشہ اول یا دوم انعام لیا کرتی تھی۔ آزاد نظمیں لکھا کرتی تھی۔ چونکہ کہانی نویس تھی اس لیے نظمیں بھی طویل ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا کہ تمہاری نظم میں آزاد نظم کے سب لوازمات ہیں ذرا مختصر لکھا کرو۔ نثری نظم جسے میں "نثر لطیف" کہتی ہوں اس سے بھی ایک ڈائری بھری پڑی ہے۔ کبھی کبھار کسی رسالے میں کوئی ایک آدھ نظم چھپوا دیتی ہوں۔

مجھے فوٹو گرافی کا بھی بہت شوق رہا ہے۔ ایک چھوٹے کیمرے کے علاوہ میرے پاس "یوشیکا" تھا جو میں نے سعودی عرب سے منگوایا تھا۔ قدرتی مناظر اور بچوں کی تصاویر لینا پسند تھا۔ شیریں کی شاعری کی تصاویر میں نے اور اشفاق بھائی نے ہی بنائی تھیں اپنے اپنے کیمرے سے اور زبردست رزلٹ آیا تھا۔"

"آپ نے کہا کہ میں ڈائریکٹ ہی لکھ لیتی ہوں کاپی بھی نہیں ہوتی تو اب تو زمانہ فوٹو اسٹیٹ کا ہے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا آپ نے؟"

"یہی تو خامی ہے مجھ میں شاید ہمیشہ وقت کی کمی رہی ہے گھر میں سب ہی کہتے تھے کہ ایک بار لکھنے کے بعد دوبارہ لکھ لیا کرو مگر نہیں۔ جب کہانیاں گم ہوئیں تو فوٹو اسٹیٹ کروا لیتی تھی۔"

"گھر میں کس کس نے آپ کی حوصلہ افزائی کی کہ آج آپ اس مقام پر ہیں؟"

"امی ابو کے علاوہ بھائی جان جاوید اور بھائی جان جمیل میری تحریروں کو بہت سراہتے تھے۔ حالانکہ جاوید بھائی کی زندگی میں تو میں اور شاہدہ صرف بچوں کے رسالوں اور اخبارات میں ہی لکھا کرتی تھیں لیکن جاوید بھائی بہت فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتے تھے کہ یہ میری چھوٹی بہنوں نے لکھا ہے۔ ہماری تحریر کے حوالے سے جو تعریفی خطوط چھپتے تھے ان کی کٹنگ بھی ان کے بریف کیس سے ملیں ان کی وفات کے بعد۔

اسی طرح جمیل بھائی زیادہ تر انگریزی ادب اور کتابیں پڑھتے تھے۔ لیکن میری اور شاہدہ کی کہانیوں کے لیے خواتین کے رسالے لیتے تھے مثبت

تنقید کرتے تھے اور مشورے بھی دیتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے لیے لکھنا چاہا تو مجھے کتابیں لا کردیں۔ ایئر فورس کے میس سے اپنے ایک دوست جو کہ آرمی میں کرنل تھے اور جنگی قیدی بھی رہ چکے تھے۔ انہیں گھر پر دعوت دی کہ تم نے جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لینا، انہوں نے بہت کچھ بتایا تھا۔ کچھ باتیں میں نے نوٹ کرلیں۔ چھٹیوں میں ان کے پاس راولپنڈی گئی ہوئی تھی۔ بھائی کہتے تھے کہ جب بھی لکھو حقائق کے ساتھ لکھو، لیکن ابھی میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ ان کی ڈیتھ ہوگئی۔ پھر تقریباً دو سال تک میں نے کچھ نہیں لکھا۔

کافی عرصے بعد میں نے ''شکستہ آب گینے لکھا جو شعاع میں لکھا۔ جو پوائنٹ نوٹ کیے تھے وہ گم ہو چکے تھے اور بہت کچھ بھول گئی تھی۔

میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میں کچھ ایسا ضرور لکھوں، جس سے معاشرے میں کچھ اصلاح کرسکوں، 1982ء میں، میں بی ایڈ کی طالبہ تھی تو ان دنوں اخبارات میں پورے پورے صفحات کے اشتہار شائع ہوئے تھے۔ بنگالی جادوگر، کالے جادو کے ماہر، مجھے ایسے اشتہارات دیکھ کر بہت حیرت ہوتی تھی اور میری سوچ یہ تھی کہ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے تو اس طرح کھلے عام اس طرح کے اشتہارات نہیں ہونے چاہئیں۔

وہ دور جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ ہم نے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر ایک خط لکھا اور ان کے مقرر کردہ شکایت آفس میں بھجوادیا۔ ان دنوں ہمارے خط پر فوراً ایکشن لیا گیا اور اشتہارات آنے بند ہوگئے اور آرمی نے جگہ جگہ ان جادوگروں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ اب پتا نہیں یہ خط کا اثر تھا یا ویسے ہی حکومت نے ایکشن لیا تھا مگر ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ خط کا اثر تھا۔ بعد میں پھر میں نے اس موضوع پر کہانی بھی لکھی تھی ''سرطان'' کے نام سے اور اب دیکھیں آج کل پھر وہی حال ہے کاش کوئی اس طرف پھر توجہ دے۔''

''مزید کچھ اپنے بارے میں بتانا چاہیں گی؟''

''میرا پورا اور اصلی نام زاہدہ نگہت ہے۔ نگہت سیما قلمی نام ہے۔ رسالے ''غنچہ'' میں ہر ماہ ناقابل اشاعت والوں کی بھی ایک فہرست ہوتی تھی تو اس ڈر سے نام تبدیل کیا کہ طارق مذاق نہ اڑائے ناقابل اشاعت میں نام دیکھ کر، کیونکہ کہانی تو اسی نے پوسٹ کرنی ہوتی تھی۔ شاہدہ نے بھی میری تحریر کے فوراً بعد غنچہ میں لکھنا شروع کیا ''طلعت سیما'' کے نام سے اسے بھی ہر ماہ انعام ملتا تھا۔ لیکن پھر وہ تو فوراً ہی اپنے اصلی نام سے لکھنے لگی۔ اور اس وقت مجھے ''سیما'' کے نام کا مطلب بھی نہیں معلوم تھا۔ یونہی کسی کا سن کر رکھ لیا تھا۔''

مجھے پاکستان سے عشق ہے قائداعظم اور علامہ اقبال کے خلاف کچھ نہیں سن سکتی۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ ہماری ہجرت بے معنی اور بے مقصد تھی۔ جو سکھوں اور ہندوؤں کی تعریف میں مرے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تہذیب وثقافت ایک ہے۔ میرے نزدیک پاکستان ناگزیر تھا۔ میں نے ہجرت کے دکھ نہیں دیکھے لیکن میں نے سنا اور پڑھا ضرور ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک آزاد ملک میں پیدا ہوئی۔

''اور آخر میں مجھے اپنے قارئین کا شکریہ ادا کرنا ہے جو مجھے پڑھتے ہیں۔ چاہے پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہم ان کی وجہ سے ہی یہاں ہیں اور ان کی وجہ سے ہی لکھتے ہیں اور خواتین ڈائجسٹ سمیت سب پرچوں کا بھی شکریہ جو ہماری تحریروں کو چھاپتے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں۔''

اور اس کے ساتھ ہی نگہت سیما صاحبہ سے ہم نے اجازت چاہی، اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆☆

عارفہ فضل شاہ......گاؤں حمید

جنوری کا شمارہ آج صبح ملا اور اب رات کے نو بج کر اڑتیس منٹ پہ تبصرہ لیے حاضر ہوں۔ سردی کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آفتاب میاں کو دیکھے آج چھ دن ہو گئے ہیں۔ ارے بھئی سورج کی بات کررہی ہوں۔ ہم ابھی چھوٹے ہیں۔ میاں والے نہیں ہوئے۔

کل محمد زوار شاہ کی برتھ ڈے کی تصویریں عذرا باجی کو بھیجی ہیں تو وہ حیران کہ ”پاکستان میں جس کو کال کرتی ہوں یہی کہتا ہے، بہت سردی ہے، تم خود صبح شام سردی سردی کی گردان کرتی رہتی ہو اب تو سب ایسے تیار ہو کے بیٹھے ہیں گویا اپریل کا موسم ہے۔

(بھئی سردی اپنی جگہ، فیشن اپنی جگہ اور کوئی بھی کیا تھا ویلوٹ کا ڈریس پہنا کوٹ کے ساتھ اسٹرال لیا اور ہائی ہیل شوز پہن کر ہم تو تیار)

خیر سردی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ زیادہ تر وقت بستر میں گزرتا ہے۔ کہیں آنا جانا ہو نہیں رہا سو میرے جیسی کتابی تتلی (بھئی کیڑا کہنا مجھے نہیں پسند) تو بہت خوش ہے۔ پڑھنے لکھنے کو وقت ہی وقت میسر ہے الحمدللہ۔

اب آتے ہیں جنوری کے شمارے کی طرف۔

آنٹی پرابلم پسند آیا۔ ترس......بہتر تھا۔ تحفہ......اچھا افسانہ تھا۔ انگلش شارٹ اسٹوری یاد آ گئی۔ لیکن شکر ہے ”تحفہ“ میں اس کی طرح ٹریجڈی نہیں تھی۔ کہر میں ڈوبی شام......رائٹر نے ہیروئن کو اپنا نام ہی دیا۔ یونیک ماء الملوک۔ کیا کہنے۔ رسالے کی جان۔ کمال کی تحریر ہے۔ بھلائے نہیں بھولے گی۔ یہ واحد قسط وار ناول ہے جو میں پڑھ رہی ہوں ورنہ میں ہمیشہ مکمل ہو جانے کے بعد پڑھتی ہوں۔

ج:۔ پیاری عارفہ! آپ کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ آپ اچھا لکھ رہی ہیں۔ خواتین پسند آیا، بہت شکریہ۔

مہرن پھپھو اور راہ کے ستارے ان شاء اللہ مارچ کے شمارے میں شامل ہوگا۔



نادیہ جہانگیر



خط بھجوانے کے لیے پتا۔

خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

Email:Info@khawateendigest.com

صفیہ مہر فرحان......کوٹلی مراں خان پور

جنوری کا رسالا پندرہ کو ملا۔ اسی رات مالا خود بھی پڑھی۔ شوہر کو بھی زبردستی سناتی ہوں، وہ ساتھ ساتھ کیلی گرافی کرتے جاتے ہیں، ہنستے بھی جاتے ہیں میں پوچھو اب سناؤ۔ کیا سنایا تو کہتے ہیں اس ساری قسط میں نگینہ اور اسپتال ہی ہے۔ ان کا شکریہ کہ یہ میری خوشی میں خوش سنتے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد پڑھے سلسلے ”نیا سال“ میں نے دھڑکتے دل سے اپنا نام ڈھونڈا مل گیا۔ بہت شکریہ۔ بہن صدف ناصر کا پڑھا، مزہ تو آیا، لیکن مختصر تھا پھر مہوش چدھر کا پڑھا سوال نمبر دو نے لرزا دیا اتنی ظالم ماں بھی ہو سکتی ہے۔

پھر اپنی پسندیدہ زرینہ خانم کو دل سے پڑھا، زرینہ جی آپ ایسے کیوں سوچ رہی ہیں کہ بدعادی ہو گی تائی نے یہ اللہ کے کام ہیں۔

باقی ساری بہنوں کے بہترین لگے، رائٹر نازیہ

جمال سادہ سی اچھی محفل جما گئی، ہمارے نام، خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا، صدف ناصر، اور گوشی جمال کا خط میں محتاط ہو کر پڑھتی ہوں اور غور سے کہ مجھے اچھے لگتے ہیں ان کے خط، اس بار تو صائمہ گل بھی ہمارے نام کے باغ میں کھل رہی تھیں۔

سلسلے وار ناول، انگنا پھول کھلیں گے، وسیم سے زیادہ بہتر ارم کے لیے عفان رہے گا، باقی راحت جانیں، افسانہ کھرا سکہ، عارفہ فضل شاہ واہ ہمیں لگا کہانیاں، رسالے پڑھ کر صرف لڑکیاں خواب سجاتی ہیں۔حمیرا شفیع ہماری طرح خط لکھتی تھیں۔دیکھتے دیکھتے رائٹروں کے افق پر چمکیں (تحسین نما فقرہ) قسمت نے ساتھ دے دیا تو ہم بھی آجائیں گے (ہاہا) حمیرا جی ہر سال پہلی نیو ایئر نام کا افسانہ لکھتی ہیں۔اللہ قلم میں اور برکت دے۔

نگہت سیما، سینئر رائٹر۔ سادہ قلم، سادہ تحریر کہانی دلچسپ تھی، بس آخر میں آمنہ کے رول میں جھول آ گیا، فاتحہ رابعہ، گمان دل کے، سبق آموز افسانہ رہا۔ ظرف قدح، ملیا سمون دلچسپ یہ تو ہمارے گھر کی اسٹوری لگی ہم بہنیں بھی ساری شادی شدہ ہیں، اور بھائی دو کنوارے تو بہت پریشانی ہوتی ہے ہمیں ان کی طرف سے اللہ ہمیں بھی خوب سیرت بھابھی دے، آسیہ رئیس کا نام اچھی اسٹوری کی ضمانت۔بہت پیاری کہانی لکھی دل سے اور دلوں کو چھو گئی پر عدیمہ اور سارہ کا (رونمائی) ویڈنگ گفٹ یونیک لگا۔

ناول (احد) لمبا تو ہو گیا ہے مگر دلچسپی ہنوز ہے، خاتون کی ڈائری، ریحانہ چوہدری بازی لے گئیں۔باقی سلسلے بھی بہترین ہیں۔

پیاری صفیہ......! آپ کے شوہر کی ہمت کی داد دیتے ہیں کہ آپ کی خاطر ناول خاموشی سے سنتے ہیں اور ہنستے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ آپ کے لیے ان کی محبت ہی ہے ورنہ عموماً تو شوہر حضرات بیویوں کے رسالوں، کتابوں پر تنقید ہی کرتے نظر آتے ہیں۔۔
مفصل اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

رمشا رزاق...... فتح پور لیہ

میرے خوابوں میں سے ایک خواب پورا ہو رہا ہے وہ ہے خط لکھنے کا۔ مجھے لگتا ہے کہ لکھنے سے لفظ دل سے ادا ہوتے ہیں یعنی دل کی آواز ہوتے ہیں اور میرا یہ خواب صرف اور صرف آپ کی وجہ سے پورا ہوا ہے۔

خواتین اور شعاع دونوں پڑھتی ہوں جب میں چھوٹی تھی تو میری بہنیں پڑھتی تھیں اس سے مجھے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا مگر میں نے آج تک اس کے بارے میں رائے نہیں دی۔

ج: پیاری رمشا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے سارے خواب پورے کرے۔

عروج عباس......کراچی

سب سے پہلے سروے چیک کیا تو معلوم ہوا ہمارا نام بھی شامل ہے پھر دل کو تسلی ہوئی اور دل سے آپ کے ادارے کے لیے تھینک یو نکلا اور اک شعر بھی زباں پہ مچلا۔

پہلے لفظ پڑھتا تھا اس کو
پھر میں نے اسے یاد کرلیا

کرن کرن روشنی احادیث کا اعادہ کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اے حمید صاحب کی یادوں کی باتیں اداس کر گئیں۔

صدف ناصر اور صائمہ گل بہن نے سروے کا پہلا سوال اسکپ کیا لیکن صدف ناصر کے سفر کا احوال خوب دلچسپ رہا۔ شازیہ جمال طارق کی طرح نازیہ جمال صاحبہ کا بھی انٹرویو بہتے پانی کی روانی لیے تھا اور ذرا بھی بوجھل نہ لگا اور ان کے والدین نے جو علم دوست ماحول اولاد کو مہیا کیا، واقعی قابل تحسین۔ کاش میری بھی کوئی بہن ہوتی بھائیوں کے اپنے مشاغل اور دلچسپیاں ہیں میں اکیلے ہی اپنی کتابوں سے دل لگائے رکھتی کہ فی زمانہ ان ہی سے دل لگانا بہترین ہے۔

"انگنا پھول کھلیں گے" ارم نے واقعی اچھا فیصلہ کیا اور مالا میں اس بار معید نے بھی وہی روایتی بھائیوں والا سلوک کر کے اچھا نہیں کیا۔

اسی لیے تو ورثے میں ملی جاگیروں سے ڈر لگتا

ہے۔ احد میں اجتی کے حوصلے اور استقامت کو داد دیے بنا نہ رہ سکے اور راہ حق میں اس طرح کے امتحان تو قدم قدم پر ہوتے ہیں۔ میری ایک جاننے والی وہ کرسچن سے مسلم ہوئیں تو انہیں بھی ان کے سسرال والوں نے نہیں اپنایا لیکن ہمارے ان بھائی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ماں اور بیوی میں انصاف کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس توازن کے رکھنے میں انہیں بھی بڑی استقامت دکھانی پڑی۔ مکمل ناول واقعی مکمل تھے تعریف کے لحاظ سے "چلو تم کو بتاتے ہیں" میں غزنی اور نیلی کا کردار اچھا لگا۔ "اسیر یہاں" آسیہ رئیس کے مکمل ناول نے آخر تک اسیر کیے رکھا عدیمہ کا کردار اچھا لگا، ٹانگ میں تکلیف ہونے کے باوجود وہ صرف گھر کی ہو کے نہیں رہ گئی۔ افسانوں میں قسط رابعہ کا نام دیکھا تو پہلے انہیں ہی پڑھا لاجواب رہا۔ حمیرا شفیع بھی نیو ایئر منانی نظر آئیں۔ فاطمہ احمد کی نظم دل کو لگی، واقعی ڈپریشن میں کچھ ایسا ہی حال ہوتا ہے خاتون کی ڈائری سے ریحانہ چوہدری کا انتخاب پسند آیا۔

ج: پیاری عروج! تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔ بہت شکریہ۔

تسمینہ اسامہ بخاری...... کراچی

معذرت کے ساتھ میں آج یہ میل شکوہ کرنے کے لیے کر رہی ہوں۔ میں آپ کو اپنا ایک افسانہ جس کا نام "آئیڈیل" تھا اور ایک قسط وار ناول جس کا نام "خوب صورت" تھا ڈیڑھ مہینے پہلے بھیج چکی ہوں ،آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

ج: پیاری تسمینہ! قسط وار ناول آپ مکمل کر کے بھجوائیں۔ پورا ناول پڑھے بغیر ہم کیسے کوئی رائے دے سکتے ہیں۔ افسانہ کے لیے معذرت۔

مسز خالد...... شاہدرہ لاہور

نمرہ جی کی میں فین ہوں۔ گوشی بہن کے خط شوق سے پڑھتی ہوں۔ "انگنا پھول کھلیں گے" پسند نہیں [illegible] کیونکہ [illegible] زیادہ سازشیں مجھے پسند نہیں۔ میں اپنے دیور کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہوں ان کی ایج تھوڑی زیادہ ہے۔ اس لیے کسی طلاق والی لڑکی کا رشتہ چاہتی ہوں۔ اگر گوشی بہن نے اپنی بہن کا رشتہ کرنا ہو یا کسی دوسری بہن کے گھر میں ایسا کوئی رشتہ ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔ ہمیں جہیز کی ضرورت نہیں۔ میرے دیور کی اچھی تنخواہ اور اپنا گھر ہے۔

ج: مسز خالد! نے ہمیں اپنا فون نمبر دیا ہے۔ اگر بہن گوشی جمال یا کوئی اس رشتہ کے بارے میں جاننا چاہے تو فون نمبر ہم سے لے سکتا ہے۔

تہمینہ شوکت...... مریدکے

مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں لکھنے کے ساتھ ساتھ خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی بہت شوقین ہوں۔ میں ایک حقیر سی لکھاری ہوں۔ میں نے جو دو ناول لکھے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو نہ بھی پسند آئے تو آپ لوگ موبائل فون پر میری غلطیاں جو میں نے ان ناولوں میں کی ہیں، وہ مجھے، بتادیں اور تھوڑا سا مجھے گائیڈ بھی کر دیں۔

ج: پیاری تہمینہ! آپ کی تحریر میں پختگی نہیں ہے ابھی آپ صرف مطالعہ کریں۔
اور یہ کیا بھئی لکھنے والا کبھی حقیر نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی حقیر نہیں ہوتا۔

فہمیدہ جاوید...... ملتان

سرورق اچھا تھا مگر شعاع کا زیادہ پسند آیا تھا کہ یہ خواتین والا ذرا گاؤں کے انداز کا سا تھا پنجابی سا۔ نازیہ جمال سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ دلچسپ و برجستہ سی ہاں اب نگہت سیما سے ملاقات کا شدت سے انتظار ہے مگر انٹرویو طویل سا ہو۔ سروے بہت ہی دلچسپ سا تھا اور پڑھ کر مزہ آیا۔ غنی علی عمیر سے ملاقات بالکل پسند نہیں آئی کہ سوالات پہلے والے تھے۔ نگہت سیما کا مکمل ناول "چلو تم کو بتاتے ہیں" سال نو کا تحفہ تھا جو کافی دلچسپ تھا جس میں غزنی کا کردار بہت اچھا لگا وہیں اس کے بھائی نے بھی [illegible] جو اپنے باپ کو [illegible] دلائی مگر اپنی ہی پسند کو انجانے میں ریجیکٹ کر رہا تھا مگر آخر میں سب صحیح ہو گیا۔ ہاں نگہت اب طویل سلسلہ وار ناول شروع کر دو بھئی کہ ہم تو پڑھنا چاہتے ہیں۔

"اسیریاں" کہانی بھی طویل و دلچسپ تھی عدینہ، مازن، حارث و سارہ کے کردار اچھے تھے۔ مازن نام پہلی بار پڑھا۔ آخر میں بڑوں کی کہانی بتا کر عرق ریزی سے اختتام ہوا وہیں سارے گلے شکوے ختم ہوئے اور سب کو ان کی مرادمل گئی۔

افسانہ "کھرا سکہ" کچھ منفرد اور اچھا رہا جس میں فیکا بھی واقعی کھرا سکہ ہی تھا جو اصل ہیرو ہی تھا۔ حمیرا کے افسانے تو ہمیشہ سے ہی سہل مگر اصلاحی سوچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو ایک اچھی سوچ دی بہت خوب۔ قانتہ رابعہ کا افسانہ "گمان دل کے" جو شیطان ہی کی طرف سے خاتون کے دماغ میں آتے تھے۔ آخر میں صحیح سبق ملا۔ اچھا افسانہ تھا۔ "ظرف قدح" بھی ایک اچھا گھریلو افسانہ رہا جس میں ساس کی مثبت سوچ قابل تعریف تھی جس نے سوچ بدلی اور سبق دیا۔

راحت جبیں اور صوفیہ بٹ کی کہانی پر اگلے ماہ تفصیل سے تبصرہ کروں گی۔ مالا کے لیے بہت معذرت میں نے شروع کی چند اقساط پڑھی تھیں اور پسند آئیں۔ نمرہ کی بس نمل اور مصحف پسند آیا تھا۔ فاطمہ احمد کی نظم "ڈپریشن" پسند آئی۔ شگفتہ جاہ کے سارے پھول ہی دلچسپ اور رنگا رنگ تھے۔ اصل خاتون کی ڈائری میں شروع میں جو چھوٹی سی شاعری کی تفصیل سی ہوتی ہے۔ بہت اچھی لگتی ہے۔ اشعار ویسے تو سارے اچھے تھے مگر زرینہ خانم لغاری، فاکہہ سہیل اور صدف عمران زیادہ پسند آئے۔ ام حمنہ کا کچن کا سلسلہ دلچسپ سا تھا ہاں عدنان بھائی کا سلسلہ تو مجھے بہت ہی پسند ہے جس میں دوسروں کے مسائل اور مشورے پڑھ کر مثبت و تعمیری سوچ ملتی ہے۔

ج: پیاری فہمیدہ! آپ کے طویل اور مفصل تبصرے نے ہماری حوصلہ افزائی کی، اس کے لیے ہم تہہ دل سے ممنون ہیں۔ خواتین آپ کو پسند آیا بہت شکریہ۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ اسے بہتر سے بہتر بنا کر پیش کریں۔ کامیابی اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔

فہمیدہ آپ کی فرمائش پر نگہت سیما کا انٹرویو شامل ہے۔

سونیا احمد......ملتان

آج کا خط کسی بھی کہانی کے بجائے راشدہ رفعت کے نام، اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ اتنے اچھے سے روزمرہ کے واقعات کو سمجھاتی ہیں اتنے پیار سے اور سلجھے ہوئے انداز میں سب گرہیں اچھے سے سلجھا دیتی ہیں پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ راشدہ رفعت کو جزائے خیر عطا کرے۔ پلیز راشدہ رفعت کا انٹرویو کریں۔ میں کہتی ہوں، ہر ماں کو اپنی بیٹیوں کو لازمی راشدہ کی تحریریں پڑھوانی چاہئیں۔

ج: پیاری سونیا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کو اچھا لکھنا نہیں آتا۔ آپ خط میں پوری سچائی سے پرچے کے بارے میں اپنی رائے لکھ دیں۔ ہمارے لیے آپ کی رائے اہم ہے خط اچھا ہو یا برا، اس سے فرق نہیں پڑتا ویسے آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے آئندہ خط لکھیں تو پرچے کی دیگر تحریروں پر بھی تبصرہ کریں۔

گوشی جمال......منڈی یزمان

عمدہ لباس زیب تن کیے جنوری کا ٹائٹل ایک خوش گوار احساس دلا گیا۔

اس سال ہمارے خاندان میں کافی شادیوں کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ ابھی کل ہی ہم بھی شادی کی شاپنگ کرنے بھاول پور پہنچ گئے ہمراہ دولہا اور فیملی ممبرز۔ لگتا ہے سردیاں اب جنوری سے زور پکڑ رہی ہیں کیونکہ دسمبر تو بس فوگ اسموگ کی نذر ہو گیا، جب کہ اب ٹھٹھرتی ہوئی کہر زدہ لہریں یخ بستہ بدن کو چیرتی ہوائیں عروج پر ہیں۔ آٹھ دن ہو گئے۔ دھوپ نہیں دیکھی۔ اندھیرے میں کٹتے دن رات۔ اس شدت کو کم کرنے کے لیے کمروں میں دہکتے ہوئے، ہیٹر، مچھلی کے پکوان اور دیسی مٹھائیوں سے لطف اندوز۔ سہولیات ہوں تو ہر موسم اچھا، نہ ہوں تو واویلے اور کوفت سے تڑپ[illegible] کے ساتھ سر ہوں یہ۔

کل چھ جنوری کو فل دھند، کہر میں ہمارا قافلہ بائیکوں پہ بھاول پور کے لیے رواں دواں ہوا تو لگ پتا

گیا کہ آخر سردی ہے کیا چیز؟ کیونکہ گاڑی ،بازاروں کے اندر لے جانا ممکن نہیں تھا۔

زوبی نے ملکی وہائٹ شرارہ اوپر سے لانگ شرٹ اور آرگنزا کا دوپٹہ زیب تن کرنے کا شوق فرمانا تھا۔ ایک گھنٹہ تو بازاروں میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بائیک پر پیچھے بیٹھ کر سن ، آنکھ ، کان ، ناک حتیٰ کہ پورا جسم تھر تھر کانپتے۔

بازار میں ایسا لگ رہا تھا۔ ہر طرف سے برف کے گولے برس رہے ہیں لیکن ہم ،شادی میں سب سے منفرد نظر آنے کے چکر میں چکرا چکرا کر دکانوں پہ ڈھیر۔

آپا شاہانہ کی فرمائش ''میرے لیے ریشمی جوڑا مت لانا۔ کوئی ویلوٹ یا کھدر کا موٹا سوٹ ہو۔ میں نے اکڑنا نہیں۔ تم لوگ اپنے ساتھ میرا بیڑا غرق مت کرنا۔''

شاہانہ کی نصیحت پلو سے باندھے۔ خریداری میں مصروف مطلوبہ سامان دریافت کر کے ،بازار کے باہر اچانک نیوز ایجنسی پہ ایک تار پہ لٹکتے خواتین ڈائجسٹ پہ میری نظر پڑی۔ یقین کو پختہ کرنے کے لیے میں شاپنگ بیگز سے لبریز فوراً دکان کے اندر۔ باقی ٹولہ فرید گیٹ کراس کر گیا۔

جنوری سال تو نمبر جھٹ تار سے کھینچ کر اتارا تو اس بے چارے کے باقی شمارے ادھر ادھر۔ یقین دہانی کر کے فوراً ہزار کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

''وہ جی! میرے پاس چینج نہیں ہے۔''

پرس کھنگال کر دیکھا صرف سو روپیہ۔ میرا قافلہ بھی آگے نکل گیا۔ اتنے میں فون بلنک ہوا ، میری گمشدگی کی بابت میں...... خواتین ڈائجسٹ سینے سے لگائے ، شاپنگ بیگ اس کی دکان میں رکھے کال پہ مصروف باہر۔

''توصیف بھائی ، ایک پچاس کا نوٹ لے کر فرید گیٹ آنا۔'' میں نے اپنا آرڈر جاری کیا۔

پیچھے سے دکان دار آوازیں لگا رہا کہ آپ کا سارا سامان ادھر ہی رہ گیا۔ میں ہلکو صرف خواتین کو سینے سے لگائے کان پہ موبائل دھرے فرید گیٹ سے باہر۔

بھائی توصیف نے چھوٹی زیب النساء کو پچاس کا نوٹ تھما کے روانہ کیا اور یوں یہ پہاڑ سر ہوا۔ بائیک پہ بیٹھ کر ورق گردانی شروع۔۔۔ فہرست پر نظر ثانی کی۔ واہ! ڈھیر سارے ناولز! خوش رہیں کچھ ٹریجڈیز پڑھ کر دل آبدیدہ ہوا۔

ام حمنہ کا مختصر لیکن دلچسپ باورچی خانہ اچھا لگا۔ پکوان تین ریسپز پہ ٹرخا دیا۔ مجبوری بھی سمجھ میں آ گئی صفحات کی کمی۔ نازیہ جمال کو اتنا پڑھا تو نہیں جتنا پڑھا ، عمدہ تحاریر سے فیض یاب ہوئے۔ البتہ غنیٰ علی عمیر میں ذرا ہمیں دلچسپی کم ہے۔ میرے خط کی پسندیدگی کا احوال کچھ سینس کرتی رہتی ہیں ان کا تہہ دل سے شکریہ۔

ساجدہ ظفر کمالیہ کی نظر میں ابھی شاید میں ایک ''معمہ'' ہوں حالانکہ شاید اتنا تبصرہ میں نے شماروں پہ نہیں کیا ہو گا جتنا اپنے اور اپنی بہنوں کے بارے میں خاصے تفصیل سے کیے ہیں اب تو سب کو ازبر ہو جانے چاہئیں۔ ''انگنا پھول کھلیں گے'' میں ثانیہ کی ناشکری سمجھ سے باہر ہے۔ ''کھرا سکہ'' فیکا جیسے کردار ہر مرد میں ہو تو کوئی عورت دکھی نہیں ہو گی۔ ''چلو تم کو بتاتے ہیں'' بہت ہی خوب صورت نظم پہ اختتام۔ نگہت سیما کی تحریر پہ تبصرہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

ج: گوشی جی! بہت شکریہ کہ اتنی باقاعدگی سے پڑھنا اور مصروفیات میں سے وقت نکال کر لکھنا خاصا وقت طلب کام ہے۔

لاہور سے مسز خالد نے ہمیں خط لکھا ہے آپ یا آپ کی بہن چاہیں تو ہم سے ان کا نمبر لے کر ان سے بات کر سکتی ہیں۔ آئندہ خط میں اپنی بہن کا نمبر لکھ دیں ، ہم فون کر لیں گے۔

سعدیہ مصطفیٰ...... مڑہ بھنگواں

میں نے زیادہ لٹریچر تو نہیں پڑھا مگر پھر بھی اپنے آس پاس کے ماحول کا مشاہدہ کرنے کے بعد جو ادراک مجھے ہوا ہے کہ ہماری ''یوتھ'' میں اب کتابیں

بقیہ صفحہ 206 پر

راحت جبیں

آنگنا پھول کھلیں گے

پندرہویں قسط

وسیم کے لہجے سے ارم کو دھچکا سا لگا۔

''آپ کو مجھ سے وجہ تو پوچھنا چاہیے تھی کہ میں نے یہ سب کس لیے کیا؟''

''وجہ میری سمجھ میں بہت اچھی طرح آ چکی ہے۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بے وقوف بنانے کے لیے میں ہی ملا تھا۔ پہلے رشتہ بھجوانے کو کہا۔ پھر سارے گھر کے سامنے انکار کر دیا۔ کیا چاہتی ہو، تمہارے آگے پیچھے پھروں۔ منتیں کروں یا یہ کہوں کہ تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔''

اتنا غصہ اتنی بدگمانی۔ وہ سادہ سی لڑکی دہل کر رہ گئی تھی۔ مقابل کے لہجے میں غصہ تھا۔ طیش و غضب تھا اور اس کے گھر کے مرد عورتوں سے بلند آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ اس کے لفظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

''اور اب جو کچھ نے تم ثانیہ کے ساتھ کیا ہے؟''

''میں نے ثانیہ کے ساتھ کچھ نہیں کیا بلکہ اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کی اور نتاشا کی آپس میں۔''



"مجھے میرے گھر والوں کے خلاف بغاوت کے لیے اکسا رہی ہو۔ بہن کے خلاف کرنا چاہتی ہو۔ بس کرو ارم! میری نظروں سے کتنا گرو گی؟" اس نے اتنی تیزی اور درشتی سے اس کی بات کاٹی کہ ارم کو لگا اس کا موبائل پکڑا ہاتھ کانپا ہے۔

"ہر انسان عبید نہیں ہوتا اور یاد رکھو۔ اب اگر تم نے ثانیہ پر الزام لگانے یا اسے تنگ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کوئی ہو بھی نہیں سکتا نہ آپ سے برا نہ آپ کی بہن سے۔" وہ پھٹ پڑی۔ اس سے قبل کہ کچھ اور بھی کہتی وسیم نے گویا فل سٹاپ ہی لگا دیا۔

"منگنی کر رہا ہوں نتاشا سے۔"

ارم سن سی ہو گئی۔

"کیونکہ میرے دل میں تو اب تمہارے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ اس لیے اس بات کو لے کر ثانیہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارم نے کچھ بولنا چاہا مگر لفظ ہونٹوں پر منجمد ہو گئے۔

"افسوس ہے کہ تم سے محبت کی......"

رابطہ کاٹ دیا گیا۔ بہت بے دردی، بہت بے رحمی سے۔

ارم کا ہاتھ موبائل سمیت بے جان ہو کر پہلو میں گرا...... ایسا تو نہیں کہ وسیم کی محبت موسلا دھار بارش کی طرح برسی ہو۔ مگر شبنمی اوس کی طرح اس کے احساسات کو ڈھانپا تو تھا...... محبت کی حدت نے اس کے منجمد احساسات کو پگھلایا تو تھا۔ وہ بیکار یقین کہ وہ اس کی بات سنے گا۔ آنسو بن کر بہہ نکلا۔



کچھ نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں ایسی اداسی رچی تھی کہ اپنی ناراضی کو پس پشت ڈال کر آسیہ منانے چلی آئیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی بہو ناراض ہو کر میکے چلی جائے۔ وضع دار گھرانوں میں بے عزتی محسوس ہوتی تھی۔

نادرہ نے کوشش تو کی کہ آسیہ کو دوسرے کمرے میں لے جائیں مگر آسیہ کو عادت تھی دادی کے پاس گھس کر بیٹھنے کی۔ نادرہ نے بدمزگی سے سوچا۔ شکر تھا کہ کمرہ صاف تھا کہ رابعہ کر کے گئی تھی۔ دادی ہکا بکا رہ گئیں۔ انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ گھر میں کیا چل رہا ہے۔

"اس کا کیا دماغ چل گیا ہے ایک تو بچاری ارم کے ساتھ اتنا برا ہوا۔ اوپر سے یہ لڑ کر آ گئی۔" دادی بدک گئیں۔

"بلاؤ ذرا میں پوچھتی ہوں۔"

جب بھی گھر میں کوئی معاملہ ہوتا، دادی فٹ سے بڑی بن جاتیں۔ اور یہ بھی بھول جاتیں کہ انہیں گھر میں پوچھتا کون ہے۔

"نہیں ہے گھر پر، رابعہ کی طرف گئی ہے۔" نادرہ نے ٹالا۔

"ہاں تو رابعہ کا گھر کیا چاند پر ہے۔ بلا لاؤ یا فون کر کے کہو ساس لینے آئی ہیں۔"

نادرہ نے کھا جانے والی نظروں سے دادی کو گھورا۔

"ہماری تو بچی ہے۔ نا سمجھ ہے۔ ناراض ہے تو کیا ہوا؟ میں نے سوچا، میں ہی منا لاتی ہوں۔" آسیہ نے ماحول کو ہلکا پھلکا رکھنے کی سعی کی۔ "گھروں میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔"

"اس میں چھوٹی بات کیا ہے؟ بے عزتی تو ہماری ہوئی۔ گھر بلا کر انکار بھی کیا۔ پھر ہماری بیٹی پر الزام بھی لگا دیا۔ اسے جھوٹا اور سازشی بنا دیا۔ پیچھے کیا رہ گیا۔" نادرہ تنک کر بولیں۔ "گھر سے نکال دیا۔"

"غلط بات ہے۔" آسیہ نے رسانیت سے ٹوکا۔ "نہ کسی نے اس سے جھگڑا کیا، نہ گھر سے نکلنے کو کہا۔ عبید کتنی بار منانے آیا۔"

پھر انہوں نے روئے سخن دادی کی طرف کیا۔

"ثانیہ کو سمجھائیں۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو منٹ بات کریں۔ گھر میں مل بیٹھ کر حل ہو جاتا۔ ثانیہ کا گھر ہے۔ رہی ارم تو آج یہاں ہے تو کل سسرال۔"

"تو بھیجیں سسرال۔ برا نہ مانیں۔ جس گھر میں اتنی لاڈلی بیٹیاں رہتی ہوں۔ وہاں بہوؤں کا گزارہ مشکل ہوتا ہے۔" آسیہ کو برا لگا۔ تو نادرہ نے لہجہ دھیما کیا۔

"برا نہ ماننا آسیہ! ہم تو بیٹی والے ہیں۔ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ انسان کو صرف بیٹی کی نہیں بیٹے کے گھر کی بھی فکر کرنی چاہیے۔ ہمیں تو پہلے ہی رابعہ کی سسرال نے ٹانگ رکھا ہے۔ اب دوسری بیٹی کے سیاپے شروع ہو گئے۔" دادی نے کھا جانے والے انداز میں بہو کو دیکھا۔

ان نظروں کی تاب نہ لا کر نادرہ نے فوراً دوپٹہ منہ پر رکھ کر سسکنا شروع کر دیا۔

"ارم کے لاڈ اٹھانے کے لیے اس کے ماں باپ موجود ہیں۔ بہتر ہے اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ اتنے جذباتی اور اکھڑپن سے گھر ہی خراب ہوتے ہیں۔" آسیہ کھڑی ہو گئیں مزید بیٹھیں تو بات کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا۔

"ان کی تو مت ماری ہوئی ہے۔ تم جاؤ بیٹی! میں بھیجتی ہوں ثانیہ کو۔ کوئی اتنی معمولی باتوں پر گھر چھوڑ کر آتا ہے۔" دادی نے تسلی دی۔

آسیہ کچھ دل گرفتہ سی دروازے تک آئیں۔ نادرہ انہیں دروازے تک چھوڑ کر آنے کے بجائے سالن سے الجھنے لگیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔

آسیہ نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رابعہ تیزی سے اندر آئی۔ شکر ہے ان کی طرف والے پٹ کی کنڈی لگی تھی۔ ورنہ ان کو دروازہ لگ بھی سکتا تھا۔ رابعہ دوسرا پٹ کھول کر اندر آئی۔ آسیہ کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''ثانیہ نہیں آئی؟'' آسیہ نے اس کے عقب میں دیکھا۔

''ثانیہ کہاں گئی ہے؟''

آسیہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اور اندر ثانیہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ رابعہ کو بھی اسی وقت ٹپکنا تھا۔

''آئیں نا آنٹی!'' رابعہ اصرار کرنے لگی۔

''نہیں، میں تو ثانیہ کو لینے آئی تھی مگر لگتا ہے، ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تب ہی ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔'' انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے ثانیہ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور دہلیز پار کر گئیں۔ رابعہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ جھری سے جھانکتی ثانیہ لپک کر باہر آئی۔

''تمہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔'' اس نے لپک کر بیرونی دروازے کو کنڈی لگائی۔

''کوئی شرم کرلو...... شرم۔''

''تمہیں کیا تکلیف ہے، یہ میری زندگی ہے۔'' ثانیہ — چلّائی۔ رابعہ اسے بازو سے کھینچ کر دادی کے کمرے میں لے آئی۔

''تمہاری زندگی ہے۔ مگر تمہاری وجہ سے باتیں تو مجھے سننی پڑتی ہیں۔''

''کیوں میں میکے رہنے نہیں آسکتی......'' ثانیہ زچ ہو گئی۔

''ساری دنیا کو پتا ہے، بنو ناراض ہو کر آئی ہیں۔'' رابعہ نے طنزیہ کہا۔

''اور امی! یہ آسیہ آنٹی سے ملی کیوں نہیں۔ اب عبید کو پتا چلے گا تو اسے کتنا برا لگے گا۔''

''تم عبید کی فکر نہ کرو۔''

''دادی! آپ ہی اس کو سمجھائیں۔ وہ اب شوہر ہے، محبوب نہیں۔''

''محبوب تھا۔ محبوب ہی رہے گا۔'' ثانیہ نے فخر سے بال جھٹکے۔

''بی بی ان چھوئی اور برتی ہوئی چیز میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وجود کی کشش سے محبوب کو باندھ سکتے ہیں۔ شوہر کو خدمت، محبت اور وفا چاہیے۔'' رابعہ کا طنزیہ لیکچر شروع ہو گیا تھا۔

ثانیہ نے سر پکڑ لیا۔

''نہ...... نہ اس کو عقل والی کوئی بات نہ بتا'' دادی نے مزید تڑکا لگایا۔

''ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھے، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ میں جب تک ان کو اچھی طرح سبق نہیں سکھالوں گی۔ واپس نہیں جاؤں گی۔'' رابعہ نے زچ ہو کر ماں کو دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر بیٹی کی بات کی تائید کی۔

''کیونکہ میرا بار بار ناراض ہو کر آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اس زعم میں خود نہ رگڑی جانا۔'' رابعہ نے غصے سے کہا۔

''بات سن میری بچی۔ ادھر بیٹھ۔'' دادی نے پچکارا۔

''میرا آپ کی نصیحتیں سننے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔'' وہ مزید خفا ہوئی۔

''ہم سب کو جتنا مرضی بے وقوف سمجھ لو۔ مگر یاد رکھو۔ عبید کو اتنا تنگ نہ کرو کہ وہ سچ مچ غصے میں آجائے۔ مرد

کا غصہ بہت برا ہوتا ہے۔ اسے جتنے نخرے دکھانے ہیں دکھا۔ مگر وہ نخرے بھی ایک حد تک ہی دیکھے گا۔"
ثانیہ دادی کی بات پر ایک لمحے کو چپ سی ہوگئی۔ شاید کہیں دل کو بات لگی تھی۔

☆☆☆

"ثانیہ گھر آئے تو اس کے ساتھ اپنا رویہ نارمل ہی رکھنا۔" چائے کا کپ میز پر رکھتے ارم نے گردن گھما کر بے حد حیرت سے باپ کو دیکھا۔ وہ کتاب میں گم تھے۔ ارم کے دیکھنے پر مسکرائے۔ کتاب بند کر کے کپ کے پاس رکھی۔
"کیا ہوا؟"
"مجھے لگتا ہے، سارے قصور میرے ہی ہیں۔" اس نے کس جتن سے خود کو سنبھالا تھا۔
"کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ ہر انسان اپنا الگ مزاج رکھتا ہے۔ جب ایک نیا انسان گھر میں آتا ہے تو سب کو اپنے انداز و اطوار بدلنے پڑتے ہیں۔ عبید کے سامنے ثانیہ کی برائی مت کیا کرو۔ اس کا دل تمہاری طرف سے خراب ہوتا ہے۔ اب دیکھو ثانیہ نے خود کو کتنا بدلا ہے۔"
"ابو! میں اس کی برائی نہیں کرتی ہوں۔ وہ تو......" ماں کو آتا دیکھ کر اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اکیلی واپس آئی تھیں اور مزاج برہم تھا۔
"کیا ہوا؟ بہو نے آنے سے انکار کر دیا۔" توفیق صاحب نے ہلکے پھلکے میں کہا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔
"مجھ سے ملی ہوتی۔ انکار کرتی۔ وہ تو میرے سامنے بھی نہیں آئی۔" وہ برہمی سے کہتی بیٹھ گئیں۔
"میں نے تو منع کیا تھا، مت جائیں۔ مگر امی کو لگتا تھا، وہ جائیں گی اور ثانیہ آتے ہی گلے لگ جائے گی۔" ارم سے رہا نہ گیا۔ آسیہ نے بے حد غصے سے بیٹی کو دیکھا۔
"اپنی زبان بند رکھو۔" ارم سٹپٹا سی گئی۔ "خبردار جو آج کے بعد تمہارے منہ سے کوئی فضول بات نکلی۔" ارم دو قدم پیچھے ہٹی۔ آنکھوں میں بے یقینی سی تھی۔ یہ ماں نے آج کس لہجے میں بات کی تھی۔ پھر وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
"بہو کا غصہ بیٹی پر کیوں نکال رہی ہو۔" توفیق کو برا لگا۔
"چھوٹی سی بات کا اس نے بتنگڑ بنا دیا۔ دونوں کو دیکھ بھی لیا تھا تو گھر آکر اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رشتے سے انکار تو اس نے خود کیا تھا۔"
"اچھا بس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے، اسے مزید پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رہی ثانیہ، تو اسے کچھ دن رہنے دو۔ چند دنوں بعد اسے بھی احساس ہو جائے گا۔"
"اسے احساس ہوتا یا اس کے گھر والوں کو...... تو آج میرا جانا ہی کافی ہوتا۔"

☆☆☆

چاندنی میں بھیگی رات، بہت ٹھنڈی تھی۔ وہ شال اوڑھے ایک ایک قدم سوچ سوچ کر ایک ایک سیڑھی پر دھرتی اوپر آئی تھی کہ اندر کی کھولن پر قابو پا سکے۔ مگر آخری سیڑھی پر اس کے قدم منجمد ہو گئے۔
چاندنی میں ڈھلے دو جسمے۔
ثانیہ کا سر عبید کے کندھے پر تھا اور عبید کی گرم چادر ثانیہ کے وجود سے لپٹی تھی۔
"تمہارے بغیر ایک پل نہیں گزرتا عبید! مگر کیا کروں؟ میری سیلف رسپیکٹ کا معاملہ ہے۔ میں بار بار اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتی۔ ارم سے کہو، مجھ سے معافی مانگ لے۔ میں گھر واپس آ جاؤں گی۔" بہو کی برفیلی سر سرد رات میں وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔
"کیا اہم ہے؟ میری سیلف رسپیکٹ یا بھائی کی خوشی۔"

ساری رات نیند بس پلکوں پر جمی رہی، آنکھ میں نہ اتری۔
باپ کا سمجھانا۔
ماں کا لہجہ۔
بھائی کی بے اعتنائی۔
ارم اتنی مضبوط کہاں تھی؟
"مجھ سے غلطی ہو گئی، معاف کر دو۔ اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔"
(میرے دل میں اب تمہارے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔) اپنے لیے چائے نکالتی ثانیہ نے مڑ کر نادرہ کو دیکھا۔ انہوں نے خوشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ارم خود چل کر آ گئی تھی اور کیا چاہیے تھا۔
"آئندہ تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔" ارم نے تھوک نگلا۔ (افسوس ہے کہ تم سے محبت کی)
"کوئی بات نہیں۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔" ثانیہ مسکرائی۔ "لیکن آئندہ غلط فہمی ہو تو مجھ سے بات کر لینا۔"
"میں ناشتا بنا رہی ہوں۔ بہتر ہے عبید کے آفس جانے سے پہلے ہی گھر واپس آ جاؤ۔ اس کا دن اچھا گزر جائے گا۔"
ثانیہ کو بہت زور سے چھینک آئی۔
"لگتا ہے عبید یاد کر رہا ہے۔" نادرہ ہنستے ہوئے اپنا کپ اٹھا کر دادی کو خبر سنانے چلی گئیں۔
"لگتا ہے، سردی لگ گئی۔"
"دادی کہتی ہیں۔ پوہ کی راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ اور میں نہیں چاہتی۔ تم اس ٹھنڈ میں بیمار پڑو۔"
ارم نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو ثانیہ چونک گئی۔
"آ جانا۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ارم واپس پلٹ گئی۔
نجانے کیوں ثانیہ نے چائے کے مگ کو دیکھتے فخریہ انداز میں مسکرانا چاہا۔ مگر وہ کھل کر مسکرا ہی نہ سکی۔
"تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔" آسیہ نے گرم گرم آملیٹ پلیٹ میں نکالا۔ کچن کی فضا میں گرمائش اور ناشتے کی خوشبو تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ سب کچن میں ہی ناشتہ کرتے اور رات کا کھانا کھاتے۔
"ایک اور بنا لیں۔" ارم نے چیز کے سلائس کھول کر ان کے سامنے رکھے۔ عبید اور توفیق آفس کے لیے تیار وہاں آ گئے۔
"چیز آملیٹ کس کے لیے؟" آسیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"ثانیہ کے لیے۔"
کرسی کھینچ کر بیٹھتا عبید بری طرح چونکا...... چونکے تو سب ہی تھے۔ ارم نے باقیوں کے سامنے پلیٹیں رکھتے ایک پلیٹ خالی جگہ پر ہی رکھ دی۔ عبید نے ارم کو غور سے دیکھا اور ارم نے اسے۔
"اگر میرے معافی مانگنے سے میرے بھائی کی مسکراہٹ واپس آ جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔" توفیق اور آسیہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ عبید نے مسکرانا چاہا۔ مگر نجانے کیوں مسکرا نہ سکا۔
"میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تم......"
"تم یہ تو چاہتے تھے نا کہ ثانیہ گھر واپس آ جائے۔" ارم نے آہستہ سے بات کاٹی۔ عبید نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
"چلو ماشاء اللہ۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ میں جانتا ہوں، میری بیٹی بہت بہادر اور سمجھ دار ہے۔ کبھی کبھی ذرا سا جھک جانے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ویل ڈن میری جان۔" توفیق صاحب پیار سے بیٹی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''تو پھر مانگو اس خوشی میں کیا مانگتی ہو۔'' وہ لمحوں میں پہلے والا عبید بن گیا۔ آسیہ خاموشی سے انڈے پھینٹتی رہیں۔ بیٹی کے دل پر کیا گزری ہے، بس وہی سمجھ سکتی تھیں۔

ارم کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔

''میرا اعتبار لوٹا دو۔'' اس نے ہاتھ بھائی کے سامنے پھیلایا۔ ''جو ایک بہن کو اپنے بھائی پر تھا کہ میں جھوٹ بھی کہوں گی تو وہ نبھالے گا، تم نے تو میرے سچ کو ہی جھوٹ بنا دیا۔ لیکن خیر جانے دو اب۔ چھوڑو ان باتوں کو۔'' وہ خوامخواہ ہنسی۔

''ابو! آپ پراٹھا لیں گے یا بریڈ......'' وہ فوراً ہی بات بدل کر باپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تب ہی باہر بیل ہوئی۔

''جاؤ دروازہ کھولو۔ آ گئی ہے تمہاری ثانیہ۔'' اس نے مسکرا کر بھائی کو ٹہوکا دیا تو وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ اس کی خاموشی میں اطمینان اور سکون تھا۔ ارم مضمحل سا مسکرا کر کرسی سنبھالنے لگی۔

☆☆☆

''اتنی پتھر کیوں ہو جاتی ہو؟'' وہ آئینے میں منعکس موم کے مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ سرخ آرام دہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس وہ اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ ثانیہ نے نظر اٹھا کر عقب میں کھڑے عبید کو دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ثانیہ کے نازک کندھوں پر دھرے تھے۔

وہ مسکرائی۔ وہی مسکراہٹ جس پر عبید فدا تھا۔

''بس ایسی ہی ہوں۔ غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔''

''ارم نے تمہارے گھر جا کر سب کے سامنے معافی مانگی، مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''اس نے الزام بھی تو سب کے سامنے لگایا تھا۔ تب اچھا لگا تھا۔'' اس نے برش رکھ کر بالوں کو جھٹکا دیا۔ وہ کندھوں پر بکھر گئے۔

''کاش تم تھوڑا سا دل بڑا کر لیتیں تو سچویشن اتنی خراب نہ ہوتی۔'' عبید کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

ثانیہ کھڑی ہو گئی۔

''جس دن میری غلطی ہوئی اللہ کی قسم سب کے سامنے معافی مانگوں گی۔ بات کو اتنا بڑھنے نہیں دوں گی۔'' وہ اس کی طرف پلٹی۔

''لیکن اب کیا سامنے بٹھا کر یہی باتیں کرتے رہو گے۔ یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس کمرے میں، اپنی زندگی میں مجھے کتنا مس کیا۔''

ثانیہ کے ہاتھ اس کے سینے پر تھے۔ لہجے میں لگاوٹ اور والہانہ پن تھا۔

''تم کون سا دور تھیں۔ جب چاہتا تھا، دیکھ لیتا تھا۔'' عبید کے لہجے میں نہ لگاوٹ تھی نہ والہانہ پن وہ دریافت کر چکا تھا۔

نارسائی سے رسائی کا سفر طے ہو چکا تھا۔ اب زندگی معمول پر آ جانی چاہیے۔ وہ ہر روز ایک ہی جیسی باتیں کیسے کرے۔ عبید پلٹ کر بیڈ کے کنارے جا بیٹھا۔

''مطلب جو عام ہو جائے، وہ خاص نہیں رہتا۔'' ثانیہ کو اس کی بے اعتنائی محسوس ہوئی۔

''زندگی، وقت اور جذبات بھی ایک سے نہیں رہتے۔''

''محبت ایک سی نہیں رہتی۔'' وہ پاس آئی۔

''اظہار ایک سا نہیں رہتا۔'' عبید نے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ وہ روٹھ گئی۔ دوسری طرف جا کر تکیہ درست کرنے لگی۔ وہ اس کے حواسوں پر چھا جانا چاہتی تھی۔ مگر عبید کے حواس سلامت تھے۔ وہ اس کیفیت سے باہر آ

رہا تھا۔ اس کے ساتھ دکھ سکھ کی سانجھ کا رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اب صرف اس کی سننا نہیں اپنی بھی سنانا چاہتا تھا۔ زندگی تو اب شروع ہوئی تھی۔

اس نے چت لیٹی ثانیہ کو دیکھا۔ وائلن کی مدھر خوب صورت دھن۔ مگر ایک ہی دھن ہر روز متواتر۔ یکسانیت۔ بے زاری۔

''بیوی! میں ہر روز ایک ہی ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ تمہیں میری محبت پر اعتبار ہونا چاہیے۔'' عبید نے اس کے چہرے سے تکیہ کھینچا۔

''تو پھر تمہیں کوئی اچھی رومینٹک مووی دیکھ لینی چاہیے۔'' ثانیہ نے کروٹ بدل لی۔

رومانس زندگی کا محض ایک حصہ تھا اور وہ اسے پوری زندگی بنانا چاہتی تھی۔ کیسی نادان تھی۔ رواں ہونے کی بجائے ٹھہرے رہنا چاہتی تھی۔ ٹھہراؤ سکوت۔ یہ کائنات کی سچائی تھا نہ مزاج۔

اور ٹھہرے پانیوں میں ہمیشہ بساند اٹھتی ہے۔ خوشبو باقی نہیں رہتی۔

وہ رات اس کی شادی شدہ زندگی میں عجیب انداز میں اتری تھی۔

☆☆☆

بظاہر تو سب نارمل تھا مگر غیر محسوس سا کھنچاؤ ثانیہ اور ارم کے رویے میں تھا۔ ارم خاموشی کے ساتھ ماں کے ساتھ گھر کے کام سمیٹتی رہتی۔ اور ثانیہ کا پورا زور اپنی نیندیں پوری کرنے پر تھا۔ پہلے جو کوئی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ اب اس سے بھی گئی۔ سونا یا ماں کے گھر کے چکر لگانا، کھانا پسند آتا تو ٹھیک ورنہ آرڈر کر کے کمرے میں گھس جاتی۔ اس کے اس انداز سے ارم چڑنے لگی۔

''سارے کام ہم لوگ ہی کریں۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔'' آسیہ نے توفیق صاحب کے کہنے پر ملازمہ رکھ لی۔

''پہلے تو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔'' ارم کو عجیب لگا۔

''لیکن مجھے ہونے لگی ہے۔ میں اب پہلے کی طرح ایکٹو نہیں رہی اور اس طرح تم پر بوجھ زیادہ آجاتا ہے۔'' آسیہ نے بات ٹالی۔

''بہو پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالیں۔'' ارم ناراض ہوگئی۔

''کرے گی۔ تمہیں پتا ہے من موجی ہے۔''

مگر ارم کو غصہ آ گیا تھا۔ تب ہی وہ اگلی صبح ناشتہ بنانے کے لیے اٹھی ہی نہیں۔ نماز پڑھ کر دوبارہ سوگئی۔ اسے لگا ماں کو دیکھ کر عبید ثانیہ کو جگا دے گا مگر آسیہ نے خاموشی سے سب کا ناشتہ بنا کر رکھ دیا۔

عبید اور توفیق صاحب آفس چلے گئے تو آسیہ کچن سمیٹ کر برتن دھونے لگیں۔ تب ہی ارم آ گئی۔

''اٹھ گئی میری بیٹی، تمہارا ناشتہ رکھا ہے۔ گرم کردوں۔''

''آپ نے کیوں بنایا ثانیہ کو جگا دیتیں۔'' ارم سٹپٹا گئی۔

''کوئی بات نہیں، بندوں کے ناشتے میں ٹائم کتنا لگتا ہے۔ مجھے تو اٹھنا ہی تھا۔''

''امی! اللہ کا واسطہ ہے۔ اتنی اچھی بھی نہ بنیں۔ جب عبید پورے کا پورا اس کا ہے تو ثانیہ کو اس کی ذمہ داریاں بھی اٹھانے دیں۔'' آسیہ نے مڑ کر بیٹی کو دیکھا اور مسکرا دیں۔

''عبید تمہاری ذمہ داری نہیں رہا۔ ہم ثانیہ کی ذمہ داری نہیں ہیں۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ہوں نا۔ میں سب کی ماں ہوں، سب کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہوں۔ اب ایک ایک دو دو کاموں کی لڑائی گھر کا ماحول ہی خراب کرے گی۔'' ارم شرمندہ ہوئی۔

"اچھا سوری۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔"

"بیٹا! ثانیہ کب تک لاپروائی برتے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔ گھر کے کاموں کا کیا ہے کسی نے کم کر لیے تو کسی نے زیادہ۔"

"اچھا سوری نا...... ناراض مت ہوں مجھ سے۔" انہوں نے اتنے پیار سے سمجھایا کہ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

"کوئی اتنی پیاری بیٹی سے ناراض ہو سکتا ہے۔ چلو تم ناشتہ کر لو۔" وہ سر ہلا کر ہاٹ پاٹ کھولنے لگی۔

اور اگلے دن جب وہ کچن میں آئیں تو ثانیہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ انہیں خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ انہیں لگا عبید نے اٹھایا ہے۔

"ارے واہ بھئی آج تو ثانیہ بیٹی ناشتہ بنا رہی ہے۔" توفیق صاحب بھی خوش ہو گئے۔

"جی کل عبید کے ناشتے کو لے کر یہاں کچن میں کافی جھگڑا ہو رہا تھا۔ تو میں نے سوچا۔ خوامخواہ بوجھ کیوں بنیں۔ میں خود بنا لیتی ہوں۔" اس نے ٹرے میں چیزیں ترتیب سے رکھنی شروع کر دیں۔

آسیہ نے شرمندگی سے توفیق صاحب کو دیکھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بیٹا! میں تو بہت خوشی سے۔"

"میں آپ لوگوں کے لیے بھی بنا دیتی لیکن عبید لیٹ ہو رہا ہے۔" اس نے ٹرے اٹھاتے آسیہ کی بات کاٹی اور ٹرے اٹھا کر کچن سے نکل گئی۔

آسیہ اور توفیق ہکا بکا رہ گئے۔ پھر توفیق صاحب سنبھل کر مسکرائے۔

"بیگم صاحبہ! وہ تو اپنے شوہر کا ناشتہ لے گئی ہیں۔ آپ اپنے شوہر کو کروا دیں۔" آسیہ ست روی سے فریج سے انڈے نکالنے لگیں۔

☆☆☆

کھٹ پٹ کی آواز پر ثانیہ کی آنکھ کھل گئی۔ عبید کو آفس بھیج کر وہ سو گئی تھی۔ ارم کو کمرے میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

"دھونے والے کپڑے جمع کر رہی ہوں۔ امی نے مشین لگائی ہے۔" ارم نے بتایا۔

"حد ہے یار۔" ثانیہ نے دوبارہ تکیے پر سر گرایا۔ "کوئی پرائیوسی بھی ہوتی ہے۔ جب دل چاہتا ہے۔ آ جاتی ہو۔ اب یہ میرا روم ہے یار۔"

"تو کپڑے باہر رکھ دیا کرو۔ امی نے کہا تو میں آ گئی۔" ارم نے شرمندہ ہو کر وضاحت دی۔

"جب دھلوانے ہوں گے، دھلوا لوں گی۔ کل کو کمرے سے کوئی چیز ادھر ادھر ہو گئی۔ میں نے کسی سے پوچھ لیا تو طوفان آ جانا ہے۔"

"مجھے تم سے اس سے بھی گھٹیا بات کی امید کرنی چاہیے۔" ارم کو غصہ آ گیا۔

"اور یہاں کوئی دھوبی گھاٹ نہیں کھلا کہ جب دل چاہا دھلوا لوں گی۔ اب خود ہی دھو لینا۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی لانڈری باسکٹ وہیں پٹخی اور چلی گئی۔

"کس قدر بدزبان ہو گئی ہے۔" ثانیہ نے غصے سے دوبارہ کمبل تان لیا۔ مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمبل اس کے چہرے سے کھینچ لیا گیا۔

"اب کیا تکلیف ہے۔" وہ چلائی پھر ٹھٹکی۔

رابعہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"خیریت۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ "صبح صبح۔"

"یہ صبح ہے؟"
ثانیہ نے کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ پھر کھسیانی ہو کر بال سمیٹنے لگی۔
"کچھ شرم کرو۔ نند کپڑے دھو رہی ہے۔ ساس کچن میں مصروف ہے۔ اور مہارانی کی نیندیں پوری نہیں ہو رہیں۔"
"یہی تو موج ہے۔ اپنی نیند سوتی ہوں۔ اپنی نیند جاگتی ہوں۔ کسی کی جرات نہیں ہوتی مجھے ٹوکنے کی۔"
"عبید بھی کچھ نہیں کہتا۔" رابعہ نے کمبل ہٹا کر اپنے لیے جگہ بنائی۔
"صبح کا گیا پانچ بجے واپس آتا ہے۔" اس نے ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔
"اور تم نے کیا آتے ہی مجھے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ میری خوشی میں خوش نہیں ہوتی ہو۔" وہ ناراض ہوئی۔
رابعہ نے پیار سے اسے دیکھا۔ دبلا پتلا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔ چہرے کی رنگت مزید نکھر کر گلابیاں چھلکا رہی تھی۔
خوشی، آسودگی، بے فکری، حسن اور خوب صورتی کو مزید جلا بخشتی ہے۔
"تمہاری خوشیاں دائمی رہیں۔ اسی لیے سمجھاتی رہتی ہوں۔ یہ اچھے لوگ ہیں۔ ان کی قدر کرو۔"
"قدر تو یہ کریں اور شکر بھی...... ابھی تک ان کے بیٹے کو لے کر الگ نہیں ہوئی۔" رابعہ ششدر سی رہ گئی۔
آسیہ نے چائے بنائی۔ ٹرے تیار کی اور ارم سے کہا، رابعہ کے لیے چائے لے جائے۔
"امی! میں نہیں لے جا رہی۔ ابھی کپڑے لینے گئی تو اس نے مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں۔"
"رابعہ تو آتی ہی نہیں ہے۔ مہمان ہے اور وضع دار گھرانوں میں مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔"
"ہماری ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے ثانیہ کا میرے ساتھ ایسا رویہ ہے۔" ارم چڑ گئی۔
"اچھا چھوڑو۔ میں لے جاتی ہوں۔" آسیہ کا لہجہ بجھ سا گیا۔
"ایک تو ہر کام آپ خود کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اچھی بلیک میلنگ ہے۔ پتا ہے نا۔ مجھے آپ کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا۔"
وہ غصے سے ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ آسیہ نے تشویش کے ساتھ اسے جاتے دیکھا...... نجانے کیوں وہ ہر بات پر چڑنے لگی تھی۔
"تم ابھی تک...... مطلب یہ خناس تمہارے دماغ سے نکلا نہیں۔"
ارم رابعہ کی آواز پر رک گئی...... آج کل وہ عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی تھی جس میں رک کر بات سننا بھی شامل تھا۔
"اچھی بھلی سچویشن بن گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، موقعہ دیکھ کر عبید سے کہہ دوں گی کہ میرا گزارہ نہیں ہے۔ مجھے الگ گھر لے دو۔ مگر ارم نے معافی مانگ کر سب برباد کر دیا۔"
ارم ششدر سی رہ گئی...... پھر گہری سانس لے کر اندر داخل ہوئی...... رابعہ تھوڑا گھبرا گئی۔
ارم نے ٹرے قریب کی میز پر رکھی اور سیدھی ہو کر رابعہ کو دیکھا...... پھر ثانیہ سے مخاطب ہوئی۔
"تھوڑا بھرم تو رہنے دو ثانیہ! ایسے پلانز بناتے ہوں تو دروازہ بند کر لیا کرو۔"
"نہیں...... ارم! ثانیہ کا یہ مطلب نہیں تھا......" رابعہ نے گھبرا کر وضاحت کرنا چاہی۔
"میرا یہی مطلب تھا۔ ثانیہ نے اطمینان سے بات کاٹی۔ "اور تم کیوں گھبرا رہی ہو۔ پہلے بھی غلطی کر کے معافی مانگ چکی ہے۔ ایک بار پھر مانگنی پڑے گی...... اس کی بات پر یقین ہی کون کرتا ہے۔"
ارم کو احساس ہوا، کم ظرفوں کے سامنے جھکنا مصلحت سے کام لینا سب سے بڑی بے عزتی ہے۔
"وہ غلطی تھی نہ غلط فہمی اور میں نے معافی صرف اور صرف اپنے بھائی کی خوشی کے لیے مانگی تھی......" ارم کا لہجہ صاف تھا۔ ثانیہ تلملا گئی۔ تب ہی طنزیہ انداز میں بولی۔

"چلو، تم نے یہ تو مانا...... تمہارے بھائی کی خوشی میں ہوں۔"

"میری تو یہی دعا تھی کہ تم میرے بھائی کی خوشی ہی بن کر رہو۔ مگر تمہاری حرکتیں ایسی نہیں لگتیں۔" ارم نے تلخی سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

ثانیہ کے سر پر لگی تلوے پر بجھی۔

"دیکھی تم نے اس کی زبان۔ تم کہتی ہو، یہ بہت معصوم ہے۔"

"اس نے سن لیا تھا ثانیہ۔"

"تو سنتی رہے...... عادت ہی پڑ گئی ہے دروازوں سے لگ لگ کر سننے کی...... اب بندہ اپنے کمرے میں بات بھی نہیں کر سکتا۔"

رابعہ بس تشویش سے اس کا چہرہ ہی دیکھتی رہی۔ اس تشویش کا اظہار وہ ماں باپ کے سامنے بھی کر گئی۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ تو عیش کر رہی ہے عیش۔ عبید پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔" نادرہ نے نمکو کا پھنکا مارا...... جو رات وسیم باقی چیزوں کے ساتھ لایا تھا۔

"خدا کے لیے اماں۔ وہ گھر سجانے کے لیے شوپیس لے کر نہیں گئے...... گھر بسانے کے لیے لے کر گئے ہیں...... مگر آپ کی بیٹی اور اس کی لاپرواہیاں۔" رابعہ اپنا ہی سر پیٹ کر رہ گئی۔

"ابا! آپ ہی کچھ سمجھائیں۔"

ابا سکون سے چائے میں بیکری کے بسکٹ ڈبو کر کھا رہے تھے۔

"ان ماں بیٹی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ انہوں نے کسی کی نہیں سنی۔"

"نہیں رہنے دو۔ یہ سسرالیے ہوتے ہی اس قابل ہیں کہ انہیں ان کے ٹھکانے پر رکھا جائے۔ مجھے کون سا صلے مل گئے خدمتوں کے۔" نادرہ نے تنک کر کہا۔

رابعہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ کسی کی فکر نہیں کرتی۔ مگر اب وسیم کی شادی کی فکر کر لیں۔ وہ بار بار کہہ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے" نادرہ چونکیں تو رابعہ نے تفصیل بتا دی...... نتاشا اور وسیم کا آپس میں رابطہ ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا یہ لوگ دوبارہ رشتہ لے کر جائیں۔

نمکو نادرہ کے حلق میں پھنس گئی۔ وہ تو نتاشا اور ارم دونوں پر مٹی ڈال کر دو چار سال بیٹے کی کمائی کھانے کا پکا ارادہ کر چکی تھیں۔

"اس بڑھیا سے اب کام نہیں ہوتا مگر بہو لا کر گھر اس کے حوالے کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔" شبیر کو ان کی حالت دیکھ کر لطف آیا۔

"بہو تو وسیم بھائی کے ساتھ چلی جائے گی، آپ کو کیا فائدہ ابا۔"

"کاہے کو چلی جائے گی۔ ہمیں کون سنبھالے گا۔ بہو کا کام یہی تو ہوتا ہے سسرال کو سنبھالے۔" نادرہ بھڑک کر بولیں۔

شبیر اور رابعہ کا منہ کھل گیا۔

"اگر ثانیہ جیسی ہوئی تو۔ تو کیا کریں گی۔"

"ہائے ہائے۔ ہر وقت اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ بہن ہو یا دشمن۔" کھسیانی بلی کھمبا نوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ جوتے پہنتے عبید نے اسے دیکھا تو چپ نہ رہ سکا۔

"یار...... ٹیبل پر ہی رکھ دیتیں۔ میں آ رہا تھا۔ پہلے بھی سب مل کر ہی ناشتہ کرتے ہیں۔"
"مجھے تو آنٹی نے ہی کہا تھا کہ عبید کا ناشتہ بنا کر لے جاؤ۔ روز ہی ان کی ناشتے کو لے کر بحث ہوتی تھی۔ میں نے اپنا بھی بنا لیا۔ تمہیں برا لگا۔" ثانیہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔
"اچھا۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ برسوں کی عادت تھی۔ ناشتہ اور رات کا کھانا سب اکٹھے ہی کھاتے۔
"اور ہاں۔" ثانیہ نے ٹیبل قریب کی اور کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئی" آج اپنے کپڑے بھی لانڈری میں دے آنا۔"
"کپڑوں کو کیا ہوا؟ وہ تو ہمیشہ گھر میں ہی دھلتے ہیں۔" عبید ٹھٹکا۔
"ارم نے کہا ہے عبید کے اور اپنے کپڑے خود دھویا کرو۔" وہ ابلا ہوا انڈا چھیلنے لگی۔" اور مجھ سے تو اپنے کپڑے نہیں دھوئے جاتے ہمیشہ امی ہی دھوتی تھیں...... پھر سردی کتنی ہے۔"
"اتنی بڑی لڑکی کے ہوتے اماں کام کرتی تھیں۔ سچ ہے انہوں نے تمہیں بہت بگاڑا ہے۔ اور لگتا ہے باقی کی کسر میں پوری کروں گا۔" وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔
"ہاں بہت لاڈ اٹھاتے ہو نا میرے......" ثانیہ نے تیکھی نگاہ سے گھورا۔
"کسر بھی نہیں چھوڑی۔"
"تو پھر کپڑے لے کر جانا۔"
"اور کوئی حکم؟"
"شام کو جلدی آ جانا۔" اگلا حکم صادر ہوا۔
"میرے ابا کا آفس نہیں ہے۔ اور جتنی بار تم کال کرتی ہو۔ باس ویسے ہی خوں خوار نظروں سے گھورتے ہیں۔" "وہ جیلس ہوتے ہوں گے کہ عبید کی بیوی اس سے اتنا پیار کرتی ہے۔"
"صدقے اس پیار پر۔" وہ نہال ہوا تو کھلکھلا کر ہنستی ثانیہ نے انڈا اس کی پلیٹ میں رکھا خود جیم اٹھایا۔
"رہنے دو تمہاری میٹھی میٹھی باتوں سے ویسے ہی میرا شوگر لیول ہائی ہو رہا ہے۔ وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

☆☆☆

دونوں تیار ہو کر باہر آئے...... چاند سورج کی جوڑی تھی۔ آسیہ نے دل میں نہیں لفظوں میں بلائیں لیں...... توفیق نے بھی پیار سے دیکھا۔ ارم خاموشی سے میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔
"ماشاءاللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔"
"آپ بھی حد کرتی ہیں آنٹی۔" ثانیہ کے موتیوں جیسے دانت چمکے۔" کبھی ساس کو بھی اپنی بہو اچھی لگتی ہے۔" عبید ٹپٹا گیا۔ ارم نے طنزیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مسکرائیں۔
"کیوں نہیں لگتی۔ میرے بیٹے کی زندگی کا حصہ ہو۔ اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ ہماری آنے والی نسل کی امین ہو۔ پیاری تو لگو گی۔"
توفیق صاحب نے اطمینان کے اظہار میں گردن ہلائی۔
"سن لیا۔" عبید نے جتایا۔
"سن لیا...... بہت ہی میٹھی باتیں کرتی ہیں آنٹی۔" ثانیہ اپنی حیرت سے باہر آئی۔
"تھوڑی مٹھاس تم بھی لے لو۔" عبید ماں کی بات پر نہال ہو گیا تھا۔ ثانیہ نے بدقت اس بات کو ہضم کیا پھر آسیہ کے لہجے سے تھوڑی مٹھاس مستعار لیتے ہوئے ارم سے پوچھا۔
"ارم! ہم ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔ چلو گی ساتھ۔"

اسے یکسر نظر انداز کر کے میگزین میں گم ارم چونکی۔ پھر رکھائی سے ناں کر دی۔ عبید نے اصرار کیا۔
''نہیں بھئی۔ میں کباب میں ہڈی بننا نہیں چاہتی۔''
''وہ اصرار کر رہے تھے چلی جاتیں بیٹا۔'' آسیہ نے ان کے جانے کے بعد ٹوکا۔ ارم چپ رہی۔ اس دن جو کچھ سنا تھا۔ ماں باپ کو بتا کر دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا ان دونوں کی زندگیوں میں بالکل دخل نہیں دے گی۔ تاکہ ثانیہ کو کوئی بہانا نہ مل سکے۔
''میں چاہتا ہوں، ہمارا رشتہ ہمیشہ اسی طرح تازہ اور مہکتا رہے۔'' اس کی گوری کلائیوں میں سرخ گلاب مہک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ عبید کے مضبوط ہاتھوں میں تھے۔ ثانیہ نے اپنا گال پھولوں پر رکھ دیا۔
''تم اسی طرح پیار کرتے رہو۔ ہمارا رشتہ اسی طرح مہکتا رہے گا۔''
گاڑی کے شیشوں پر دھند کا پردہ تھا۔ اندر زندگی مسکرا رہی تھی۔ جذبات کی حدت خواہشوں کی گرمائش تھی۔
''میں نے تمہارے ساتھ زندگی کی خوب صورتی کو محسوس کیا ہے۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو پورا کیا ہے۔ میں صرف تمہارے ساتھ مرنا، تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔''
''ارے میری جان، تم کہو تو تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں۔'' عبید نے اس کی ناک کھینچی وہ سیدھی ہوگئی۔
''ہاں توڑ لاؤ۔''
وہ سٹپٹا گیا۔ ''کوئی ایسے بھی کہتا ہے۔''
''میں کہتی ہوں۔''
عبید نے باہر دیکھا۔ ''آج سردی بہت ہے، کسی اور دن کا پروگرام نہ رکھ لیں۔''
وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
''جو کر نہیں سکتے، وہ کہتے کیوں ہو؟''
''غلطی ہوگئی بیگم صاحبہ...... اب گھر چلیں۔''
''میرا دل چاہتا ہے، ساری رات سڑکوں پر آوارہ گردی کروں۔'' اس کا ابھی بھی ارادہ نہیں تھا۔ مگر عبید کو صبح آفس بھی جانا تھا۔
''پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ نکاح نامہ بھی نہیں ہے۔'' عبید نے ڈرایا۔
''بزدل۔''
ارم ان کے لیے جاگ رہی تھی۔ دروازہ اسی نے کھولا۔
''امی، ابو سو گئے؟''
''ظاہر ہے، ایک بج رہا ہے۔'' ارم کی اپنی نگاہوں میں نیند بھری تھی...... ثانیہ تو میں تھک گئی کہہ کر کمرے کی طرف چل دی۔
''سوری یار۔ تمہیں ہمارے لیے جاگنا پڑا۔'' عبید کو شرمندگی ہوئی۔ ''وہ کوئی بات نہیں کہہ کر اندر کی طرف چل دی۔ تب عبید کو احساس ہوا اس سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ ارم کے لیے کچھ بھی نہیں لے کر آیا...... اور ایسا پہلی بار ہوا تھا اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔

☆☆☆

دروازہ تب بھی ارم نے ہی کھولا تھا...... مگر جگہ دینے کے بجائے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ لیے۔
''کیا ہے؟'' وہ دوستوں کے ساتھ دعوت اڑا کر آیا تھا۔

"نکالو۔" ارم نے ہاتھ سامنے کیا۔
"سوری۔ آج جمعرات نہیں ہے۔ وہ بے نیازی سے گویا ہوا۔
"نکالتے ہو یا ابو کو بلاؤں۔"
"ندیدی...... بھوکی......" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی سی چاکلیٹ نکال کر ہتھیلی پر رکھ دی۔ ارم کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔
"کیا تم آدھی رات تک دوستوں کے ساتھ تکے اڑاؤ۔ اور میرے لیے صرف ایک چاکلیٹ کوئی برگر......کوئی پزا...... کچھ بھی نہیں۔ یعنی آدھی رات تک جاگنے کا صلہ محض ایک چاکلیٹ۔
"اب کیا پوری دکان اٹھا لاتا۔"
"یہ بھی تم ہی کھالو۔" وہ ناراض ہو گئی اور عبید کے ہاتھ پاؤں چھوٹ گئے۔
"اچھا سوری یار! کل تمہیں پزا کھلانے لے جاؤں گا۔"
وہ ہمیشہ جلدی مان جاتی تھی...... فوراً ہی بہل گئی۔
"ثانیہ کو بھی لے جائیں گے۔"
"بالکل نہیں۔ اتنا کھاتی ہے۔ بل بڑھ جائے گا۔"
اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی ارم نے آنکھ سے ٹپکے آنسو کو ہتھیلی میں جذب کر لیا اور لیٹ گئی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔
اس بات کا احساس ثانیہ کو بھی ہوا تھا۔
جب چہرے سے میک اپ صاف کرنے سے پہلے اس نے عادتاً اپنے موبائل پر آئے میسج چیک کیے۔
"مبارک ہو میری اور وسیم کی منگنی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔"
نتاشا کا میسج...... ثانیہ کی آنکھیں تحیر ورنج سے پوری کھل گئیں۔
منگنی۔ وسیم اور نتاشا اس کے مشورے کے بغیر۔ کیا وقت نے الٹا چلنا شروع کر دیا ہے۔
وہ شاکڈ تھی۔

☆☆☆

ایسا دماغ ہوا تھا رات سے کہ جلدی میں دو انڈے فرائی کیے...... سلائس رکھے اور ٹرے اٹھالی۔ ساتھ والے چولہے پر آسیہ آلو کے پراٹھے بنا رہی تھیں ایسا روکھا سوکھا ناشتا دیکھ کر ممتا تڑپ گئی۔
"بیٹا! دو منٹ رک جاؤ...... یہ پراٹھا بن رہا ہے۔ وہ لے جاؤ۔"
ثانیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی عبید اور توفیق صاحب ایک ساتھ کچن میں داخل ہو گئے۔
"ناشتا" ثانیہ نے جلدی سے قدم بڑھائے۔ مطلب یہ تھا کہ ناشتہ لے کر جا رہی ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔
"یہیں رکھ دو۔" وہ توفیق صاحب کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ ثانیہ نے بدمزہ ہو کر ٹرے میز پر رکھی۔ عبید نے ایک نظر ٹرے پر ڈالی اور مسکرا دیا۔
"تمہارے فرائی انڈے تو کھالوں گا۔ مگر امی کے پراٹھے کے ساتھ...... اب آلو کا پراٹھا کون کافر چھوڑے۔"
اس نے باپ کے لیے کرسی کھینچی پھر خود بھی بیٹھ گیا۔
"یاد ہے امی کے پراٹھوں کے لیے کیسے ناشتا چھوڑ کر بھاگی تھیں۔ خوشبو دیوار کے اس طرف اور یہ دیوار کے اس طرف۔"
سب ہنس دیے...... ثانیہ کو برا لگا۔ تو ٹرے اٹھالی۔

''کیا ہوا؟'' عبید نے حیرت سے دیکھا۔
''مجھے کچھ ہلکا پھلکا کھانا ہے۔''
''کھالو یار! کچھ نہیں ہوتا۔'' عبید نے اصرار کیا۔
''مجھے ہوتا ہے۔'' وہ کہہ کر ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ عبید ہلکا سا شرمندہ ہوا۔ مگر خاموشی سے اس پراٹھے کی طرف متوجہ ہوا جو ماں نے سامنے رکھا تھا۔
''آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی...... ابھی سختی نہیں کرنا چاہتا۔'' عبید کی آواز مدھم تھی۔
''کوئی بات نہیں...... وقت کے ساتھ ساتھ سب معاملات ترتیب پا جاتے ہیں۔'' توفیق صاحب نے تسلی دی۔ خود بھی تھوڑا وقت فیملی کو دو۔ بیوی کو بھی ساتھ لایا کرو۔ اسی طرح گھر کا ماحول بنتا ہے۔''
انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں احساس دلایا کہ وہ کچھ دنوں سے کیسے سب سے کٹ کر رہ رہا ہے۔ عبید نے شرمندگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''کسی کو میرا احساس بھی ہے۔ وسیم کی نتاشا کے ساتھ منگنی کی خبر جب میرے گھر جائے گی تو میرے سسرال والے کیا کہیں گے۔'' ثانیہ نے گھر جاتے ہی ہنگامہ اٹھا دیا۔ ''اس طرح اس پر لگایا ارم کا الزام سچ ہی ثابت ہوگا۔''
''میری منگنی اب کیا ان کی مرضی سے ہوگی۔'' وسیم نے بھنویں اچکا کر بہن کو دیکھا۔ دادی الگ منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ انہیں نتاشا ویسے ہی پسند نہ تھی۔ نادرہ کو اس بات کا قلق تھا کہ وسیم نے سارے معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے تھے۔ کب اس کی نتاشا کے ساتھ اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہوئی، کسی کو خبر نہ ہوئی۔ خود ثانیہ بھی بے خبر تھی۔
''آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں وسیم بھائی! وہ لوگ تو شاید اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم لوگ دوبارہ رشتہ لے کر جائیں۔''
وسیم کی تیوری چڑھ گئی۔
''یہ تو اب ممکن ہی نہیں اور میں یہ بات ارم کو کھل کر بتا چکا ہوں۔''
ثانیہ ٹپٹا گئی۔
''آپ کی ارم سے بات ہوئی؟''
''میری نتاشا سے ساری بات ہو گئی ہے۔ منگنی کا فنکشن اس کے گھر ہوگا تم کوئی بھی بہانا بنا کر آ جانا۔ اور یہ بھی صرف تمہاری خاطر...... تا کہ تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ لیکن ظاہر ہے، میں نتاشا سے شادی کروں گا تو یہ بات چھپ تو نہیں سکتی۔ تمہارے پاس کچھ دن ہوں گے۔ اپنے گھر کے معاملات خود سیٹ کرو۔ کیونکہ میں تمہاری وجہ سے بلیک میل نہیں ہوں گا۔ یہ میری زندگی ہے اور اس کے فیصلے میں خود کروں گا۔''
وہ ارم کے ذکر کو گول کر کے دوٹوک لہجے میں بولا۔
سب ہکا بکا رہ گئے۔
دادی نے جتاتی نظروں سے سب کو دیکھا۔
''جب سب کچھ طے ہی کر لیا ہے تو جاؤ بیاہ کر بھی لے آؤ۔'' نادرہ بھڑک اٹھیں۔ ''ایسی بے باک لڑکی کہ شادی بیاہ کے معاملات خود ہی طے کرتی جا رہی ہے۔''
''تو کیا ہوا؟ ثانیہ نے بھی تو یہی سب کیا تھا۔'' دادی نے بھگو کر ماری۔ اور سب کو بڑے زور سے لگی۔ نادرہ اور ثانیہ نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔

شبیر غصے سے دھاڑے۔
''بس چپ کرو۔ جب تم لوگ فکر نہ کرو گے تو وہ خود ہی فکر کرے گا۔ یہ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔ ان ماں بیٹی کے دل میں تو تمہیں دولہا بنتے دیکھنے کا ارمان ہی نہیں ہے، تمہیں کنوارا ہی بوڑھا کردیں گے۔''
''اس سارے واویلے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ آپ لوگ تیاریاں کریں۔ اب یہ ثانیہ کو پتا ہوگا اسے اپنی سسرال والوں کو کیسے سنبھالنا ہے۔'' وہ بات ختم کرکے اٹھ گیا۔
''دیکھا کم بخت نے کیسے قابو میں کیا ہے؟'' نادرہ رونے بیٹھ گئیں۔
''جیسے تمہاری بیٹی نے۔'' دادی نے یہ جملہ دل میں ہی کہا تھا۔
ثانیہ کے اندر غصے سے آگ بھڑکنے لگی۔
''نتاشا۔'' اس نے بہت زور سے مٹھی بند کی۔ جیسے نتاشا کی گردن مروڑی ہو۔

☆☆☆

''کیا مطلب؟ ارم نے ابھی تک تمہاری جان نہیں چھوڑی۔'' نتاشا نے بھاپ اڑاتے سوپ کے پیالے سے نظریں ہٹا کر سامنے بیٹھے وسیم کو دیکھا۔ ریسٹورنٹ کے گرم آسودہ ماحول میں خوراک کی خوشبو۔ دھیمی آوازیں اور برتنوں کی کھنک گھل مل گئی تھی۔
''اتنا بے وقوف تو نہیں ہوں کہ مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلتی رہے گی۔ بھول ہے اس کی۔'' نتاشا نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرادی۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ دونوں اس مقام تک آئے تھے تو اس میں نتاشا کا ہی ہاتھ تھا۔ جس نے خود وسیم سے رابطہ کیا۔ ورنہ وہ خود تو کبھی بھی یہ جرات نہ کرتا۔
''تمہاری بہن کی سسرال کا معاملہ ہے۔'' نتاشا نے ہمدردی سے کہا۔
''میری بہن میں اتنے گٹس ہیں کہ اس سچویشن کو سنبھال لے۔ ارم انکار کرچکی ہے۔ اب انہیں کوئی حق نہیں کہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کریں۔ عبید سمجھ دار انسان ہے اور ثانیہ سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔ پتا نہیں ثانیہ گھبرا کیوں رہی ہے۔''
وسیم نے کندھے اچکائے۔
''محبت تو تم بھی ارم سے کرتے تھے۔''
نتاشا کی بات پر وسیم نے ہاتھ روک کر نتاشا کو دیکھا۔
''مگر وہ ویسی نہیں نکلی جیسا میں نے اسے سمجھا تھا۔''
''اگر میں بھی ویسی نہ نکلی جیسا تم نے مجھے سمجھا ہے۔'' نتاشا کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوال اور تبسم گڈمڈ ہوگیا۔
''قسمت مجھے دوسری بار بھی دھوکا دے گی؟'' وسیم سنجیدہ تھا۔
''ہرگز نہیں۔'' نتاشا نے بے ساختہ کہا۔
''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔
''فکر نہ کرو۔ مجھ سے شادی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''
''میں سودا نہیں کررہا۔ رشتہ بنارہا ہوں۔ مجھے تم سے صرف محبت اور اعتبار چاہیے نتاشا۔''
''وسیم! تم کبھی کسی بھی معاملے مجھے خود سے الگ نہیں پاؤ گے۔''

نتاشا نے ہاتھ بڑھایا تو وسیم نے تھام لیا۔

☆☆☆

عبید نے تصویر کو چٹکی میں پکڑ کر اپنی آنکھوں کے سامنے بلند کیا...... وہ یوں جائزہ لے رہا تھا گویا ایکسرے کر رہا ہو۔ ارم نے جز بز ہو کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آسیہ کو بیٹے کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''امی! لڑکا تو......'' وہ متذبذب تھا۔

''کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگتا۔ آسیہ کو قدرے حیرت ہوئی جبکہ تصویر اور تمام معلومات کی روشنی میں عبید کو فوراً پسند آ جانا چاہیے تھا۔

''بہت زیادہ اچھا ہے۔'' اس نے بے یقینی سے ارم کو دیکھا۔

آسیہ نے عبید کے کندھے پر چپت لگائی۔

''تمہارے ولیمے میں بھی آیا تھا۔ ماں تو بزرگ اور بیمار خاتون ہیں، وہ نہیں آ سکتی تھیں۔''

''ہاں کچھ یاد تو ہے۔'' پھر آنکھ سے ارم کو اشارہ کیا۔ ''اس کو دکھایا؟''

انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''دیکھو گی۔ دکھاؤں۔'' وہ مائل بہ شرارت ہوا...... ''چپ کیوں ہو؟ بولو نا۔ ارے یہ تو شرما رہی ہے۔''

ارم کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو۔''

''اچھا یہ لو، دیکھ لو۔'' اس نے تصویر عین ارم کے سامنے کی۔

ارم نے بنا دیکھے تصویر کو جھپٹ کر دو ٹکڑے کیا اور میز پر پھینک دیا۔ ''مجھے شادی نہیں کرنی۔''

وہ دونوں متحیر رہ گئے۔

''نہ مجھے شادی کرنی ہے اور نہ کوئی میرے لیے رشتہ لے کر آئے۔''

وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

''ارم......'' عبید نے حیرت سے پکارا۔ مگر وہ بنا کچھ سنے وہاں سے بھاگ گئی۔

''یہ اتنی بدتمیز تو کبھی نہیں تھی......'' آسیہ کو غصہ آ گیا۔

''ہو سکتا ہے۔ اسے لڑکا پسند نہ آیا ہو۔''

''اس نے تصویر دیکھی کب ہے اور انکار کا یہ کون سا طریقہ ہے۔'' انہوں نے میز پر پڑے تصویر کے ٹکڑوں کو دیکھا۔

''امی! پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ میں بات کرتا ہوں۔'' وہ انہیں تسلی دے کر اٹھ گیا۔ ''آخر اس ردعمل کی کوئی تو وجہ ہو گی۔''

(''کہیں وہ وسیم) آسیہ نے اپنی سوچ کو وہیں لگام دے دی۔ انہیں خود بھی اپنی سوچ پر یقین نہ تھا۔

''پلیز! اب وجہ پوچھنے مت لگ جانا۔ کوئی وجہ نہیں ہے۔'' عبید کو کمرے میں داخل ہوتے دکھ کر ہی ارم نے چڑ کر کہا۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی ایک پیر اضطراری انداز میں فرش پر مار رہی تھی۔ ''اور تمہیں میرے انکار پر حیرت کیوں ہے؟''

عبید خاموشی سے آ کر پاس بیٹھ گیا۔

''انکار پر نہیں ردعمل پر حیرت ہے۔ آرام سے بات ہو سکتی تھی مگر اس طرح تصویر پھاڑنا۔''

''عبید! یہ میری زندگی ہے تو فیصلے کا اختیار بھی میرا ہونا چاہیے۔ مجھ سے میری رائے پوچھی میں نے رائے

دے دی۔"

"تمہیں کس بات پر غصہ ہے؟" عبید نے اسے غور سے دیکھا۔

"نہیں ہے غصہ۔" وہ جھنجلا گئی۔ "بس اتنا چاہتی ہوں کہ جس طرح تم نے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا ہے۔ میں بھی خود کروں۔" "یا پھر کہہ دو کہ مجھے صرف حکم سنایا گیا ہے۔ میں چپ چاپ سر جھکا دوں گی۔"

عبید کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ شاید تم ابھی کھل کر بات کرنا نہیں چاہتیں، ہم بعد میں بات کر لیں گے لیکن یاد رکھنا۔ ہم لوگ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ بھی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"شکریہ۔" لیکن اس کے شکریہ میں بھی طنز تھا۔

عبید گہری سانس لے کر چلا گیا۔

ارم نے سلگتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کے ذہن میں عجیب ابال سا اٹھ رہا تھا۔

☆☆☆

"یہ وسیم پر کیا جادو کیا ہے جو تمہاری ہر بات مانتا جا رہا ہے؟" اس کے لہجے میں حسد تھا۔ جلن تھی۔ اس کے عین سامنے بیٹھی نتاشا نے مسکراہٹ ضبط کرتے بظاہر سادگی سے جواب دیا۔

"وہی جو تم نے عبید پر کیا ہے؟"

"وہ میرا شوہر ہے۔" ثانیہ کو برا لگا۔ نتاشا تیز لڑکی تھی۔ اس کا دل نہیں تھا کہ اسے بھابھی بنائے۔ مگر اب جو کچھ اور جس طرح ہو رہا تھا، اسے نتاشا سے ملنا پڑا...... تب ہی اس کے گھر چلی آئی۔

"وسیم بھی ہو جائے گا۔ شوہر۔" وہ کہہ کر ہنس دی۔ ثانیہ نے خود کو بے آرام سا محسوس کیا۔

"وسیم کو پتا چل گیا کہ اس دن تمہاری وجہ سے ارم نے انکار کیا ہے کیونکہ تم نے وہاں آ کر ہنگامہ۔"

"نہیں میری جان! تم اس بات سے گھبرا رہی ہو کہ اگر وسیم کو یہ پتا چل گیا کہ میں نے وہ ہنگامہ تمہارے کہنے پر کیا ہے۔"

ثانیہ کی رنگت متغیر ہوئی۔

"لیکن اسے بتائے گا کون؟" نتاشا نے جملہ مکمل کیا۔ ثانیہ نے اسے دل ہی دل میں نجانے کتنی گالیاں دیں۔

"تم سناؤ۔ سسرال کے معاملات کیسے چل رہے ہیں۔" نتاشا نے موضوع بدل دیا اور سسرال پر بولنے کے لیے ثانیہ کے پاس بہت کچھ تھا۔

"شادی کے بعد سارے مرد ایک جیسے ہی ہو جاتے ہیں۔"

"جوائنٹ فیملی میں یہی مسئلہ ہے۔ ماں کو بھی وقت دو۔ بہن کا بھی خیال رکھو۔ تم علیحدہ رہ رہی ہوتیں تو یہ مسائل نہ ہوتے۔" نتاشا نے ہمدردی سے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"اچھا موڈ ٹھیک کرو۔ شاپنگ پر چلتے ہیں۔" نتاشا فوراً کھڑی ہو گئی۔

"نہیں بھئی، پھر کسی نے دیکھ لیا تو۔"

"کوئی نہیں دیکھے گا۔ ہم جہاں جائیں گے، وہاں تمہاری ارم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔"

☆☆☆

"اتنی ساری چیزیں۔" نادرہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

"نتاشا نے لے کر دی ہیں۔ میں نے تھوڑی کہا تھا۔ ثانیہ نے بال جھٹکے...... نتاشا نے اس کی کٹنگ کروادی تھی۔ جس سے وہ مزید ینگ اور اسٹائلش لگنے لگی تھی۔

اور امی۔ جو سامان اس نے ساس نندوں کو دینے کے لیے لیا ہے۔" وہ ایک دم پرجوش ہوئی۔ برانڈڈ سوٹ۔ بیگز۔"

"ساتھ نہیں لائی۔" نادرہ نے اشتیاق سے شاپنگ بیگز میں جھانکا۔

"وہ تو منگنی پر دیں گے۔"

"اچھا۔ اب جا کر گھر میں ذکر نہ کر دینا بے دھیانی میں۔"

"پاگل نہیں ہوں۔" وہ سامان سمیٹنے لگی۔ تب ہی شبیر چلے آئے۔ ثانیہ کو دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگے۔

"تم آج پھر یہیں ہو۔"

"ابا! آپ میرے ہر بار آنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے آنا ہی چھوڑ دینا ہے۔"

"احسان ہوگا ہم پر۔" انہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ نادرہ کو تاؤ آ گیا۔

"ساری عمر مجھے تو میکے جانے نہ دیا۔ اب کیا بیٹی پر بھی پابندی لگاؤ گے۔ میرا باپ بیمار تھا تو دس دن نہ رکنے دیا...... ماں مری تو قل خوانی کے بعد کہنے لگے کہ گھر چلو نہ تو اس کا باپ بیمار ہے نہ اس کی ماں مری ہے۔ اس لیے اپنے گھر جاؤ۔"

شبیر ابھی ابھی دادی کے پاس بیٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے ہی سمجھایا تھا۔

"یہی حال رہا تو لڑکی نہیں بسنے والی...... وہ لوگ کب تک برداشت کریں گے۔"

"جا رہی ہوں...... اب نہیں آؤں گی۔" وہ غصے سے شاپر سمیٹ کر چلی گئی۔

"ہمیشہ بیٹیوں کو ناراض کر کے گھر سے بھیجا ہے۔ رابعہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر چھوڑ آتے تھے۔" نادرہ کی آواز بھرا گئی۔ رابعہ کے نام پر ایک لمحے کو شبیر کو چپ لگ گئی۔

"رابعہ کی دفعہ میں غلط تھا۔" انہوں نے شاید پہلی بار اپنی کوئی غلطی تسلیم کی تھی۔ نادرہ اپنا رونا بھول گئیں۔

"اب تم غلط ہو۔ اسے اپنے گھر میں دل لگانے دو نادرہ! کل کو اس گھر میں بہو نے بھی آنا ہے...... یہ ہر وقت یہاں رہے گی تو خوامخواہ بدمزگی ہوگی۔"

"ہائے ہائے...... وہ کون ہوتی ہے...... میری بیٹیوں کے یہاں آنے پر برا ماننے والی۔" وہ تو بھڑک ہی گئیں۔

☆☆☆

"اگر جواب یہ ہے تو میں سوچ سکتا ہوں۔ وہ کس قدر پریشان ہے۔" توفیق نے پھٹی ہوئی تصویر دیکھ کر کہا۔

"وہ ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ عبید! تم نے اس سے بات کی۔" آسیہ نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ ابھی بات کرنا نہیں چاہتی۔" عبید نے کندھے اچکائے۔

"ابھی ضرورت بھی نہیں ہے، اسے وقت دو۔ میں خود بات کرلوں گا۔" توفیق صاحب نے کہا...... تو دونوں خاموش ہوگئے۔

ثانیہ نے ان سب کو وہاں دیکھا اور خاموشی سے کمرے میں آ گئی۔ اسے اپنی شاپنگ ٹھکانے لگانا تھی۔ عبید نے نہانا تھا۔ ماں سے فرمائش کر دی کہ سر میں تیل لگا دیں۔ وہ خوشی خوشی مالش کرنے لگیں۔

"تمہارے اور ثانیہ کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے؟" آسیہ نے اچانک ہی پوچھ لیا۔ توفیق صاحب

چونکے۔ عبید چپ سا ہو گیا۔

''کیوں؟''

''پہلے تم کبھی اتنی دیر تک ہمارے درمیان نہیں بیٹھے۔ اب وہ سارا دن میکے گزارتی ہے، تم ہمارے پاس بیٹھے رہتے ہو۔

''میں تو بیلنس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔''

''تو بیٹا جی، یہ بیلنس تو نہ ہوا۔ ہمارے ساتھ رہ کر اسے نظر انداز کرو۔ اس کے ساتھ رہ کر ہمیں...... تو یہ توازن تو نہیں۔'' توفیق صاحب نے نرمی سے ٹوکا۔ ''وقت کو تقسیم کرنا سیکھو جب ہمارے ساتھ بیٹھنے آتے ہو تو اسے بھی ساتھ لے آیا کرو اسی طرح اجنبیت ختم ہو گی۔''

''اجنبیت ہونی تو نہیں چاہیے۔ اچھا بھلا گھر پر توجہ دینے لگی تھی۔ اب پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' آسیہ الجھ کر بولیں۔

بات تو کچھ خاص نہ تھی۔

یہ اس سے دوسرے دن کی بات تھی جب عبید نے ماں کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے تھے۔ اور ثانیہ ٹرے کمرے میں لے گئی تھی۔ عبید نے اگلے دن جگانا چاہا تو اس نے ہاتھ ہی جھٹک دیا۔

''کیا ہوا؟ ناشتہ بنا دو۔''

''جا کر ماں کے ہاتھ کے پراٹھے کھاؤ۔ میرے سوکھے سلائس کھا کھا کر تو بور ہو گئے ہو۔''

''ہاں تو تم بھی ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اچھا بھلا ماحول ہوتا ہے۔ بہترین روٹین بنی ہے، سب ہنستے بولتے ناشتہ کرتے ہیں۔'' عبید نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سوئی جاگی آنکھوں میں بلا کا غصہ تھا۔

''میں نے تمہارے ساتھ شادی روٹین لائف گزارنے کے لیے نہیں کی میرے کچھ خواب میری کچھ خواہشیں تھیں۔''

ٹائی باندھتا عبید زچ ہو کر مڑا۔

''تو یار! میں نے تمہاری کون سی خواہش پوری نہیں کی...... ہنی مون منا آئے۔ سارے خاندان کی دعوتیں کھالیں...... سارا شہر گھوم لیا...... میں آفس سے کتنا بھی تھکا ہارا آیا۔ تم نے کہا، باہر چلنا ہے۔ میں لے کر گیا...... آدھی رات تک سڑکوں پر آوارہ گردی بھی کر لی۔ حالانکہ مجھے اگلے دن آفس بھی جانا ہوتا تھا۔ صرف اس لیے کہ تمہاری کوئی خواہش ادھوری نہ رہے۔''

''ہاں تو کیا احسان کیا ہے؟ بیوی ہوں تمہاری...... میرا حق ہے۔''

''تو ثانیہ بیگم! میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔ میری بھی کچھ خواہشیں ہیں۔ اگر فرصت ہو تو کسی دن وہ بھی سن لینا۔'' وہ تلخی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

''بس اسی دن سے وہ منہ پھلائے پھر رہی تھی۔ عبید نے بھی پرواہ نہیں کی۔

ماں کی نرم انگلیوں کی تاثیر روح میں اتر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''سکون آ رہا ہے۔''

''بہت...... بس کریں۔'' عبید نے ماں کا ہاتھ پکڑا تب ہی ارم آئی۔ ماں کو دیکھا کہ کام ختم ہو گیا ہے تو تیل وغیرہ اٹھانے لگی۔ مگر ششدر سی رہ گئی۔ ماں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

وہ اس سے ناراض تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صائمہ نور



''ثوبیہ ثوبیہ......''

ثوبیہ کام کاج سے فراغت پا کر سکون سے باورچی خانے میں بیٹھی دال چاول کے ساتھ پیاز اور اچار لیے کھانا کھانے ہی لگی تھی، جب شبانہ یعنی اس کی ماں نے اسے آواز دی۔

ثوبیہ کا نوالہ منہ تک جاتا ہاتھ ہونٹوں کے کنارے تھم گیا۔

اس نے سر جھٹکا، وہ ثوبیہ کو اس کے جہیز کے چند اور نئے جوڑے جو وہ خالہ شمع کے ساتھ بدھ بازار سے لائی تھیں دکھانے کے لیے اتنی گرم جوشی سے بلا رہی تھیں، جبکہ ثوبیہ کو رتی بھر دلچسپی نہ تو شادی میں نہ ہی کپڑوں میں۔

''ثوبیہ!'' وہ ابھی اسی زاویہ پر بیٹھی تھی کہ دوبارہ صحن کے پار موجود چھوٹے سے کمرے سے آواز۔ ثوبیہ کی سماعت تک پہنچی اس نے بنا ہوا نوالہ تقریباً منہ میں ٹھونسا۔

''آتی ہوں۔'' ساتھ ہی جواب بھی دیا۔

ثوبیہ نے کھانا دوسری پلیٹ سے ڈھانپا اور پلیٹ جگہ پر رکھی۔ پانی کے دو گھونٹ بھر کر وہ اپنی ماں کے کمرے کی جانب چل دی۔

''ثوبیہ! یہ دیکھ خالہ لائی تھی، کل تیرے لیے۔'' شبانہ نے ثوبیہ کے آگے گہرے جامنی رنگ کا سوٹ لہرایا۔

ثوبیہ کو اتنے گہرے رنگ بالکل پسند نہ تھے پر وہ بامشکل ہی اپنی پسند ناپسند کا اظہار کیا کرتی تھی۔

اس نے اپنی ماں کا دل رکھنے کو کپڑا ہاتھ میں لیا تا کہ وہ اسے یہ نہ کہہ سکیں کہ اسے دلچسپی ہی نہیں کسی بھی چیز میں۔

''اچھا ہے۔''

ثوبیہ نے دل رکھنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ثوبیہ کپڑے کے معیار کو پرکھ نہ پائی جو اس نے اپنے کالج کی لڑکیوں کو فیرویل پر ایک سے ایک شان دار قیمتی ریشمی ونفیس اور مہین لباس زیب تن کیے نہ دیکھا ہوتا پھر بھی اسے اپنے جہیز میں شامل کسی بھی کپڑے کے کم قیمتی ہونے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہی اس کے کردار کی پختگی تھی جو اسے صرف اور صرف تعلیم کے حصول سے ملی تھی کیونکہ وہ محض نام کو کتابیں نہیں رٹ رہی تھی بلکہ تعلیم اسے واقعی شعور دے رہی تھی۔

اور یہ تو پھر— کپڑوں کی بات تھی وہ تو اپنی زندگی کے سب سے اہم معاملے یعنی اپنے منگیتر تک پر شاکر تھی حالانکہ اگر کوئی اس سے رائے لیتا تو وہ کہتی کہ جہاں بھی جس سے بھی اس کی شادی ہو وہ پڑھا لکھا ہو۔

''اے لو آپا! اس لڑکی کے چہرے پر تو بارہ بج رہے ہیں، اسے تو کوئی شوق ہی نہیں، ثوبیہ کی عمر کی لڑکیاں تو جہیز کی تیاریوں میں ہلکان ہوئی رہتی ہیں۔ ہر چیز من پسند، ہر چیز کا شوق انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور یہ ہماری لڑکی۔''

خالہ شمع اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما گھما کر اپنی بڑی بہن کو جتا رہی تھیں۔

ثوبیہ شمع خالہ کے گہرے مشاہدے پر چونکی۔

”نہیں شمع! ثوبیہ کے مزاج کو تو تم جانتی ہو اسے تو بس کتابوں کا شوق ہے، یہ تو ہے ہی ایسی سنجیدہ مزاج۔“

شبانہ اپنی بہن شمع کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ یوں تو ثوبیہ اور ہارون کی بات طے ہونے کے بعد سے ہی شمع گاہے بگاہے ثوبیہ کی عدم دلچسپی کا ذکر مختلف طریقے سے کرتی آئی تھیں پر آج ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ شبانہ بھی کھٹک گئیں وجہ شاید یہی تھی کہ اب شادی بالکل سر پر آن پہنچی تھی اور وہ ان کو ثوبیہ کی طرف متوجہ کر رہی تھیں تو عین یقینی تھا کہ وہ ضرور اپنی اور شبانہ کی بڑی بہن راشدہ سے بھی یہ بات کہتیں جو ثوبیہ کی ہونے والی ساس تھیں۔

اسی لیے گڑبڑا کر شبانہ نے فوراً وضاحت کی تھی۔

ثوبیہ سنجیدگی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

”ثوبیہ کی تو مت ماری گئی ہے۔ پورے



خاندان کی خوب صورت لڑکیوں کو چھوڑ کر ثوبیہ کو چنا ہے میرے شہزادے نے۔"

شمع خالہ، ہارون سے بہت پیار کرتی تھیں یہ سچ تھا اور یہ بھی کہ وہ اپنی ردا کے لیے کب سے ہارون کو اپنا داماد تصور کیے ہوئے تھیں پر ہارون تو واجبی سی شکل والی ثوبیہ پر فریفتہ تھا۔

خاندان میں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی پر ہارون ...... ہارون کی اس محبت اور لگاوٹ کی سب سے اہم وجہ بھی یہی ثوبیہ کی اپنی پڑھائی اور کتابوں سے عشق تھا۔

وہ خاندان کی باقی لڑکیوں کی نسبت بہت سنجیدہ، کم گو اور سمجھ دار تھی۔

ہارون خود تو پڑھا لکھا نہیں تھا چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے گزر جانے کے بعد وہ پڑھائی نہیں کر سکا ویسے وہ پڑھ بھی لیتا تو کتنا میٹرک؟

ان کے یہاں پڑھنے کا نہ تو رواج تھا نہ ہی شوق بس ضرورت کی تعلیم حاصل کی، کوئی ہنر سیکھا اور گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

ہارون خود بھی تھوڑا مختلف تھا اسے خود تو وقت کی نزاکت تلے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں، لیکن اسے کتابوں سے عشق کرنے والی، اپنے ان پڑھ خاندان کی یہ پڑھی لکھی لڑکی بہت پسند تھی۔

ہارون نے یہ بات کبھی اپنی ماں کے علاوہ کسی سے نہ کہی تھی اس لیے پورا خاندان ہارون کے انتخاب پر حیران تھا۔ ثوبیہ کو بھی اس بات کا اندازہ نہ تھا۔ وہ تو ہارون کو باقی خاندان کے بے ڈھنگے، لاابالی غیر سنجیدہ لڑکوں جیسا ہی تصور کرتی تھی۔

"ثوبیہ! خیالوں کی دنیا سے باہر نکل بیٹا، یہ کتابیں کچھ نہیں دیں گی۔ ہارون تو اتنا پیارا بچہ ہے اس کے کتنے ارمان ہیں۔ ہر چیز اپنی مرضی چاؤ سے لے رہا ہے تیرے لیے، سچی تو اتنی خوش نصیب ہے سب رشک کر رہے ہیں بلکہ لگی لپٹی بغیر کہوں تو حسد ہی کر رہے ہیں خاص کر یہ شمع ...... یہ تو میری چھوٹی بہن اسی لیے اس کی نیت جانتی ہوں۔

وہ آج بھی اسی بات کی تلاش میں ہے کہ اسے موقع ملے، راشدہ باجی کے کان بھرے تاکہ یہ رشتہ ختم ہو سکے۔ اور وہ فوراً اپنی ردا کا رشتہ جوڑے۔ مانا کہ تو دو جماعت پڑھ گئی ہے پر اتنی افلاطون نہیں بنی کہ تیرے لیے کوئی شہزادہ آسمان سے اترے گا۔

اب اندر سے تو کتنی بھی سوگ میں ہے، پر خوشی خوشی شادی کی تیاری کر ...... کہ سب کو نظر آئے کہ تو خوش ہے۔ بس یہ دن خیریت سے گزر جائیں نکاح کے دو بول میں بڑی طاقت ہوتی ہے دیکھنا خود بخود تیرا دل کھنچ جائے گا۔"

شبانہ نے اچھی خاصی باتیں ثوبیہ کو سنا دی تھیں۔ وہ ماں تھیں اپنی بیٹی کا اچھا برا خوب سمجھتی تھیں۔

ثوبیہ مجرم کی طرح سر جھکا کر بیٹھی تھی، پتا نہیں اسے ہمیشہ پڑھائی کا طعنہ کیوں ملا کرتا تھا؟ اس نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اس کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا یا ہارون کے بارے میں کچھ بھی الٹا سیدھا، نہ وہ خود کو کسی سے بھی برتر تصور کرتی تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اس کی یہ محنت رائیگاں نہ جائے، بی اے کے امتحان ہو جائیں پھر جو مرضی شادی کی تاریخ ہو اسے فرق نہیں پڑتا تھا پر یہ بات کوئی سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

امی نے ثوبیہ کے اصرار پر راشدہ خالہ سے ذکر کیا تھا کہ چند دن بعد ہی ثوبیہ کے امتحان ہیں۔ اس کے بعد شادی کی تاریخ رکھ لیں پر شبانہ کی اس بات پر راشدہ خالہ نے سخت برا مانا تھا کہ امتحانوں کی اتنی اہمیت کہ شادی کی تاریخ آگے رکھ لیں حالانکہ سچ بات تو یہ تھی کہ وہ ثوبیہ اور اس کی ماں کی بات مان کر انہیں سر پر نہیں چڑھانا چاہتی تھیں۔ شبانہ اپنی بات کہہ کر کپڑے سمیٹنے لگی تھیں اور ثوبیہ اب بھی اپنی لامتناہی سوچوں میں گم صم سی بیٹھی تھی۔

☆☆☆

شمع خالہ اپنی چپل گھسیٹتی اپنی بڑی بہن راشدہ کے گھر داخل ہو چکی تھیں۔

راشدہ باجی سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی اپنے پاندان میں سے چھالیہ نکال کر کتر رہی تھیں۔

''آؤ آؤ شمع آؤ......''

راشدہ نے مسکراہٹ کے ساتھ شمع کا استقبال کیا۔ شمع ایسے چارپائی کے ایک کونے پر ٹک گئی جیسے غم کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا ہو۔

''نادیہ بیٹا! شمع خالہ آئی ہیں پانی لے کر آؤ۔''

انہوں نے سامنے باورچی خانے میں مصروف اپنی بیٹی کو آواز دی۔ ان کی آواز سن کر اندر سے ہارون بھی برآمد ہوا تھا۔

''سلام خالہ! بڑے دن بعد آئیں۔''

ہارون نے تپاک سے اپنی خالہ کو سلام کیا اور وہیں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ خالہ اب ہارون کو افسردہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا خالہ؟'' ہارون ان کی نگاہوں کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکا تو پوچھا۔

خالہ شمع اپنی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کرتے ہوئے ہارون کو دیکھنے لگیں پھر راشدہ آپا کے کان کے قریب ہوئیں۔

''آپا کچھ بھی کہو صاف نظر آرہا ہے ثوبیہ کے دل میں کچھ اور ہے، وہ ہارون سے شادی پر خوش نہیں اور یہ تم ہم سب جانتے ہیں کہ ثوبیہ کو پڑھے لکھے لڑکے پسند ہیں۔''

خالہ شمع اپنی بات کہہ کر اب راشدہ خالہ کے جواب کی منتظر تھیں۔

راشدہ خالہ چپ رہیں وہ بے بس تھیں ان کا بیٹا خود ثوبیہ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔

''تم چپ ہی رہو گی، میں تو کہتی ہوں ابھی بھی وقت ہے توڑ دو رشتہ، ہارون میں کس چیز کی کمی ہے لاکھوں نہیں تو ہزاروں کما رہا ہے۔

پڑھا لکھا نہیں تو کیا ہوا۔ کاروبار کرنا جانتا ہے۔ اور کیا چاہیے؟''

ہارون کو اب کچھ کچھ باتیں سنائی دے رہی تھیں وہ دانستہ انجان بن گیا یہ باتیں اس کے لیے بھی باعث تشویش تھیں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی بھی تو وہ ثوبیہ سے سنے گا یا اس کے گھر میں کسی سے پوچھے گا، سنی سنائی باتوں پر وہ کان نہیں دھرے گا۔

''ہارون!'' ہارون سوچ ہی رہا تھا کیا کرے اتنے میں اس کے دوست شہزاد نے اسے پکارا۔

''امی آتا ہوں۔'' وہ اپنی ماں سے کہتا ہوا سامنے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''کیا بات ہے ہارون! منہ پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟'' شہزاد اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات ہے اسی لیے پوچھا۔

"یار ایک بات ہے۔" شہزاد اس کا بچپن کا دوست تھا اور اس کی اپنی خالہ کی بیٹی کے لیے پسندیدگی سے اچھی طرح واقف تھا۔

"ابھی شمع خالہ آئی ہوئی ہیں گھر پر...... ان کا کہنا ہے کہ ثوبیہ ہمارے رشتے پر خوش نہیں۔"

ہارون یوں تو زمانہ شناس اور ایک زیرک لڑکا تھا پر محبت اور رشتوں کے معاملات میں وہ بہت سادہ تھا۔

ثوبیہ اسے پسند تھی، سگی خالہ کی بیٹی تھی اس نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ اور ثوبیہ مختلف طرح کے انسان ہیں اور کیا ثوبیہ بھی اس کی طرح اس کو پسند کرتی ہے یا نہیں؟

شمع خالہ کی بات سن کر اب وہ حقیقتاً پریشان ہو گیا تھا کیونکہ وہ دل و جان سے ثوبیہ کو چاہتا تھا۔ اور اس کی ماں بڑی عید کے فوراً بعد اس کی شادی کی تاریخ رکھنا چاہتی تھیں۔

"اس میں اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے خالہ کو بول کے ثوبیہ بھابھی یا ان کی امی سے کسی طرح معلوم کریں کہ کتنی سچائی ہے اس میں؟

اور کیا اگر ثوبیہ کو تو ناپسند ہو گا تو رشتہ ختم کر دے گا؟"

یہ تو ہارون نے سوچا ہی نہیں تھا وہ ایک اور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس بات کی تہہ تک ضرور پہنچے گا اس نے سوچا۔

"شہزاد میں آتا ہوں۔" اس نے شہزاد سے اجازت لی اور بے ارادہ ہی اس کے قدم شبانہ خالہ کے گھر کی طرف اٹھ گئے تھے۔

"امی! میری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ میرا کتنا بڑا خواب تھا گریجویشن کرنا۔ وہ ادھورا رہ جائے گا۔" ثوبیہ کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"میں کہتی ہوں ثوبیہ! بس کر دے اب۔ کیا ملے گا بی اے کے امتحان دے کر بھی؟ کون سا تو نے گورنر لگ جانا، کرنی تو وہی چولہا چوکی ہے تو نے ...... وہی ہانڈی روٹی۔ اس اتوار آ میں گی باجی تاریخ طے کرنے اب بھول جا امتحان اور شادی کی تیاری کر چپ چاپ۔"

شبانہ نے بات ختم کی۔ ثوبیہ اب مایوس ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما بی اے پارٹ دوم کا ایڈمٹ کارڈ ایک کتاب میں رکھا اور اندر کی جانب چل دی اس کے قدموں میں مایوسی کی چاپ تھی جو سننے والے نے سن لی تھی۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا۔ راشدہ خالہ ثوبیہ اور ہارون کی شادی تاریخ رکھنے آ رہی تھیں جو کہ شاید مہینہ بھر بعد کی تھی ثوبیہ کے دل کو شدید ٹھیس پہنچی تھی حالانکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھی اسے معلوم تھا کہ یہ شادی کی بات ضرور کسی نہ کسی صورت اس کے امتحانوں کے بیچ میں رخنہ ڈالے گی۔

اور وہی ہوا تھا۔ دل کو تو ہزار تاویلیں دے کر سنبھالا تھا پر آنسو بار بار گالوں پر پھسل رہے تھے۔

پھر خالہ تو نہیں آئیں ان کا فون آیا۔ وہ دعوت ملتوی کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ پتا نہیں انہوں نے شبانہ سے کیا کہا تھا ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ثوبیہ سامنے ہی کھڑی ان کو بات کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سہم سی گئی الٰہی خیر پتا نہیں کیا ہوا۔

"کیا ہوا امی!" چھوٹے بھائی نے امی کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں اتنے دنوں سے ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی راشدہ آپا یکدم شادی آگے بڑھا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کچھ دن رک جائیں۔ پتا نہیں شمع نے نہ کچھ کہا ہو ان سے۔ کہہ رہی تھیں اگلے اتوار کو آئیں گی ہارون کے ساتھ پھر تفصیل سے بتائیں گی معاملہ کیا ہے۔ بس اللہ خیر کرے۔"

وہ سچ مچ بہت پریشان ہو چکی تھیں۔

"کچھ نہیں ہو گا امی! آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔" چھوٹے بھائی نے امی کو تسلی دی تھی۔

ثوبیہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اسے اب آئندہ اتوار کا انتظار تھا تا کہ اصل بات کا پتا لگے۔ اللہ اللہ کر کے اتوار بھی آ گیا۔

☆☆☆

ہارون اور راشدہ خالہ ہی آئے تھے۔ ثوبیہ نے باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر صحن میں دیکھا۔ راشدہ خالہ کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔ ثوبیہ ان دونوں کے لیے چائے اور دیگر لوازمات لیے باہر آئی تو وہ شبانہ سے مخاطب ہوئیں۔ ثوبیہ اب ٹرے تپائی پر رکھ کر چائے ان کو پیش کرنے ہی والی تھی کہ وہ گویا ہوئیں۔

"شبانہ! ثوبیہ کے امتحان ہونے والے ہیں اسی لیے میں نے اور باقی گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچی پہلے اپنے امتحان دے لے پھر تو ساری عمر اس نے گھر ہی سنبھالنا ہے۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

ہارون نظر جھکا کر زیرِ لب دھیمی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔ راشدہ خالہ کے منہ سے یہ بیان سنتے ہی ثوبیہ کی بے ساختہ نگاہیں ہارون کی جانب اٹھ گئیں۔ ہارون کی نظروں میں اس کے لیے پیار اور مان تھا۔ ثوبیہ کو لگا اس کا دل جیسے ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ وہ جلدی سے چائے کی پیالیاں انہیں تھما کر جانے ہی لگی تھی کہ خالہ نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ وہ بے تحاشہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

دو دن پہلے ثوبیہ کو لگا تھا کہ اس نے کسی کی آہٹ سنی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ ہارون ہو گا اس نے شاید اس کی اور شبانہ کی باتیں سن لی تھیں۔

لمبا، سانولا مناسب سے نین نقش والا ہارون جسے ثوبیہ نے کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا اور آج یوں اچانک ثوبیہ کو لگا وہ تو پورے طمطراق کے ساتھ دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گیا ہے۔

ثوبیہ کے چہرے پر بھی خوشی اور محبت کے رنگ کھلے ہوئے تھے جو آج سے پہلے ہارون نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اس دن ہارون اپنی خالہ سے پوچھنے آیا تھا کہ کیا ثوبیہ کو اس سے شادی پر کوئی اعتراض ہے؟ اس نے ان دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں۔ کیا مانگا تھا ثوبیہ نے محض چند دن اور؟ ہارون نے سوچا۔ وہ ثوبیہ کو اسی لیے تو دل و جان سے پسند کرتا تھا کہ وہ یکسر مختلف و سنجیدہ اطوار کی لڑکی تھی۔

وہ خود ان پڑھ تھا لیکن اسے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ تھا اور قدر بھی...... اس نے فیصلہ کیا کہ ثوبیہ کی خواہش کا احترام کرے گا۔ اس نے اپنی ماں کو دو ٹوک کہا کہ وہ ثوبیہ کے امتحانوں کے بعد ہی شادی کی تاریخ مقرر کریں تا کہ وہ تسلی کے ساتھ امتحان دے سکے...... اور وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھا۔

ثوبیہ نے بھی جان لیا تھا کہ ہارون ایک ذہنی وسعت رکھنے والا بُردبار شخص ہے۔ اپنے گھٹن زدہ ماحول میں ہارون جیسی سوچ والا شریک سفر کا ملنا کسی نعمت سے کم نہیں تھا، اچانک ہی اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔

ہارون کا فیصلہ کتنا درست تھا یہ ثوبیہ کی بار بار اس کی جانب اٹھتی تشکر بھری نگاہوں سے صاف عیاں تھا تو ثوبیہ محض اپنی تعلیم کے ادھورے رہ جانے کے خیال سے افسردہ اور ناخوش تھی، شادی پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا یہ سوچ کر ہی ہارون کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

ہارون کی بے قراری اب مزید دو آتشہ ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ دن کی قربانی دے کر ہارون نے زندگی بھر کے لیے ثوبیہ کا دل جیت لیا تھا۔

ہارون تو پہلے بھی ثوبیہ کی قدر کرتا تھا۔ اب ثوبیہ کو بھی ادراک ہو چکا تھا کہ انسان کا فلسفہ زندگی مثبت ہو تو کسی چیز کی کمی راستے کی رکاوٹ نہیں بنتی، ہارون اسکول کالج کا ڈگری یافتہ نہ سہی، عملی میدان میں خالص سند یافتہ تھا ایسی سند جو کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی بلکہ زندگی اور تجربہ عطا کرتا ہے۔

☆☆

راشدہ رفعت

چھوٹی چھوٹی باتیں

کاموں کی تقسیم بظاہر منصفانہ تھی۔ دوپہر کو کھانا آئمہ بناتی تھی تو برتن شاہانہ بھابھی دھوتی تھیں۔ شام کو باری بدل جاتی تھی۔ شاہانہ بھابھی کے ذمے کھانا بنانا ہوتا تو برتن دھونے کی ڈیوٹی آئمہ کی ہوتی۔

آئمہ کی طبیعت میں مروّت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب کبھی شاہانہ بھابھی کی طبیعت ناساز ہوتی یا بھی کاموں کا اضافی بوجھ آن پڑتا تو وہ بڑھ چڑھ کر ان کی مدد کرتی مگر اس خلوص کا مظاہرہ کبھی شاہانہ بھابھی کی جانب سے نہ کیا جاتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا شام کو اس کے ماموں سسر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملنے آنکلے، ساس اتنے عرصے بعد بھائی، بھاوج کی آمد پر اتنی خوش ہوئیں کہ فوراً بہوؤں کو رات کا پُرتکلف کھانا تیار کرنے کا کہہ دیا۔

اگر یہ مہمان دوپہر کو آتے تو کھانے کا سارا اہتمام آئمہ کو اکیلے ہی کرنا پڑتا کیونکہ شاہانہ بھابھی تو اپنی باری کے مطابق کھانے کے بعد کچن سمیٹنے اور برتن دھونے ہی کچن میں تشریف لاتیں مگر آئمہ کی بامروّت طبیعت کو گوارا نہ ہوا کہ وہ اس اچانک، سر پر پڑنے والی دعوت کا اہتمام کرنے کی ساری ذمہ داری شاہانہ بھابھی کو سونپ دے، اس نے ان کا برابر کا ہاتھ بٹایا تھا حالانکہ آج اس کی کمر میں بھی اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد مہمان رخصت ہوئے تو وہ برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزما ہونے پھر سے کچن میں گھس گئی۔ توقع کے عین مطابق شاہانہ بھابھی نے اپنی ڈیوٹی بتانے کے بعد کچن میں جھانکا تک نہیں۔

آئمہ نے کچن سمیٹ کر سارے برتن دھوئے۔ چائے کی کیتلی میں ایک کپ چائے بچی تھی جو اس کی تھی، وہ سب کاموں سے فراغت کے بعد گرم چائے کا کپ اپنے کمرے میں لے جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا پین کلر لینے کے بعد بستر میں بیٹھ کر سکون سے چائے پیے گی۔ جس وقت چائے گرم کر کے کپ میں ڈالنے کے بعد اس نے جھٹ پٹ کیتلی دھو کر کچن سے نکلنا چاہا۔

شاہانہ بھابھی تین چار پلیٹیں لیے کچن میں داخل ہوئیں اُن کے بچوں نے کھانا بیڈروم میں ہی کھایا اور یہ وہ ہی برتن تھے۔ آئمہ کو گمان ہوا کہ شاہانہ بھابھی اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ دیکھ کر یہ چند برتن خود دھولیں گی، لیکن وہ بنا کچھ کہے پلیٹیں سنک میں ڈال کر کچن سے چلی گئیں۔

بے مروتی کے اس مظاہرے پر آئمہ ششدر ہی تو رہ گئی، انہوں نے یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ پوری شام ان کے ساتھ برابر لگی ہے اور برتنوں کا اتنا بڑا ڈھیر اس نے اکیلے ہی دھویا ہے ٹھیک ہے اس نے یہ توقع نہ کی تھی کہ اس کی مدد کے بدلے، شاہانہ بھابھی اس کے ساتھ برتن دھلوائیں گی لیکن ان کا کیا جاتا اگر وہ چند پلیٹیں خود دھولیتیں۔

ایک بار تو آئمہ کا جی چاہا کہ وہ یہ پلیٹیں سنک میں ہی پڑی رہنے دے اور کچن کی لائٹ بند کر کے اپنے کمرے کی راہ لے لیکن صبح سب سے پہلے کچن



میں داخل ہونے والی ہستی اس کی ساس ہوتی تھیں۔
وہ فجر پڑھ کرا پنی چائے بنانے کچن میں آتیں اور سنک میں پڑا ایک بھی ان دھلا برتن انہیں سخت کھلتا تھا تو کتیں دونوں بہوؤں کو تھیں مگر شاہانہ بھابھی اطمینان سے کندھے اچکا کر باور کر دیتیں کہ رات کے برتن دھونا آئمہ کی ذمہ داری ہے۔
اب تو شاہانہ بھابھی کی ان عادتوں کو جھیلتے ایک عرصہ ہو گیا تھا لیکن آئمہ ہر بار ایسی کسی بھی بات پر پہروں کڑھتی تھی۔ برتن دھو کر اس نے نیم گرم چائے وہیں کھڑے کھڑے پی لی اور پھر وہ کپ بھی دھو کر رکھ دیا۔
کمر درد سے زیادہ شاہانہ بھابھی کی بے مروت طبیعت نے اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ بیڈ روم میں آ کر اس نے اویس کے سامنے ان کے مزاج کا دکھڑا رویا تھا۔
اویس نے ایک منٹ کے لیے تو اس کی بات توجہ سے سن لی لیکن بات جب ذرا طویل ہوئی اور اس نے دو دن پرانی کسی بات کا حوالہ بھی شامل کرنا چاہا تو وہ بور ہو گیا۔
''ارے چھوڑو یار، رات گئی بات گئی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنا چھوڑ دو۔ بلاوجہ موڈ خراب کرتی ہو۔'' وہ رسانیت سے بولا۔
''میرا موڈ خراب کرنا آپ کو بلاوجہ لگتا ہے۔''
آئمہ نے دکھ بھرے لہجے میں دریافت کیا۔
''میں کچھ اور کہوں گا تو تم ہائنڈ کر جاؤ گی۔ یہ تم عورتوں کا عمومی مزاج ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے کرتے ایک طویل لسٹ بنا لیتی ہو پھر ان ہی باتوں کو سوچ سوچ کر کڑھتی ہو اور اپنا خون جلاتی ہو۔ ہم مردوں کا معاملہ مختلف ہے، ہم ان معمولی باتوں کو درخور اعتنا ہی نہیں جانتے۔''
وہ لاپروا سے انداز میں گویا ہوا۔ آئمہ نے مزید بحث نہ کی حالانکہ اس کا دل دکھا ہوا تھا، کیا جاتا اگر اویس اس وقت اس کی ذہنی کیفیت سمجھ کر معمولی سی دل جوئی ہی کر دیتا۔ اس نے کس مزے سے اسے عام عورتوں کی فہرست میں کھڑا کر دیا تھا، اگر وہ عام عورتوں کی طرح معمولی باتوں کو جواز بنا کر تعلق خراب کرنے والوں میں سے ہوتی تو ہر بار یوں، خود غرضی کے جواب میں خلوص کا مظاہرہ نہ پیش کرتی۔
جس طرح شاہانہ بھابھی اپنی فطرت کی اسیر تھیں، اسی طرح وہ بھی فطرتاً بروں کے ساتھ اچھائی کرنے پر مجبور تھی۔ زیادہ دیر کینہ بھی دل میں نہ رکھ پاتی۔
دکھ کی وقتی کیفیت سے جلد ہی باہر نکل آتی تھی وہ جانتی تھی کہ اگلے دن، وہ سب بھلا کر دوستانہ گرم جوشی سے شاہانہ بھابھی کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہوگی لیکن آج کے دن وہ اپنے شریک حیات کے لبوں سے حوصلہ افزائی کے دو بول سننے کی متمنی تھی۔
اگر اویس اسے شاہانہ بھابھی کے حصے کا کام کرنے پر، سراہ دیتا یا کم از کم ان کی بے مروتی پر اس

کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تو وہ اس وقت اتنی پُرملال تو نہ ہوتی۔ عام عورتوں والا طعنہ اسے بری طرح ہرٹ کرگیا تھا۔ لیکن اس وقت بحث کے بجائے اس نے پین کلر لے کر سونے کو ترجیح دی تھی۔

☆☆☆

روز وشب اپنی رفتار سے گزرتے جا رہے تھے۔ چند ماہ پہلے اویس کا دوسرے شہر ٹرانسفر ہوا تھا اور آئمہ کا بھرے پُرے گھر میں بھی جی نہ لگتا۔ وہ سسرال میں ہی رہ رہی تھی۔ پندرہ دن بعد اویس گھر آتا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے شہر ٹرانسفر کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا امید واثق تھی کہ یہ کوشش، کامیابی سے ہم کنار ہوجائے گی لیکن فی الحال وہ سب گھر والوں سے دور وہیں رہنے پر مجبور تھا۔ جس بلڈنگ میں وہ رہ رہا تھا وہاں اکثر چھڑے ہی رہائش پذیر تھے۔

اویس نے بھی اپنے دوسرے دو کولیگز کے ساتھ مل کر چھوٹا سا پورشن کرائے پر لیا تھا۔ نجم اور حمید اس کی کمپنی میں کام کرتے تھے انہوں نے ہی اویس کو ساتھ رہنے کی آفر کی تھی کرایہ مناسب تھا، جگہ بھی آفس سے زیادہ دور نہ تھی سو اویس نے ان کی پیش کش بخوشی قبول کرلی تھی۔

اب اسے ان کے ساتھ رہتے رہتے تین مہینے ہونے کو آئے تھے۔ لیکن ہر گزرتا دن اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز کرتا جا رہا تھا۔ وہ بہت نفاست پسند طبیعت کا مالک تھا۔ یہ نفاست پسندی اسے ماں سے ورثے میں ملی تھی پھر شادی کے بعد بیوی بھی ہم مزاج ملی۔

اویس کو کبھی بھی آئمہ کو کچھ بتانے سمجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اسے اپنا کمرہ کبھی بے ترتیب نہ ملا۔ ٹاول اسٹینڈ پر ہمیشہ دھلا ہوا تولیہ موجود ہوتا۔ بیڈ شیٹ پر کوئی شکن موجود نہ ہوتی۔ فرنیچر پر گرد کا کوئی ذرہ ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا۔

اس صاف ستھرے ماحول کے عادی اویس صاحب کو جب دو بے ڈھنگے بندوں کے ساتھ، ایک کمرہ شیئر کرنا پڑتا تو اس کے صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن ہوگئے۔ تینوں کو ایک واش روم شیئر کرنا پڑ رہا تھا۔

اویس ان دونوں کے جاگنے سے پہلے نہا دھو کر فارغ ہوجاتا۔ اب آفس جانے سے پہلے فقط تیار ہوکر نہ صرف ناشتا کرنا ہوتا تھا بلکہ ناشتا تیار بھی کرنا پڑتا تھا۔ بیوی کے ہاتھ کا بنا گرم گرم لذیذ ناشتا تو اب پندرہ دن بعد ہی ملتا تھا، آملیٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کے توس سینک کر کام چلانا پڑتا۔

حمید ناشتا آفس جاکر کرتا جبکہ نجم واش روم جاتے جاتے، اویس کو ہانک لگا دیتا کہ وہ چار توس اس کے بھی سینک کر ایک انڈا فرائی کردے۔

شروع شروع میں تو اویس کو اس کا ناشتا بنانا نہ کھلتا تھا لیکن جب، اس نے مستقل ہی یہ روٹین اپنالی تو اویس کا میٹر بھی گھومنے لگا۔ گویا اس نے اسے اپنا نوکر ہی سمجھ لیا تھا، پھر محترم صفائی ستھرائی کے معاملے میں بھی رج کر بدسلیقہ تھے۔ واش روم سلیپر لے کر کچن تک میں چلا آتا۔ اپنی بیڈ شیٹ جھاڑنے یا کمبل تہ کرنے کا تکلف نہ کرتا۔ اویس کو بکھرے کمرے سے زیادہ الجھن ہوتی تو اس کا بستر بھی تہ کردیتا اور جس دن نہ کرتا تو نجم ذرا ناراضی بھرے لہجے میں استفسار کرتا۔

"کیا ہوا یار! آج میری چادر نہیں جھاڑی۔ رات مونگ پھلی کھائی تھی، ابھی بھی بیڈ شیٹ پر چھلکے پڑے ہیں۔" اور اس شکوے پر اویس بس اسے دیکھ کر رہ جاتا۔

نجم کی نسبت حمید کی عادتیں خاصی معقول تھیں۔ اگر اویس اس کے حصے کا کوئی کام کرتا تو وہ بھی اویس کو آسانی فراہم کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کرتا۔

حمید کی وجہ سے ہی وہ نجم کو بھی برداشت کرنے پر مجبور تھا ورنہ کبھی کبھار تو دل کرتا کہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر علیحدہ کمرہ لے کر، وہاں شفٹ ہوجائے لیکن پھر سے ٹرانسفر کے امکان ہر گزرتے دن کے ساتھ روشن ہو رہے تھے، سو وہ نجم کو کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اس دن تو حد ہی ہو گئی، رات کا کھانا حمید نے بنایا کہ بازاری کھانے کھا کھا کر تینوں ہی اوب چکے تھے۔

حمید نے کھانا تو لا جواب بنایا لیکن چھوٹے سے کچن میں خوب ابتری پھیل گئی۔ اویس نے کچن سمیٹ کر برتن دھوئے پھر چائے بنانے کا نجم کو کہا۔

"ارے چھوڑ یار! میں اب بستر میں گھس گیا ہوں۔ بستر سے نکلنے کا کوئی موڈ نہیں۔ آجا مونگ پھلیاں کھالے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مجھے چائے کی سخت طلب ہے۔ شرافت سے بستر سے نکل کر چائے بنا اور ہاں پھر کپ اور کیتلی بھی تجھے ہی دھو کر رکھنی ہو گی۔" اویس نے اس کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر تنبیہی باور کروایا۔

"او بھائی! تجھے طلب ہے ناں تو بنا کر پی لے۔ مجھ پر زبردستی کیوں کر رہا ہے۔" وہ مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے بولا۔

اویس نے اسے گھورا، پھر ضبط سے کام لیتا ہوا واپس کچن کی طرف مڑ گیا لیکن آج اس نے فقط دو کپ چائے بنائی اور جب اس نے حمید کو چائے کا کپ تھمایا تو نجم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"میرا کپ؟"

"تو نے کب کہا تھا کہ تیرا موڈ ہے؟" اویس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا بظاہر ہنس کر بولا تھا۔

"یار، دو کپ تو بنا ہی رہا تھا تیسرا کپ بنانے میں کوئی اضافی محنت لگتی تھی۔" وہ ذرا خفا ہوتے ہوئے بولا اور اب اویس سے بھی رہا نہ گیا۔

"یار نجم! تم میری اور حمید کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ حمید نے ساری شام لگا کر کھانا بنایا۔ میں نے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈے یخ پانی سے برتن دھوئے تجھ سے صرف چائے بنانے کو کہا تو بھی ہری جھنڈی دکھا دی۔ میں جو روز صبح تیرا ناشتا بناتا ہوں کبھی بدلے میں تو نے میرا چائے کا کپ تک دھو کر دیا؟" اویس نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"دیکھ حمید! دیکھ اپنے جگر کو۔ عورتوں کی طرح کیسے چھوٹی چھوٹی باتوں کا طعنہ مار رہا ہے۔" نجم سدا کا ڈھیٹ، الٹا اویس کو ہی عورتوں کی صف میں کھڑا کر کے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا اور اسی لمحے اویس کو کچھ یاد آیا تھا۔ وہ نجم کی باتوں پر مزید الجھنے یا بحث کرنے کے بجائے خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

سونے سے پہلے وہ حسب معمول آئمہ سے میسجنگ میں مصروف تھا تو ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اس نے سوری کا میسج بھیجا تھا۔

"کس چیز کی سوری ---؟" آئمہ حیران ہوئی۔

"ماضی میں تمہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پر سوار کر لینے کے بہت طعنے دیتا تھا۔ اب خود ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھگت رہا ہوں تو تمہارا درد سمجھ میں آرہا ہے۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا تھا۔

"ارے چھوڑیں ٹینشن کیوں لیتے ہیں۔ نجم ہی تنگ کر رہا ہو گا ناں تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر واپس اپنے گھر آجائیں گے۔"

آئمہ کو اس کی معذرت سے گویا کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ بے چاری شوہر کی پریشانی میں پریشان اسے تسلی دلاسا دینے لگ گئی تھی۔

اویس اس کی محبت پر مسکرایا لو یو کا میسج بھیج کر چیٹ کا اختتام کر دیا۔ آج اسے آئمہ نہ صرف بہت یاد آرہی تھی بلکہ اپنی کامنی سی بیوی کی اس ٹینشن کا بھی بخوبی احساس ہو گیا تھا جس میں وہ شاہانہ بھابھی کی وجہ سے مبتلا ہوتی تھی۔

شاہانہ بھابھی کی فطرت بدلنے کی تو وہ فقط دعا ہی کر سکتا تھا لیکن آج کے دن نے اسے، یہ سبق سکھا دیا تھا کہ بیوی کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنے کا طعنہ دینے کے بجائے وہ اس کی دل جوئی کے لیے دو جملے ضرور بول دے گا۔

دل میں مصمم ارادہ کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆

حمیرا شفیع

ناولٹ

دل کا آنگن سونا ہے

سردی کیا آئی، گھر سے بجلی، پانی اور گیس تینوں ہی غائب ہو گئے۔ بجلی اور پانی کا تو چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بجلی نہیں آتی تو موٹر بھی نہیں چلتی تھی، لہٰذا پانی بھی نہیں آتا تھا مگر گیس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کس وجہ سے روٹھی بیٹھی تھی۔

خیر انہوں نے ناشتہ بنانے کے لیے کچن کی بتی جلائی تو یو پی ایس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس کی بھی بیٹری لو تھی۔ اب موم بتی، لالٹین وغیرہ کا تو زمانہ ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے موبائل کی ٹارچ سے ہی سیلینڈر پر چائے ابلنے رکھ دی۔ پھر توس سینکے، ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سجائے اور پپو کے کمرے کا رخ کیا۔

اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ سامنے کتاب کھلی تھی مگر نظریں خلا میں کہیں گھور رہی تھیں۔

"پپو بیٹا! ناشتہ......؟" انہوں نے پیار سے پکارا، اس نے کوئی ردعمل نہ دیا اور مستقل خلا میں کہیں گھورتا رہا۔

"ہائے اللہ! ساری رات پڑھتا رہا ہے۔ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا۔" انہوں نے دہل کر سوچا۔

سارے خاندان کے لڑکے میٹرک فیل تھے۔ صرف وہی فزکس میں بی ایس کر رہا تھا۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے منہ میں آیات پڑھ کر اس پر لمبی پھونک ماری تو وہ چونکا۔

"بچے! ناشتہ کر لو۔" انہوں نے ٹرے اس کے سامنے دھری۔

"ماموں جان! دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں کیا بات ہے......؟" انہوں نے تشویش سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا پریشان ہو......؟"

اس نے تربوز جتنا بڑا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"یار! پریشان نہ ہوا کرو۔ اچھی تیاری ہے تمہاری۔ ان شاء اللہ پرچے بھی اچھے ہو جائیں گے۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔ پپو تھوڑا کنفیوز سا اسٹوڈنٹ تھا۔ اچھی تیاری کے باوجود خوامخواہ بوکھلایا ہوا سا رہتا تھا۔

"نہیں ماموں! امتحان کی پریشانی نہیں ہے۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو پھر کیا ہے؟" اب کے انہوں نے ذرا گہری نظر اس پر ڈالی وہ گھبرایا ہوا سا اپنی انگلیاں مروڑے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا!" انہوں نے پیار سے پچکارا۔

"ماموں جان ...... ماموں وہ ذرا ہچکچایا وہ سامنے والوں کی لڑکی ہے نا......"

"کیا لڑکی......!" وہ اس کے منہ سے غیر متوقع طور پر لڑکی کا لفظ سن کر اچھل پڑے۔

"جی ماموں جان......وہ سامنے والوں کی لڑکی۔"

"کم بخت شرم نہیں آتی۔ محلے کی بچیوں کو تاڑتے ہو......!" آناً فاناً ان کے تیور بدل گئے، لہجہ خوں خوار ہو گیا۔

"ماموں جان......وہ لڑکی۔"



"بس!" ان کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے سامنے پڑی وزنی کتاب اس کے سر پر دے ماری۔

"بے حیا! یہ تربیت کی ہے میں نے تمہاری۔ اگر ہمارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم دوسری عورتوں کی عزت نہ کرو۔ ڈوب مرو۔ محلے کی بچی پر نظر رکھتے ہو۔"

انہوں نے کتاب اٹھا کر دوسرا وار کرنا چاہا۔ پپو بے چارا بدک کر پیچھے ہٹا۔ پہلی ضرب سے ہی اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"خدا کے واسطے ماموں جان! پہلے میری پوری بات تو سن لیں۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں تاڑا اور نہ چھیڑا۔ وہ تو ایک دن چھت پر دھوپ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی چھت پر تھی۔ مجھے دیکھ کر اونچا اونچا گنگنانے لگی۔ میں نے نظر انداز کر دیا تو ایک کاغذ گولی بنا کر اچھالا۔ میں نیچے اتر آیا۔ پھر راستے میں بھی آتے جاتے فقرے کسنے لگی۔

ایک دن گلی کی نکڑ پر رشید کریانے والے کے پاس موبائل میں بیلنس ڈلوا رہا تھا۔ وہ بھی سودا سلف لینے آئی تھی شاید میرا نمبر نوٹ کر لیا۔ اب تو اتر سے میسج کرتی ہے۔ میں نے نمبر بلاک کیا تو دوسرے نمبر سے بھیجنے لگی۔ یہ دیکھ لیں۔"

اس نے روتے ہوئے اپنا موبائل ان کے سامنے پٹخا۔

حیرت سے گنگ انہوں نے موبائل کھولا لاتعداد میسجز کی بھرمار تھی۔ انتہائی بے ہودہ عامیانہ اشعار۔ دیدہ دلیری کی حد تھی کہ اس شتر بے مہار لڑکی نے ڈنکے کی چوٹ پر اپنا نام بھی واضح "مہ پارہ" لکھ رکھا تھا۔

"یہ تو سیدھا سیدھا ہراسمنٹ کا کیس بنتا ہے۔" وہ بڑبڑائے۔

پپو بیچارہ چپ چاپ اپنا سر سہلاتا رہا۔

"اس لیے بچہ روز بروز گم صم سا رہنے لگا تھا۔ ہائے میرے معصوم بچے کو وہ کب سے ہراساں کر رہی تھی۔ نانہجار، بد بخت لڑکی۔"

انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ جھٹ گلے لگایا۔ بال سنوارے جو کتاب کی ضرب پڑنے سے منتشر ہو چکے تھے۔

"دیکھنا! میں اس کے خلاف ہراسمنٹ کی شکایت درج کراؤں گا۔" انہوں نے پپو کو تسلی اور تشفی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر ماموں جان! ایسی شکایت تو عام طور پر لڑکیوں اور عورتوں کی طرف سے مردوں کے خلاف ہوتی ہے۔ ایک لڑکے کی طرف سے لڑکی کے خلاف بھلا کون یقین کرے گا۔"

پپو نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اس لڑکی سے واضح خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر انہیں اس پر مزید ترس آیا۔

"تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود دیکھ لوں گا۔" انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

☆☆☆

کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ معاملہ خود دیکھ لیں گے۔ مگر جب تنہائی میں بیٹھ کر غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ ہرگز بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ بچی کا معاملہ تھا۔ محلے میں کسی سے بھی اس نوعیت کا معاملہ ڈسکس کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی چند ماہ پہلے ہی کرائے کے مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ کوئی جان پہچان بھی نہیں تھی۔ اب ڈائریکٹ ان کا دروازہ بجا کر شکایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ کون سا پڑوسیوں کے دروازے کے سامنے کوڑا پھینکنے جیسا معاملہ تھا۔ اس بات پر وہ الٹا ان کے گلے بھی پڑ سکتے تھے۔

وہ شریف آدمی تھے اور شریف آدمی کو اپنی عزت بڑی پیاری ہوتی ہے۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ایک دوپہر پپو بہت گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ تندور والے سے روٹیاں اور دال لینے گیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

"ماموں جان! جب میں واپس آ رہا تھا تو وہ

بھی اپنے گھر سے نکل رہی تھی۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جب میں قریب آیا تو مجھے زور سے کہنی مار کر ہنستے ہوئے گزر گئی۔"

وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ مارے غصے کے ماموں جان کا منہ سرخ ہو گیا۔ اب تو اس دیدہ ہوائی کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا پڑے گا۔ آخر کب تک ان کا معصوم بچہ یہ سب سہے گا۔

☆☆☆

ایک شام جی کڑا کر کے انہوں نے سامنے والوں کا دروازہ بجایا۔

کافی دیر بعد تقریباً ان کی ہم عمر ایک — عورت نے دروازہ کھولا۔

"جی فرمایئے۔" اس نے نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

"وہ جی دراصل میرا نام احسن ہے۔ میں آپ کے یہ بالکل سامنے والے گھر سے آیا ہوں۔ آپ کسی مرد کو بھیجیں۔ مجھے اہم بات کرنی ہے۔" انہوں نے بھی مہذب الفاظ میں مدعا بیان کیا۔

"وہ جی گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ مجھ سے ہی بات کر سکتے ہیں۔" وہ عورت نرمی سے بولی۔

"دیکھیے خاتون! معاملہ انتہائی حساس نوعیت کا ہے۔ میں یوں گلی میں کھڑے کھڑے بات نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو میں بیٹھک کھولتی ہوں۔ آپ تشریف لے آئیں۔"

وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عورت نے انہیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ان سے خاصے فاصلے پر موجود ایک پلنگ پر ٹک گئیں۔

"جی فرمایئے۔" وہ ہمہ تن گوش تھیں۔

"خاتون! آپ غالباً مہ پارہ بیٹی کی والدہ ہیں۔" انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

اپنی بیٹی کا نام ایک اجنبی مرد کے منہ سے سن کر وہ خاتون، چونک گئیں مگر پھر جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"محترمہ! آپ میری بات نہایت صبر اور برداشت سے سنیں۔ بخدا میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کروں گا۔ میں اپنے بھانجے پپو کے ہمراہ اس محلے میں برسوں سے مقیم ہوں۔ میں اپنی تعریف تو نہیں کرتا مگر آپ اہل محلہ سے میرے اور میرے بھانجے کے بارے میں تحقیق کر سکتی ہیں۔ ایک زمانہ ہماری شرافت کا گواہ ہے۔ ہمارے خاندان میں عورتوں اور بچیوں کی عزت کرنا سختی سے سکھایا جاتا ہے۔ پپو یتیم بچہ ہے۔ میں نے ہی اسے پالا پوسا ہے۔ اب وہ ماشاءاللہ بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے۔

چند روز قبل اس نے مجھ سے ایک عجیب سی شکایت کی۔ اسے آپ کی بچی مہ پارہ سے مسئلہ ہے۔ پہلے تو آتے جاتے چھیڑتی تھی۔ اب تو نوبت میسج تک آ چکی ہے۔ میں یہ بچے کا فون لایا ہوں۔ آپ چیک کر سکتی ہیں۔" انہوں نے موبائل ان کی جانب بڑھاتے ہوئے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔

بات سن کر خاتون پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر ان کے خدشے کے برخلاف نہ تو بھڑکیں اور نہ ہی انہیں ماں، بہن کے طعنے دیئے۔ چپ چاپ موبائل ہاتھ میں لے کر میسج پڑھنے شروع کیے۔ جوں جوں پڑھتی گئیں۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا گیا۔ مگر کمال ضبط سے انہوں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔

"دیکھیے محترمہ! اگر معاملہ دو طرفہ ہوتا تو میں بچی کی شکایت کے بجائے اس کا رشتہ مانگنے آتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ پپو بے حد معصوم اور سیدھا بچہ ہے۔ فی الحال اس کی توجہ کا مرکز اس کی تعلیم ہے۔ بچے پر اعتماد کے باوجود میں نے اپنے طور پر بھی اس کا موبائل چیک کیا ہے۔ اس میں سے کچھ نہیں نکلا۔ میں یہ اس لیے بھی ساتھ لایا ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو اس کا ڈیٹا نکلوا کر مزید تحقیق کر سکتی ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ احسن صاحب!" وہ موبائل سے سر اٹھائے بغیر شرم سار سے لہجے میں بولیں۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ میری بچی کی وجہ

سے آپ کو اور آپ کے بھانجے کو ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑی۔"

بات کرتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا پھر وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔ احسن صاحب تو بدحواس سے ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ خاتون کو کیسے چپ کروائیں۔

"دیکھیں محترمہ! میں نے بتایا ہے کہ پپو ایک نہایت شریف بچہ ہے۔" بے ساختہ پھر وہی جملہ ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کی شرافت کی یہی دلیل کافی ہے کہ اس نے فائدہ اٹھانے کے بجائے آپ سے شکایت کی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"احسن صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مہ پارہ فقط پانچ سال کی تھی۔ جب میں بیوہ ہوئی۔ ساس سسر زندہ تھے۔ انہوں نے کفالت کی۔ مگر جب وہ وفات پا گئے تو آبائی گھر دیوروں نے بانٹ لیا اور مجھے حصے کے طور پر چند لاکھ تھما کر زبردستی رخصت کر دیا۔ میں ایک کرائے کے گھر میں منتقل ہو گئی اور ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ مہ پارہ ان دنوں کالج جاتی تھی۔ کچی عمر تھی۔ آپ کو معلوم ہے۔ اس عمر میں بچے کتنی جلدی بگڑ جاتے ہیں۔ میں نے جو گھر کرائے پر لیا تھا، اس کے ایک پورشن میں ہم ماں بیٹی رہائش پذیر تھیں اور دوسرے میں مالک مکان۔

عورتوں والا گھر تھا۔ مرد کوئی تھا نہیں۔ اسی واسطے میں نے وہ گھر لیا تھا کہ کسی بھی مرد کی غیر موجودگی میں میری بچی زیادہ محفوظ رہے گی۔ مگر یہ میری غلطی تھی۔ عورت ہو یا مرد ماحول تو دونوں کے کردار سے بنتا ہے۔ مالک مکان عورتیں بہت بے باک اور آزاد خیال تھیں۔ میں سارا دن تو فیکٹری میں ہوتی تھی۔ مجھے زیادہ اندازہ نہ ہو سکا اور میری معصوم بچی پر ان کا رنگ چڑھتا گیا۔ بلاوجہ بننا سنورنا، بے ہودہ گانے سننا اور نامناسب لباس زیب تن کرنا۔ میں تو روزی روٹی کے چکر میں الجھی رہی۔ جب احساس ہوا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً گھر بدل لیا۔ اب کوشش تو کر رہی ہوں۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ برائی کا رنگ چھٹتے چھٹتے بھی دیر لگتی ہے۔ میں ایک بار پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔"

وہ ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھنے لگیں اور وہ بڑے بھاری دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔

☆☆☆

احسن صاحب کے جانے کے بعد، وہ غصے سے کھولتی ہوئی مہ پارہ کے کمرے میں گئیں مگر بستر خالی تھا۔

اوپر جاتی سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ تن فن کرتی چھت پر پہنچیں۔ سامنے چھوٹا سا ڈربہ نما کمرہ تھا۔ اندر مہ پارہ صاحبہ دروازے کی جانب پشت کیے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے غالباً کسی گانے کی دھن پر تھرک رہی تھی۔

ان کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا۔ پہلے بھی اس کی حرکتوں نے انہیں عاجز کر رکھا تھا۔ پیار سے ڈانٹ ڈپٹ کر ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا تھا مگر اب لگتا تھا کہ گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکلتا تھا۔

انہوں نے چپل پاؤں سے اتاری اور دھنا دھن اس کی نازک کمر پر برسانی شروع کر دی۔

"کم بخت، بے حیا...... ڈوب مرو۔"

مہ پارہ اس ناگہانی آفت پر بری طرح سے اچھل پڑی۔ کرنٹ کھا کر جو مڑی تو سامنے ماں خطرناک تیوروں سے، ہاتھ میں چپل تھامے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرا چھپایا جو کہ ہلکے پھلکے میک اپ سے مزین تھا۔

"اماں...... کیا ہوا ہے؟"

اس معصوم سوال پر وہ مزید بھڑک گئیں۔ رکھ کر دو چپلیں مزید جڑیں۔

"کم بخت ...... پوچھتی ہے کیا ہوا ہے۔ وہ سامنے والے پپو کا باپ آیا تھا تمہاری شکایت لے کر۔ ان کے بچے کو چھیڑتی ہو تم۔ شرم نہیں آتی اس قسم

کی شکایت آتی ہو گی بھلا کسی لڑکی کی۔ لوگ لڑکوں کی شکایت کرتے ہیں۔ اور تم......"

آگے ان کا سانس پھول گیا۔ مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ لمبے لمبے سانس بھرنے لگیں۔

"ہیں پپو نے میری شکایت کی۔" اس سے تو یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اتنی جرات ہے بھلا اس میں!"

"کتنا معصوم اور سیدھا سادہ سا دکھتا ہے۔"

"اب کیوں چپ ہے؟ بتا! کیوں چھیڑتی ہے تو ان کے بچے کو۔ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے تیرے۔ تیرے پچھنوں کی وجہ سے تو محلہ بدلا ہے میں نے۔ اب یہاں بھی وہی چال چلن ہے تیرا۔ وہ تو شریف لوگ ہیں۔ باپ ہے بے چارا سیدھا میرے پاس شکایت لے کر آیا۔ اگر محلے میں پنچایت کرتا تو ہم ماں بیٹی کو مالک مکان فوراً نکال دیتا۔ کم بخت میرے سفید بالوں کا ہی کچھ خیال کر لے۔"

ان کا غصہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا جبکہ مہ پارہ مجرم ہوتے ہوئے چپ سادھے کھڑی تھی۔ شکایت بالکل درست تھی۔ وہ بھلا اپنی صفائی میں کیا کہتی ٹوٹ ٹوٹ کر فقط ایک ہی جملہ اس کے منہ سے نکلا۔

اماں!

مجھے پپو بہت اچھا لگتا ہے۔" اس کے اس معصومانہ اعتراف پر وہ جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

آج پھر بلا کی سردی تھی۔ پپو پڑھائی میں جتا ہوا تھا۔ ماموں جان دوپہر کے کھانے کے لیے گرما گرم سموسے اور جلیبیاں لے آئے۔

"مجھ سے نہیں ہوتی اتنی سردی میں ہانڈی روٹی۔" انہوں نے لفافے سامنے پڑے میز پر دھرے۔

"اف ماموں جان! روز ہی بازار سے کچھ نہ کچھ آ رہا ہے۔ اتنا خرچا ہو رہا ہے۔ ہمارا بجٹ آؤٹ ہو جائے گا۔" پپو فکر مندی سے بولا۔

"آپ مجھ سے کہتے، میں دلیہ یا کھچڑی بنا لیتا۔" پپو بے چارے کو فقط یہی دو ڈشز بنانی آتی تھیں۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ خرچے پانی کی فکر چھوڑو۔ تم بس کھاؤ۔ اتنے دن ہو گئے ہیں تمہاری خالہ نے بھی چکر نہیں لگایا ورنہ وہی دو تین سالن بنا کر فریج میں رکھ جاتیں۔"

وہ بھی اس کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ کر لفافے کھولنے لگے۔ دراصل ان کا مردوں والا گھر تھا۔ اڑوس پڑوس سے تو شاذ و نادر ہی کوئی سوغات آتی۔ سامنے شیخ صاحب رہتے تھے۔ اکثر وہ اپنی بیگم کے ہاتھ کا پکا کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے تھے۔ پھر وہ اپنے بیٹے کے پاس بیرون ملک سدھار گئے اور ان کا گھر مہ پارہ کی ماں نے کرائے پر لے لیا۔

اب جس طرح کی بدمزگی ہوئی تھی وہاں سے تو کچھ آنے کی امید نہیں تھی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ جلیبی منہ میں رکھتے ہوئے بے اختیار اپنی مرحومہ بیوی یاد آ گئی۔ گھر میں ہمہ وقت انواع و اقسام کی میٹھی اشیاء بنا کر رکھتی تھی۔ گاجر کا حلوہ، سوجی کی کھیر، السی کی پنیاں، موتی چور کے لڈو، بیسن کی ٹکیاں، شاہی حلوہ وغیرہ۔

ہائے اللہ! عین جوانی میں ساتھ چھوڑ گئی۔ ان کا تو زندگی سے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ تو ان کی بڑی آپا داغ مفارقت دے گئیں اور ان کا میاں پانچ سالہ پپو کو ان کے سپرد کر کے خود دیار غیر سدھار گیا۔ یوں پپو کی خاطر انہوں نے خود کو سنبھالا۔ یہ ذمہ داری انہوں نے بخوبی تن تنہا نبھائی۔ مشورہ اور نصیحت کرنے والے بے شمار تھے۔

"بس بھائی صاحب! آج کل زمانہ خراب ہے۔ بچے کو ظالم دنیا سے بچا کر رکھنا۔" اب ان کی اپنی تو کوئی اولاد نہیں تھی۔ بچوں کی تربیت کا کوئی تجربہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہر آئے گئے کی باتوں سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے پپو کو کچھ زیادہ ہی سنبھال کر رکھا۔

وہ خود بھی فطری طور پر شرمیلا اور کم گو بچہ تھا۔

انہوں نے بھی دوستوں میں زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیا۔ نتیجتاً وہ ذرا سیدھا سادا اور دبی ہوئی شخصیت کا مالک بن گیا۔

☆☆☆

پانی، بجلی اور گیس آئیں یا نہ آئیں مگر ان کا بل ضرور آتا ہے۔ اور آخری ڈیٹ ہمیشہ چن کر وہی رکھی جاتی ہے جب انسان نے دوسرے بھی بے شمار ضروری کام نپٹانے ہوتے ہیں۔

اس دن بھی گیس کے بل کی آخری تاریخ تھی۔ پپو تو امتحانات کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ وہ پہلے جا کر گھر کا سودا سلف لائے۔ پھر بل جمع کرانے بینک پہنچے۔ عورتوں اور مردوں کی الگ الگ قطاریں بنی تھیں۔ مردوں کی قطار عورتوں کی قطار کی نسبت چھوٹی تھی۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

پیچھے کھڑے شخص کی بات سننے کے لیے سر گھمایا تو عورتوں کی قطار کے، بالکل آخر میں ہاتھ میں بل تھامے ماہ پارہ کی ماں نظر آئیں۔

اب جتنی دور وہ کھڑی تھیں۔ اس حساب سے تو ان کی باری شام تک ہی شاید آپاتی اور پھر ہو سکتا ہے تب تک بینک کا وقت ہی ختم ہو جاتا۔ ازراہ ہمدردی وہ پیچھے والے شخص کو اپنی جگہ رکھنے کا کہہ کر ان کے پاس پہنچے۔

"محترمہ! بل مجھے دے دیں۔ میں اپنے والے کے ساتھ آپ کا بھی جمع کروا دیتا ہوں۔" وہ اپنے دھیان میں کھڑی تھیں۔ ان کی آواز پر چونکیں۔ ان کے تھکے ہارے جسم و جان کو وہ آفر بھلی لگی۔ انہوں نے "شکریہ" کہہ کر انہیں بل تھما دیا۔ وہ بل لے کر واپس اپنی جگہ آ گئے اور وہ انہیں ممنون نظروں سے دیکھتی بینک سے باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

آج بہت دن بعد سورج نے اپنا مکھڑا شریف دکھایا تھا۔ اس کی نرم گرم کرنیں حرارت بخش رہی تھیں۔ نیچے صحن میں تو دھوپ آتی نہیں تھی۔ پپو کا دل چاہا کہ کتاب اٹھا کر چھت پر چلا جائے۔ پھر ماہ پارہ کا خیال آ گیا۔ اب جب سے ماموں اس کی شکایت کر کے آئے تھے۔ اسے زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کہیں وہ چھت پر جائے تو ماہ پارہ غصے سے اس کا سر ورنہ پھاڑ ڈالے۔ یوں وہ سکڑا سمٹا ساوہیں پڑھتا رہا۔

☆☆☆

بچے کی دیکھ بھال اور تربیت ماں باپ دونوں مل کر کرتے ہیں۔

سنگل پیرنٹ ہونا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ انہیں ماہ پارہ کی ماں کے معمولات دیکھ کر ہو رہا تھا۔ پہلے صبح سویرے بے چاری اپنی نوکری پر جاتیں۔ پھر شام میں گھر کا سودا سلف لاتیں۔ گھر کے نل میں پانی نہیں آتا تو کنستر وغیرہ بھر کر لاتیں۔

ایک آدھ بار تو انہوں نے، راستے میں ہی کنستر ان سے لے کر اپنی موٹر سائیکل پر لاد کر ان کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اسی طرح ایک بار قریبی مارکیٹ سے ٹماٹر پیاز وغیرہ غائب ہو گئے، وہ سبزی والے کے پاس پریشان سی کھڑی تھیں تو وہ سبزی مارکیٹ سے اپنے واسطے ٹماٹر، پیاز خرید کر لائے تو ایک تھیلا ان کے لیے بھی لیتے آئے۔ وہ اکثر تاسف سے سوچتے کہ غریب کی ایک ہی لڑکی تھی وہ بھی اتنی بے لگام اور سرکش۔ پھر وہ خدا کا شکر ادا کرتے کہ اس نے انہیں پپو جیسا فرماں بردار اور سلجھا ہوا بچہ دیا تھا۔ آج تک اڑوس پڑوس یا اسکول کالج سے اس کی کوئی شکایت نہیں آئی تھی۔

لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو کسی طرح خوش نہیں ہوتے۔ پہلے لوگ انہیں ہر وقت یہی باور کرواتے رہتے تھے کہ بچے کو زمانے سے بچا کر رکھنا چاہیے۔ اور جب انہوں نے اسے زمانے سے بچا کر رکھا تھا تو وہی لوگ اس کے سیدھے اور بھول پن کا مذاق اڑاتے تھے۔

☆☆☆

اگلے پیپر میں اکٹھی تین چھٹیاں تھیں۔ کپڑوں کا ڈھیر جمع تھا۔ پپو نے سوچا کہ واشنگ مشین لگالی

جائے۔ ماموں جان نے منع بھی کیا کہ دھوبی سے دھلوا لیتے ہیں۔ مگر پچھلی بار اس نے بڑی گڑبڑ کی تھی۔ تین نئی نکور شرٹ پپو کی اور دو پاجامے ماموں جان کے کسی اور کے کپڑوں کے ساتھ بدل دیئے تھے۔ پھر دھوتا بھی صاف نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے خود ہی دھونے شروع کیے۔

ماموں جان کچن میں آلو والے چاول پکا رہے تھے۔ اس نے کپڑے کھنگال لیے تو اب سکھانے کا مرحلہ دشوار تھا۔ الگنی تو چھت پر تھی۔ وہ جانا تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ اس نے کپڑوں سے بالٹی بھری اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آیا۔

سامنے منڈیر سونی پڑی تھی۔ اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے کپڑے پھیلانے شروع کیے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ پھر نیچے آیا۔ باقی کے کپڑے بھی بالٹی میں ڈالے اور پھر اوپر کا رخ کیا۔ اب کی بار وہ زیادہ پراعتماد تھا۔ یعنی کے شکایت کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ تسلی سے کپڑے پھیلاتا رہا۔ جب آخری پتلون ڈال رہا تھا تو اچانک پیچھے سے گنگنانے کی آواز آئی۔

"دل کا آنگن سونا ہے...... ہائے دل کا آنگن سونا ہے۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس نے بالٹی اٹھائی اور تیزی سے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ سریلی آواز نے آخری سیڑھی تک اس کا تعاقب کیا۔

"دل کا آنگن سونا ہے۔ دل کا آنگن سونا ہے۔"

☆☆☆

وہ گھر میں داخل ہوئے تو سامنے چارپائی پر پپو بیٹھا مزے سے پراٹھا کھا رہا تھا۔ کچن سے بھی ساگ پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔

"ماموں جان! خالہ آئی ہیں۔" اس نے چہک کر بتایا۔

"واہ بھئی واہ!" وہ بھی خوش ہوگئے۔

"وہ مولیوں والے پراٹھے بھی ہمراہ لائی تھیں اور ساگ کا پتیلا چولہے پر چڑھا کر خود اڑوس پڑوس میں گھومنے نکل گئی ہیں۔"

مہینوں بعد تو چکر لگتا تھا۔ میکے کا گھر تھا۔ آس پاس سب ہی گھر پرانے محلے داروں کے تھے۔ بھائی اور بھانجے کے ساتھ ساتھ ان کی خبر گیری بھی کرنا ضروری تھا۔

اب بھی وہ شام ڈھلے لوٹیں تو ماموں خفگی سے بولے۔

"کمال کرتی ہو آپا! اتنی دیر کر دی۔ میں تو ساگ میں چمچہ چلا چلا کر تھک گیا ہوں۔"

"اچھا! میں دیکھ لیتی ہوں۔" انہوں نے سیدھا کچن کا رخ کیا۔ چہرے پر از حد سنجیدگی تھی۔ تاثرات بھی کچھ عجیب سے تھے۔ شاید گھر میں ساس سے لڑ کر آئی تھیں۔ ماموں نے سوچا اور نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ پپو پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ لوٹے تو آپا ان کے کمرے میں بیڈ شیٹ تبدیل کر رہی تھیں۔

"ہاں تو آپا! اور سنائیں۔ کیا حال چال ہے۔"

"میرا حال تو ٹھیک ہے مگر تمہاری چال کچھ خراب لگتی ہے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"کیا ہوا آپا؟ خیریت......؟" انہوں نے ان کے بدلے بدلے تیور دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا۔

"نا، میں یہ پڑوس والوں سے کیسی باتیں سن کر آ رہی ہوں۔" وہ سامنے پلنگ پر ٹک گئیں۔

"ہیں کیسی باتیں......؟" وہ چونکے۔ یک دم ان کے ذہن میں خیال آیا کہ پپو اور مہ پارہ والے معاملے کی کچھ بھنک ان کے کانوں میں پڑ گئی ہوگی۔ جتنی مرضی احتیاط کرو۔ ان محلوں میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"وہ آپا! بچوں کی یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے جب وہ......"

"ارے بچوں کی بات کون کر رہا ہے؟" انہوں نے ترنت ان کی بات کاٹی۔ "میں تو تمہاری بات کر

رہی ہوں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم سامنے والی بیوہ پر ڈورے ڈال رہے ہو۔ ارے میں کہتی ہوں شرم نہیں آتی۔ یہ عمر ہے تمہاری ایسی حرکتیں کرنے کی۔" وہ پھٹ پڑیں۔

"کیا...... میں......" وہ صدمے اور حیرت سے اچھل پڑے۔

"جب رفعت کا انتقال ہوا تو ہم نے تمہیں کتنا سمجھایا کہ اور شادی کرلو۔ تمہاری عمر بھی تھی۔ اچھے اچھے رشتے بھی آ رہے تھے۔ مگر تمہیں تو مرحومہ کی محبت کا بخار چڑھا رہا اور اب جب عمر ڈھل رہی ہے تو یہ گل کھلانے لگے ہو۔"

"خدا کے واسطے چپ کر جائیں آپا! کیا اول فول بولے جا رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ تو بے چاری کی ایک دو بار مدد کیا کر دی میں نے، کم بخت محلے والوں نے تو افسانے ہی بنا لیے۔ خدا کی قسم مجھے تو اس کا نام تک معلوم نہیں ہے۔" وہ روہانسے ہو رہے تھے۔

"عافیہ بیگم نام ہے اس کا۔" انہوں نے طنز سے کہا اور پھر پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئیں۔ وہ اپنا سر تھام کر رہ گئے۔

☆☆☆

وہ تھکی ہاری فیکٹری سے لوٹیں تو گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ انہیں سخت تپ چڑھی۔ انہوں نے ماہ پارہ کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ دروازہ، ہرگز کھلا نہ چھوڑے مگر وہ بدتمیز صحن کے عین بیچوں بیچ بیٹھی کینو کھا رہی تھی۔

فروٹ سے بھرا ایک اور شاپر پاس میز پر دھرا تھا۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کون آیا تھا؟"

"اماں! چاچو اور چاچی آئے تھے۔ وہ لائے ہیں یہ پھل۔" مہ پارہ نے پرجوش آواز میں اطلاع دی۔

"چاچو اور چچی۔" وہ حیران رہ گئیں۔

"ہاں! اتنی مشکل سے گھر ملا انہیں۔ شکوہ کر رہے تھے کہ تمہاری ماں نے تو کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا۔ کسی دن پھر آئیں گے۔"

"کس واسطے رابطہ رکھتی۔ انہوں نے تو حصے کے نام پر کچھ رقم تھما کر گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ آج یوں اچانک کیسے بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کی یاد آ گئی۔" وہ سلگ اٹھیں۔

"اماں! ہر کسی سے بدگمان رہتی ہو۔ چچی تو اتنا پیار کر رہی تھیں کہ ماشاءاللہ سے اپنی ماہ پارہ کتنی خوب صورت نکلی ہے۔" وہ شرما کر بتا رہی تھی۔

"کاش کرتوت بھی خوب صورت ہوتے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

چند روز بعد آپا پھر آن وارد ہوئیں۔

"معذرت چاہتی ہوں بھائی! اس دن میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ گھر جا کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔" وہ سخت شرمندہ ہو رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں! تم عورتیں ہمیشہ سے اتنی جذباتی ہوتی ہو۔ اور کانوں کی کچی بھی۔" انہوں نے بھی فراغ دلی سے معذرت قبول کر لی۔

"مگر بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو!" وہ ایک لحظے کو رکیں اور پھر کچھ جھجک کر کہنے لگیں۔

"دوسری شادی میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس گھر کو کسی عورت کی اشد ضرورت ہے۔"

"ہاں تو میں نے کب کہا ہے کہ گھر کو عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ماشاءاللہ سے اپنا پپو کسی نوکری پر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی شادی کر دیں گے۔" انہوں نے چٹکیوں میں معاملہ نمٹایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ بہو سے کوئی امید نہ رکھنا۔ آج کل تو بہوویں اپنے سگے سسر کی خدمت نہیں کرتیں تم تو پھر ماموں سسر ہو گے۔

میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے پہلے اپنے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اگر تم کہو تو میں بات وات چلا کر دیکھوں؟"

انہوں نے رازداری سے، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا تو ان کے پتنگے لگ گئے۔

''آپا! آپ اپنے سنہری خیالات اپنے پاس رکھیں اور مجھے بخش دیں۔'' انہوں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

☆☆☆

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھیں کہ دیور اور دیورانی کو یوں اچانک، ان ماں بیٹی کی یاد کیسے آ گئی کہ اس کا عقدہ بھی چند روز بعد کھل گیا۔ وہ جس فیکٹری میں نوکری کرتی تھیں وہاں ان کی ایک ساتھی عورت کی بہن ان کے سسرال کے محلے میں رہائش پذیر تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ آج کل وہ لوگ اپنا ایک آبائی پلاٹ، بیچنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ دراصل ان کا وہ پلاٹ بالکل بے کار اور بیابان سی جگہ پر تھا۔ پہلے تو اس کی کوئی مارکیٹ ویلیو ہی نہ تھی۔ پھر قسمت کی بات وہاں تک پکی سڑک بن گئی۔ گیس کی پائپ لائن بھی بچھ گئی۔ بجلی کے لیے کھمبے وغیرہ بھی نصب ہو رہے تھے۔ یوں راتوں رات پلاٹ کے دام بھی چڑھ گئے تھے۔ وہ ان کے مرحوم کے سسر کا نام تھا۔ اب اس میں لازمی مہ پارہ کا حصہ بھی بنتا تھا۔ شاید اسی لالچ میں تعلقات بحال کرنا چاہ رہے تھے۔ اب مکان کے بعد وہ بھی ہتھیانے کے چکروں میں تھے۔

اب ان کی تو اتنی حیثیت نہیں تھی کہ کوئی وکیل وغیرہ کھڑا کرتیں۔ اس لیے انہوں نے معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور اگلی بار جب وہ ملنے آئے تو انہوں نے بھی روکھے پن کا مظاہرہ کیا۔ دیور تو مہ پارہ کو ساتھ لے جانے کی ضد کر رہے تھے اور مہ پارہ نیم رضامند بھی تھی مگر انہوں نے ٹکڑا توڑ جواب دے دیا۔

☆☆☆

جنوری رخصت ہو رہا تھا۔ سردی کی شدت کچھ کم تو ہوئی تھی مگر ابھی بھی دھوپ خاصی دیر سے نکلتی تھی۔ جو جسم و جان کو بڑا سکون بخشتی تھی۔ پپو کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ تھوڑی بے فکری تھی۔ وہ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ ماموں بھی اخبار پڑھ رہے تھے۔

''پپو یار! آج تو میں نے ناشتہ نہیں بنایا۔ کچھ بازار سے لے آؤ۔''

''نہیں ماموں! میں فارغ ہوں۔ کچھ بنا لیتا ہوں۔'' اس نے آفر کی۔ ویسے بھی وہ ماموں کی نسبت کفایت شعار واقع ہوا تھا۔

''اچھا تو پھر چھت پر ہی لے آؤ۔ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر کھائیں گے۔''

وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھے۔ اس نے ہری مرچ اور پیاز والا آملیٹ بنایا۔ توس سینکے، چائے بنائی۔ سلیقے سے ٹرے سیٹ کی اور اوپر چلا آیا۔ اڑتی پڑتی نظر سامنے ڈالی۔ چھت ویران پڑی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس بھرا اور ماموں کے سامنے ٹرے دھری۔

''واہ بھئی! بڑے مزے کا آملیٹ ہے۔ بس مرچیں تیز ہیں۔'' انہوں نے چٹخارہ بھرا۔

''ماموں جان! اتنے دن سے خالہ نے چکر نہیں لگایا۔ وہ آئیں تو ان کے ہاتھ سے بنے پراٹھے کھانے کو ملتے۔''

''اچھا ہوا نہیں آئیں۔ اس کا نہ آنا ہی بہتر ہے۔'' وہ پچھلی بات یاد کر کے سخت بدمزہ ہوتے ہوئے بولے۔ پپو بے چارہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران رہ گیا۔ کہاں تو وہ خالہ کو فون کر کر کے بلاتے تھے۔

اتنے میں نیچے سے فون بجنے کی آواز آئی۔

''لو! میں تو اپنا فون بھی نہیں لایا۔ شاہ جی یاد کر رہے ہوں گے۔''

''ماموں! میں جا کر لے آؤں۔'' اس نے جھٹ آفر کی۔

''نہیں بیٹا! تم تسلی سے ناشتہ کرو۔ میں تو کر ہی چکا ہوں۔ پھر برتن وغیرہ سمیٹ کر نیچے آ جانا۔'' وہ اپنا چشمہ اور اخبار اٹھا کر سیڑھیاں اتر گئے۔

وہ گھونٹ گھونٹ چائے پی رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سامنے نظر پڑی تو منڈیر پر مہ پارہ کا حسین مکھڑا سجا تھا۔ چہرے پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ نظریں چار

ہوئیں تو جھٹ دایاں ہاتھ سلام کے انداز میں ماتھے پر رکھ لیا۔

پپو بے چارا شرم سے کٹ کر رہ گیا۔ چائے گلے میں پھنس سی گئی۔ اتنے میں سیڑھیوں سے کسی اور کا سر نمودار ہوا۔ وہ مہ پارہ کی ماں تھیں۔ وہ ماں کی آمد سے بے خبر، مسلسل ہاتھ ماتھے پر سجائے کھڑی تھی۔ وہ آگ بگولہ اس کے سر پر پہنچیں اور چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ خوف وہراس سے بت بنے پپو نے بامشکل خود کو سنبھالا۔ جیسے تیسے برتن سمیٹے اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

اس دن انہوں نے پھر مہ پارہ کی خوب ٹھکائی لگائی۔ مگر وہ ڈھیٹ خوشی خوشی مار کھاتی رہی۔ ذرا جو شرمندہ ہوئی ہو۔ وہ سمجھ گئیں کہ اب اسے مزید سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسے تو کسی مرد کی سرپرستی چاہیے۔ اور پھر رات کو ہی انہوں نے ایک مشکل فیصلہ کر لیا۔ اسے اس کے چچا کے پاس بھجوانے کا۔

"اپنا سامان پیک کر لو۔ میں نے تمہارے چچا کو فون کر دیا ہے۔ کل وہ تمہیں لینے آئیں گے۔"

"نہیں اماں! میں نہیں جاؤں گی۔" مہ پارہ جو پہلے جانے پر رضامند تھی۔ اب بدک گئی۔ "خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ لالچ میں آ کر لے جا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا لالچ میں ہی سہی ذمہ داری تو اٹھا رہے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں تو لوگ لالچ میں بھی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔" وہ یک دم سنگ دل بن گئیں۔

"پھر آپ بھی میرے ساتھ چلو۔" وہ ٹھنکی۔

"نہیں میرا رشتہ تو ان کے ساتھ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ تمہارے سگے چچا ہیں۔ خیال رکھیں گے۔ میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔"

چلتے سے انہوں نے خود ہی اسے بڑھ کر گلے لگایا تو وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ماں! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"یہ اولاد بھی کیا چیز ہے۔ اپنی غلطیاں دکھائی نہیں دیتیں الٹا بے قصور ماں باپ کو ہی الزام دیتے ہیں۔"

وہ آنسو پونچھتی دروازہ بند کر کے چلی آئیں۔

☆☆☆

چھت بہت گندی ہو رہی تھی۔ کتنے دن سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ پپو چونکہ آج کل فارغ تھا۔ اس لیے ماموں جان نے کہا کہ۔ "آج دھوپ بھی تیز ہے جا کر جھاڑو لگا دو۔"

انکار تو اس کی سرشت میں نہ تھا۔ جھاڑو پکڑ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ پورے تین گھنٹے صفائی کرتا رہا۔ پائپ لگا کر فرش بھی دھو ڈالا۔ آس پاس گہری خاموشی طاری رہی۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے ایک آدھ بار سامنے بھی دیکھ لیا۔ نہ تو کوئی دھانی آنچل لہرایا۔ اور نہ ہی کوئی مدھر گنگناہٹ سنائی دی۔ ویرانی سی ویرانی تھی۔

وہ بھی اتنی دیر تک چھت کے بغیر رہتی نہ تھی۔ وہ دل ہی دل میں کچھ حیران تھا اور تھوڑا پشیمان بھی۔ اسے خود بھی اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے اسے اس کے ہونے سے مسئلہ تھا اور اب نہ ہونے سے تھا۔ اسی گم صم سی حالت میں وہ نیچے اتر آیا۔

چند دن مزید سرکے تو اس نے خود ماموں سے کہا۔ "ماموں جان! میں اوپر والے کمرے کی صفائی کر لوں۔ بھاری بستر بھی پیٹی میں رکھ دیتا ہوں۔"

"ہیں ابھی اس دن تو صفائی کی تھی۔"

"ماموں! کمرے کی تو نہیں کی تھی۔" وہ اوپر آیا۔ پہلے پیٹی سے نکال کر لحاف وغیرہ دھوپ میں ڈالے۔ پھر کمرہ صاف کرنے لگا۔ اتنا کاٹھ کباڑ جمع ہو رہا تھا۔ وہ بھی باہر نکالا۔ اچھا خاصا وقت بیت گیا۔ آج بھی ہنوز خاموشی رہی۔ کہیں وہ لوگ گھر تو چھوڑ کر نہیں چلے گئے۔

نہیں ابھی کل ہی تو اس نے ماہ پارہ کی ماں کو دروازے کا تالا کھولتے دیکھا تھا۔ صبح بھی دودھ والا

دروازہ بجا رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنے خیال کی نفی کر دی۔ وہ اداس اداس سا غم میں جتا رہا۔ کانوں میں دور کہیں گانے کے دو بول رس گھولتے رہے۔

"دل کا آنگن سونا ہے...... دل کا آنگن سونا ہے۔"

☆☆☆

اس بار آپا آئیں اور اپنے ساتھ ڈھیر ساری سوغات بھی لائیں۔ پپو کھل اٹھا جبکہ ماموں جان کا رویہ نارمل رہا۔

"خالہ! اتنا کچھ بنا کر لائیں۔" پپو اشتیاق سے ڈبے کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

"اس میں کیا ہے......؟" ایک ڈبہ الگ سے رکھا تھا۔ اس نے وہ بھی کھولنا چاہا۔

"یہ پڑوس کے لیے تحفہ لائی ہوں۔ تمہارے کام کا نہیں ہے۔" انہوں نے ڈبہ اٹھا کر ایک سائیڈ پر رکھ لیا۔

☆☆☆

آپا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن کے سر پر جب کسی کام کا بھوت سوار ہو جائے تو پھر جب تک وہ انجام نہ دے لیں نچلے نہیں بیٹھتے، یوں تو جب ان کی بھاوج فوت ہوئیں انہوں نے اسی وقت بھائی کی شادی کروانے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ایک تو محبوب بیوی کے غم سے نڈھال، بھائی ہی پتھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے تھے۔

پھر جب انہوں نے پپو کو گود لیا تو شادی مزید مشکل ہو گئی۔ لڑکی والوں کو تو پپو کے وجود پر ہی سخت اعتراض تھا۔ سگی اولاد ہوتی تو شاید کوئی برداشت کر لیتا۔ پھر وہ بھی گھر داری کے جھنجھٹ میں پڑ کر خاموش ہو گئیں۔ ہاں البتہ وہ بھائی اور بھانجے کی خبر گیری سے غافل نہیں رہیں۔

مگر اب انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس گھر کو کسی پختہ عمر کی عورت کی ضرورت ہے۔ ان کی ہڈیوں میں بھی اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ بار بار کھانے پکا پکا کر لے جائیں۔ پھر ان کی ساس بھی احساس دلاتی رہتی تھیں کہ پپو سے پہلے بھائی کا بیاہ رچانا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی رشتہ کروانے والیوں کو بھی بھاری رقم تھما رکھی تھی۔

پچھلی بار، جو وہ بھائی کا سامنے والی عورت سے افسانہ سن کر گئی تھیں تو سچی بات ہے کہ انہیں خود بھی وہ محض افسانہ ہی لگا تھا، مگر کوشش کر لینے میں کیا ہرج تھا۔ اسی مقصد کے واسطے انہوں نے گاجر کے حلوے کا ڈبہ تھاما، چادر درست کی اور سامنے کے گھر میں گھس گئیں۔

کرائے کا چھوٹا سا گھر تھا۔ نفاست اور سلیقہ کونے کونے سے ٹپک رہا تھا۔

عورت بھی بہت ملنسار تھی۔ بڑی محبت سے ملی۔ وہ شدید متاثر ہو کر لوٹیں۔ اب بھائی کو بھی کسی نہ کسی طرح راہ راست پر لانا تھا۔ فی الحال تو انہوں نے گھر آ کر صرف اتنا بتایا۔

"آج میں سامنے والوں کے ہاں گئی تھی۔ نہایت پر خلوص اور ملنسار عورت ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے ماہ پارہ۔ چچا نے اس کی کفالت کا ذمہ لے لیا ہے۔ اب وہی اس کی شادی کریں گے۔ اسی لیے ان ہی کے ساتھ روانہ کر دی ہے۔"

ان کے یہ جملے ماموں تو سر جھکا کر سنتے رہے کوئی ردعمل نہ دیا، جبکہ پاس بیٹھے پپو کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔

☆☆☆

رات کا نجانے کونسا پہر تھا۔ باہر کھٹکا سا ہوا۔ وہ تو پہلے ہی سوئی جاگی کیفیت میں تھیں۔ جب سے ماہ پارہ گئی تھی نیند بھی روٹھ سی گئی تھی۔

اس نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا تھا۔ انہوں نے خود ہی اس کے چچا کے موبائل پر فون کیا تھا تو اس نے ڈھنگ سے بات ہی نہ کی تھی۔ ماں سے اتنی متنفر ہو گئی تھی۔

انہوں نے کروٹ بدل کر دوبارہ سونا چاہا کہ آواز پھر آئی۔ شاید بلی وغیرہ کودی ہے۔ انہوں نے خود کو تسلی دی مگر چند منٹ بعد، باقاعدہ برآمدے میں

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کسی نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ چٹخنی کمزور تھی۔ دو کیل اکھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مرمت کروائیں گی۔ مگر پھر بھول گئیں۔ اب وہ بستر پر بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا اور دو ہٹے کٹے بدمعاش منہ پر نقاب چڑھائے اندر گھس آئے۔ ایک نے بڑھ کر بلب جلا دیا۔ "نکالو رقم کہاں ہے۔" ایک غرایا۔

"مجھ بوڑھی کے پاس کچھ نہیں ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بامشکل بولیں۔

"اب اتنی بوڑھی بھی نہیں ہو تم......" ایک ان کی طرف خباثت سے دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا تو ان کی روح فنا ہو گئی۔

انہوں نے جلدی سے، اپنے میاں کی واحد نشانی کانوں میں پڑے جھمکے اتار کر ان کے سامنے پھینکے۔ وہ پاس پڑا ان کا موبائل اور پرس میں موجود رقم نکال کر چلتے بنے اور وہ عزت بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

☆☆☆

دو دن وہ فیکٹری بھی نہ جا سکیں۔ خوف و ہراس سے بخار چڑھ گیا۔ وہ تو ہمہ وقت مہ پارہ کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ اب انہیں احساس ہوا کہ یہ معاشرہ، نوجوان، ادھیڑ عمر، کم عمر اور بوڑھی ہر قسم کی عورت کے لیے غیر محفوظ ہو چکا ہے۔

اس سے اگلی شام سامنے والے احسن صاحب کی آپا ایک بار پھر چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر ان کو بے حد ڈھارس ہوئی۔ مختصراً واقعہ انہیں بھی بتایا۔ وہ افسوس کرتی رہیں۔ اور ساتھ ساتھ دبے دبے لفظوں میں اپنے بھائی کی شرافت و نجابت، خلوص اور وقار کے گن گاتی رہیں۔ اس سے پہلے بھی آئی تھیں تو اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور ملنساری کا ہی تذکرہ کرتی رہی تھیں۔

وہ کوئی نادان بچی تو نہ تھیں جو اندر خانے ان کا عندیہ نہ جان پاتیں۔ پہلے تو انہوں نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر اب کے وہ گئیں تو ان کے لیے سوچوں کے کئی در وا کر گئیں۔

عمر کے اس حصے میں وہ کتنی تہی دامن تھیں۔ ایک اولاد تھی وہ بھی باغی۔ اب باقی عمر کس کے سہارے کٹنی تھی۔ انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

ایک سال بعد......

چند ماہ پہلے ہی، عافیہ بیگم احسن صاحب سے نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ کر ان کے ہاں منتقل ہو چکی تھیں۔ یہ معرکہ جسے آپا نے سرانجام دیا تھا ان کی مضبوط شخصیت اور مصمم ارادے کا ہی کمال تھا۔ بہر حال جو بھی تھا عافیہ بیگم، اپنے نام کی طرح گھر کے لیے واقعی عافیت ثابت ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی نوکری کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور خود کو کلی طور پر گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔

احسن صاحب سرشار اور مطمئن تھے۔ پپو بھی خوش تھا مگر جب کبھی ماہ پارہ کی یاد دل میں چٹکی لیتی تو بے اختیار ڈھیر سارا ملال گھیر لیتا۔ خود پر افسوس ہوتا۔ وہ کیوں بڑھ بڑھ کر بے چاری کی شکایتیں لگاتا تھا۔ بے ضرر سی شرارتیں ہی تو کرتی تھی۔ اس کا کیا بگڑ جاتا۔ اب نجانے کہاں تھی۔

اگرچہ احسن صاحب نے عافیہ بیگم پر مہ پارہ سے ملنے جلنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی تھی، مگر وہ خود ہی ان سے متنفر تھی اب تو ان کی شادی کے بعد شاید اور زیادہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پپو کو نوکری ملی تو وہ آتے ہوئے مٹھائی کا اتنا بڑا ڈبہ لیتا آیا۔ ماموں ممانی کا منہ میٹھا کروانے کے بعد اپنے ایک دوست کو فون کیا۔

ارادہ تھا کہ اس کے واسطے بھی لے جائے۔ کہ اس نے بتایا کہ اس کا کم سن بھتیجا جھلس گیا ہے۔ ملازمہ کی غلطی سے بچے نے گرم دودھ خود پر گرا لیا تھا۔ اور اب وہ ہسپتال کے برن یونٹ میں داخل تھا۔

دوست کا بھائی چونکہ بیرون ملک مقیم تھا، اس لیے وہی اس کے بچے کے پاس ہسپتال میں موجود تھا۔

حساس دل پپو بھی فوراً پہنچا۔ بچے کی حالت تسلی بخش تھی۔ صرف دایاں بازو جلا تھا۔ شام تک چھٹی متوقع تھی۔ وہاں وارڈ میں جھلسے ہوئے دو تین مریض اور موجود تھے۔ بچے کے بائیں جانب، بیڈ پر منہ سر لپیٹے ایک نسوانی وجود بھی موجود تھا، جس کی شاید ٹانگیں جھلس گئی تھیں۔ نرس بچے کو انجکشن لگانے آئی تو اس نے بھی آواز دی۔

"سسٹر! مجھے بھی کوئی پین کلر دے دو۔ سخت جلن ہو رہی ہے۔"

جانی پہچانی آواز پر پپو کرنٹ کھا کر مڑا۔ اب کے لڑکی کا آدھا چہرہ کھلا تھا۔ وہ مہ پارہ تھی۔ وہ ششدر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

مہ پارہ کو چچا چچی نے بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا۔ چچی کی کوئی بیٹی تو نہ تھی۔ وہ بھی بہت محبت جتاتی تھیں۔ گھر میں ہر قسم کی سہولت تھی۔ اتنی بڑی ایل ای ڈی، انواع واقسام کے کھانے، کھلا خرچ۔

چچا چچی ویسے بھی بچوں کو روکنے ٹوکنے کے خلاف تھے۔ ان کے دونوں لڑکے بھی اپنی مرضی کے مالک تھے۔

ماہ پارہ نے تو تنگی ترشی ہی دیکھی تھی۔ ماں روزی روٹی کے چکر میں بامشکل اس کی ضروریات ہی پورا کرپاتی تھی۔ عیاشی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس، پیار محبت جتانے کا بھی وقت اور ہمت دونوں ہی نہیں ہوتے تھے۔

اب چچا چچی کے ہاں آ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اماں نے اسے، ان رشتوں سے دور رکھ کر اس کے ساتھ سخت زیادتی کی تھی۔

اس سے وہ بھول گئی کہ انہوں نے خود ان ماں بیٹی کو دھتکارا تھا۔ اب بھی چچا پلاٹ مہنگے سے مہنگے داموں بیچنے کے لیے تگ ودو کر رہے تھے۔

اس نے تو سارا اختیار انہیں دے رکھا تھا۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ اس کے حصے کی رقم اس کے نام سے بینک میں جمع کروادیں گے۔

زیادہ تفصیلات سے اسے دلچسپی بھی نہ تھی۔ دن اچھے خاصے عیش وعشرت میں گزر رہے تھے۔ اب تو کوئی اونچی آواز میں گانے سننے پر ڈانٹتا بھی نہ تھا۔

چچی نے اسے بھی ٹچ موبائل لے دیا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اس شتر بے مہار قسم کے ماحول کا شاخسانہ یہ نکلا کہ ان کا چھوٹا بیٹا، اپنی ایک سینئر سے جو عمر میں بھی شاید دو چار سال اس سے بڑی تھی کورٹ میرج کر کے گھر لے آیا۔

چچا، چچی روئے پیٹے تو بہت، مگر آخرکار اس شادی کو قبول کرتے ہی بنی۔ آنے والی کو سب سے پہلے مسئلہ گھر میں چلتی پھرتی، خوب صورت قیامت مہ پارہ سے ہوا جو اتنے استحقاق سے اس کے ساس سسر کے گھر میں رہ رہی تھی۔

آتے ہی اس نے ماہ پارہ کے ساتھ بیر سا باندھ لیا۔ چچی کو وہ زبردستی کی بہو ہضم نہیں ہو رہی تھی مگر بیٹے کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ یوں اچھے خاصے خوش گوار ماحول میں کھینچا تانی سی رہنے لگی۔

ایک دن چچی گھر پر نہیں تھی۔ نئی دلہن نے نہانا تھا۔ بڑا پتیلا پانی کام والی نے ابلنے چولہے پر چڑھا دیا تھا۔ وہ تو کام ختم کر کے اپنے گھر چلی گئی۔

دلہن نے اسے حکم دیا کہ گرم پانی واش روم کے ٹب میں ڈال دے۔ مہ پارہ نے جب پتیلا ٹب میں الٹنا چاہا تو ایک کنارہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گرم پانی اس کی ٹانگوں کے کچھ حصے اور دونوں پاؤں کو جھلسا گیا۔ دل خراش چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ اب وہ ایک ہفتے سے برن یونٹ میں پڑی تھی۔

چچا چچی نے دیکھ بھال تو کی مگر چچی کو خود صحت کے بہت سے مسئلے تھے۔ وہ ہسپتال میں تو مسلسل اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔ یوں کئی راتیں اس نے اکیلے جلن اور درد سے تڑپتے گزاریں۔ ماں بے طرح سے یاد آئی۔ خواہ ان کو جتنا مرضی مسئلہ ہوتا وہ اسے یوں تنہا کبھی نہ چھوڑتیں۔

☆☆☆

گھر آ کر پپو نے من وعن تمام واقعہ ماموں کے گوش گزار کیا۔

"نافرمان اولاد کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

انہوں نے کہہ تو دیا مگر باضمیر انسان تھے۔ بچی سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی وقت عافیہ بیگم کے ہمراہ ہسپتال پہنچے۔ دونوں ماں بیٹی یوں ٹوٹ کر روئیں کہ انہیں دونوں کو چپ کروانا مشکل ہو گیا۔

ماہ پارہ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ماں سے بڑی کوئی جنت نہیں ہوتی اور گھر سے اچھی پناہ گاہ کوئی نہیں ہوتی اور عافیہ بیگم بھی سمجھ گئی تھیں کہ بگڑی اولاد کو پیار، محبت اور صبر و برداشت سے سدھارا جاتا ہے۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے دوسروں کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ اب وہ احسن صاحب کی جانب دیکھنے لگیں۔

"اس کو گھر لے چلتے ہیں۔" احسن صاحب نے فوراً فیصلہ کیا۔

ماہ پارہ کو گھر آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ ٹانگوں اور پاؤں کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ وہ بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عافیہ بیگم جی جان سے اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

ماموں کا رویہ بھی اس کے ساتھ مشفقانہ تھا مگر اس کو گہری چپ لگی تھی۔ پپو نے ابھی تک اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔ پہلے وہ سامنے والے گھر میں رہتی تھی تو اسے، اپنے گھر میں ہوتے ہوئے اس کی موجودگی کا احساس رہتا تھا۔ کبھی اس کا آنچل چھت پر لہراتا۔ کبھی وہ بیٹھک کی کھڑکی سے جھانکتی۔ کبھی اس کے گنگنانے کی آواز سنائی دیتی۔

اب وہ اس کے گھر کے ایک کمرے میں موجود تھی تو لگتا تھا کہ کہیں نہیں ہے۔ اسے اس کی چپ سے خوف آتا تھا۔ اب تو اس کے زخم بھی ٹھیک ہو رہے تھے مگر ابھی تک اس نے چلنا پھرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں یہ جھجک تھی، ملال تھا یا پھر ندامت کا کوئی احساس۔ وہ شاید خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

پپو نے آفس جانا تھا۔ اس نے الماری کھولی تو ساری شرٹس استری شدہ رکھی تھیں مگر پتلون ایک بھی نہیں تھی۔ عافیہ بیگم اس کے کپڑوں وغیرہ کا بہت دھیان رکھتی تھیں۔ آج کل ماہ پارہ کی وجہ سے مصروف رہتی تھیں، اس لیے شاید پتلون استری کرنا بھول گئی تھیں۔ پپو نے تو انہیں کئی بار اپنا کام کرنے سے منع کیا تھا مگر وہ یہ سب اسے، اپنا بیٹا سمجھتے ہوئے محبت سے کرتی تھیں۔ اس نے براؤن پتلون نکالی اور استری کرنے لگا۔ دل اداس اداس سا تھا۔ بے اختیار لب گنگنانے لگے۔

"دل کا آنگن سونا ہے دل کا آنگن سونا ہے"

اس کی بوجھل سی آواز سارے میں پھیلی یاسیت کی کیفیت کو مزید بڑھانے لگی۔ اچانک اس نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا۔

دروازے پر مہ پارہ ساکت سی کھڑی تھی۔ اتنی خاموش اور گم صم جیسے کوئی بے جان مورت ہو۔ اس سے نظریں چار ہوئیں تو اس کی کالی گھور آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ پھر وہ پانی چھلکا نہیں بلکہ اندر ہی کہیں ٹھہر گیا۔

پپو نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے دیکھنے میں نجانے کیا تھا کہ ماہ پارہ کے لبوں پر ذرا سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پپو کو وہ منظر بہت حسین لگا روتی آنکھیں اور ہنستے لب، وہ سحرزدہ سا دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ گرم استری کو بھول گیا۔ اچانک اس کی انگلی گرم استری کو چھوئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ جلدی سے استری اٹھائی تو پتلون میں اتنا بڑا سوراخ ہو چکا تھا۔ اس نے سوراخ اٹھا کر منہ کے سامنے کیا سامنے پھر ماہ پارہ کا ہی حسین مکھڑا دکھائی دیا۔ وہ بے اختیار جھینپ گیا اور ماہ پارہ کی ذرا سی مسکراہٹ مدھر ہنسی میں ڈھل گئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ دونوں کی ہنسی کی جلترنگ سارے میں پھیل گئی۔ نئے سال کی نرم گرم کرنوں نے بھی جان لیا کہ اب، ان دونوں کے دلوں کا آنگن بھی زیادہ دیر تک سونا رہنے والا نہیں تھا۔

☆☆

عمارہ امداد

پسِ آئینہ

''خالہ برکتے کی بہو نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔'' یہ آج کی تازہ ترین خبر تھی جو اس گلی میں کسی جیٹ طیارے کی سی رفتار سے تقریباً ہر گھر میں نشر ہو چکی تھی۔

اس گلی کی اکثریت نچلے متوسط طبقے پر مشتمل تھی۔ تمام گھروں کا آپس میں بہت میل جول تھا۔ کسی بھی گھر کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی بات بھی لمحوں میں سب تک پہنچتی تھی اور خیر یہ تو خبر بھی بہت بڑی اور حیران کن تھی۔ جس نے بھی سنا، حیران رہ گیا۔

''شکل سے اتنی معصوم نظر آنے والی، بمشکل انیس، بیس سالہ بانو اتنی جرأت بھی کر سکتی ہے۔'' خالہ صفیہ نے تو باقاعدہ انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔

''صاف خودکشی کی کوشش کی گئی ہے۔ اندر ہی اندر ڈپریشن ہوگا جو کسی کو پتا ہی نہیں چلا ہوگا۔''

یہ ثریا خالہ کی بہو تھی، جو ثریا کے سارے گھر میں سب سے پڑھی لکھی پوری بارہ جماعتیں پاس تھی اور اس پر مستزاد کہ اس نے ایف۔اے میں سائیکالوجی کو بطور اختیاری مضمون پڑھا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو کسی سائیکالوجسٹ سے کم نہ سمجھتی تھی۔

''اس لڑکی کے لچھن تو جب سے بیاہ کر آئی تھی مجھے تب سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، ہر وقت محلے کی کم سن کنواری لڑکیوں سے ہنسی ٹھٹھول میں لگی رہتی تھی، بھلا شادی شدہ لڑکیوں پر یہ سب جچتا ہے کیا۔'' محلے کی سب سے عمر رسیدہ خالہ بتول بولیں۔

''خالہ! اب اس کی شادی جلدی ہو گئی تو اس میں اس کا کیا قصور، وہ خود بھی تو ان لڑکیوں جتنی ہی ہے اس لیے سب سے دوستی ہے۔''

یہ بانو کی ایک سہیلی تھی۔



اسے خالہ بتول کی باتوں پر اعتراض تھا تو خالہ بتول نے بھی ہاتھ اور سر جھٹک کر ''اونہہ'' کہہ کر اس کی بات کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو خالہ!'' کسی نے خالہ بتول کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اللہ جانے کیا بات ہے؟ یہ بھی تو سوچو کہ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ وہ کھڑکی سے ہی کود گئی، اگر کچھ ہو جاتا تو۔'' ایک اور خاتون بولیں۔

غرض یہ کہ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں، ہر کوئی اپنی رائے دینا فرض سمجھ رہا تھا۔

یہ گرما کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ مرد حضرات سارے اس وقت اپنے اپنے کام دھندے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ شیر خوار بچوں کے علاوہ باقی سارے بچے اپنے اپنے اسکول کالجز میں تھے۔ خواتین تک جیسے جیسے خبر پہنچ رہی تھی، وہ سب گلی کے عین وسط میں خالہ برکتے کے گھر کے باہر جمع ہو رہی تھیں۔

''ارے! کوئی یہ تو بتائے کہ بانو کا کیا بنا، اسے کتنی چوٹیں آئیں اور وہ کدھر ہے۔'' خالہ برکتے کے ساتھ والے گھر سے سکینہ بھابھی بھی آ چکی تھیں۔

ان کی بات پر سب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی گوہر افشانی کی جاتی، خالہ برکتے کے گھر کے عین سامنے والے گھر میں رضیہ نے محلے والوں کی باتیں سنیں تو جلدی سے دو سالہ منے کو اٹھایا اور عجلت میں باہر نکلی، بھئی اس واقعے کا اصل چشم دید گواہ تو اس کا شوہر تھا تو لوگوں کو اس بارے میں بتانا اس کا ہی تو فرض تھا۔

''اوپر والے پورشن کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے اس نے، ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی تھی جو رشید کا لوڈر ٹرالہ نہ کھڑا ہوتا۔'' اب سب خواتین خاموشی اور بھرپور دلچسپی سے رضیہ کی بات سن رہی تھیں۔

''اور کیا پتا گر کر سیدھی سر پہ چوٹ لگتی تو جان سے ہی جاتی، لیکن یہ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ واقعہ سے تھوڑی دیر پہلے رشید گھر آئے اور وہ بھی کام کے دوران کہاں آتے ہیں، آج سعدیہ (رضیہ کی نند) کے جہیز کے لحاف جو بازار میں روئی ڈلوانے کے لیے دیے ہوئے تھے، وہ ملنے تھے تو انہوں نے سوچا کہ وہ بھی گھر دے جائیں اور کھانا بھی کھا جائیں، وہی دینے آئے تھے اور جب یہ گری تو لحاف ابھی اندر ہی تھے، ان پر ہی گری اس لیے بچت ہو گئی، ٹھیک ہے بالکل، ہلکی پھلکی خراش ہی آئی ہے۔'' اس نے ان سب کو پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

''اب بانو کدھر ہے؟''

''وہ جب گری تو خالہ برکتے اسی وقت گھر سے باہر آئی تھیں، تب بانو اس کے ساتھ گھر ہی چلی گئی۔''

''ویسے کوئی تو بات ہوئی ہو گی جو اس نے اتنی جرأت کی۔'' خالہ بتول اب واقعے کا پس منظر جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو خالہ۔'' سب نے ان کی تائید کی۔ ''کیوں نہ خالہ برکتے کے گھر جائیں، اصل بات کا پتا تو وہیں جا کر لگے گا۔'' خالہ صفیہ بولی۔

''ہاں صحیح بات ہے، کیا پتا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو، خالہ برکتے بھی مزاج کی اچھی خاصی تیز ہیں اور غصہ تو بانو کو بھی جلدی آتا ہے۔ اس سے پہلے دو تین دفعہ میں نے ان کے گھر سے لڑائی کی آوازیں بھی سنی ہیں۔'' سکینہ بھابھی نے جھٹ ان دونوں کے درمیان کبھی کبھار ہوتی نوک جھونک کو باقاعدہ لڑائی کا نام دیا۔

اب خواتین کا یہ گروہ خالہ برکتے کے گھر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے، زار و زار رو رہی تھی، آنے والے وقت کا سوچ کر اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ ابھی تک اماں نے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی تھی، بس خاموش نظروں سے اسے دیکھے گئی تھیں۔

''میں نے جو کچھ انہیں بتایا اگر انہوں نے اس بات کا یقین نہ کیا تو میں کیسے انہیں اپنی صفائی دوں گی؟ کیا میں اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی سکوں

گی؟ اگر اماں نے اسلم کو سب بتا دیا تو کیا وہ مجھے بے گناہ تصور کریں گے یا وہ مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے؟ اگر اسلم نے مجھے غلط سمجھا اور گھر سے نکال دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو اس گھر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اگر اسلم نے مجھ سے میرا بیٹا بھی چھین لیا تو؟" اس نے اپنے پاس سوئے تین سالہ "احمد" کو ممتا کے خوب صورت جذبے سے معمور فکر مند نظروں سے دیکھا۔

آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ وہ ان ہی پریشان کن سوچوں میں گھری ہوئی تھی کہ جب اسے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ وہ اس وقت اوپر اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی، جس کی کھڑکی سے اس نے چھلانگ لگائی تھی۔

اب اسے دروازہ کھولنے کی آواز آئی تھی۔

چھوٹا سا بمشکل تین مرلے کا گھر تھا۔ جس میں ایک کھلا صحن بھی تھا۔ اوپر نیچے کی آوازیں آسانی سے سنی جا سکتی تھیں۔ وہ بغیر دیکھے بھی جان گئی تھی کہ محلے کی عورتیں جو پہلے ان کے گھر کے باہر اس کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھیں، اب ان کے گھر میں موجود تھیں۔

"اماں اب جانے ان سے میرے بارے میں کیا کیا کہیں گی، وہ مجھ پر ہی الزام دھریں گی، وہ تو کبھی بھی اشرف کو قصوروار نہیں ٹھہرائیں گی۔" نمکین پانی ایک بار پھر گالوں کو بھگو گیا تھا۔

"بانو اب کیسی ہے؟ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں خالہ!" اسے ایک آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ اسے کیا ہونا لیکن آج جو اس نے تماشا کیا، میں تو ابھی تک اس بات سے ہی نہیں سنبھل پائی۔" اماں نے قدرے رکھائی سے کہا تو اس کا دل درد سے بھر گیا۔ یعنی انہوں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔

"پھر بھی بھلا ایسی کیا بات ہوگئی کہ اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔" یہ شاید بتول خالہ تھیں۔

"بس بہن! کیا بتاؤں، میں تو خود ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہوں۔ میرے تو یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی، اپنے بیٹے کو کیا جواب دیتی کہ اس کی غیر موجودگی میں، میں اس کی بیوی کو نہ سنبھال پائی اور تو اور خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو مجھ جیسی سیدھی سادی عورت نے تھانے اور پولیس کے چکروں میں خوار ہونا تھا، بدنامی الگ ہوتی، اللہ نے بڑا بچا لیا۔"

"پر ہوا کیا تھا خالہ۔" یہ تجسس تو ابھی بھی برقرار تھا۔

"ہونا کیا ہے، کم بخت آفت ہے پوری۔"

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب اماں انہیں تفصیل بتائیں گی اور وہ اشرف کو تو بدنام نہیں کریں گی تو یہ طے تھا کہ بخیے اس کی ذات کے ہی ادھڑنے ہیں۔

"سارا سارا دن آرام کرتی رہتی ہے۔ آج میں نے صبح کہا کہ تفصیلی صفائی کرنی ہے تو جواب میں ناک منہ چڑھانے لگی اور بجائے اس کے کہ میری بات پر کان دھرتی اور صفائی کرتی، موا موبائل لے کر بیٹھ گئی، میں نے پیار سے دو تین دفعہ کہا لیکن اسی موبائل پر آنکھیں کوری کیے گئی۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے چار باتیں سنا دیں بس وہیں سے بات بڑھ گئی۔ ٹھیک ہے میں نے بھی کچھ سخت کہہ دیا تھا، طعنے بھی دے دیے، نہیں مکرتی میں، لیکن آج کل کی لڑکیوں میں تو برداشت نام کو بھی نہیں، اتنا غصہ کہ مرنے مارنے پر تل جاؤ، اصل میں غصہ کسی اور بات کا لیے بیٹھی ہے۔"

"وہ کیا خالہ؟" سب یک زبان ہو کر بولیں۔

"دو، تین ماہ تک اشرف کی شادی کر رہی ہوں، میں نے یہ کہہ دیا کہ تم اشرف کی شادی سے پہلے نیچے والے کمرے میں آ جانا اور اوپر والا کمرہ بڑا ہے، وہ نئی دلہن کو دے دیں گے۔ بس تب سے ہی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی ہے اور آج اسی لیے لڑائی کا بہانا بنا لیا۔"

وہ حیران سی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ آج ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا جو اماں ان سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ تو بڑی غلط بات ہے، بڑے کچھ کہہ ہی دیتے ہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اتنا بڑا قدم اٹھالیا جائے۔"

"بس بھئی جو ہونا تھا وہ ہو گیا، میں تو ڈر گئی ہوں، اس بڑھاپے میں اب خوار نہیں ہوا جاتا، میں نے اسلم کو بلا لیا ہے، اب وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔" اسلم کے نام پر وہ کانپ سی گئی۔

"یہ اچھا کیا تم نے خالہ! وہی اپنی بیوی کا فیصلہ کرے۔"

"میں تو کہتی ہوں، اس سے کہنا، مرد ہے اسے ایک دو جڑ بھی دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، آخر اتنی سی بات پر اس نے اتنی جرأت کی، دو چار لگائے گا نا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" یہ خالہ بتول تھی جو اپنے مشورے سے نواز رہی تھی۔

"ہاں، اب وہی فیصلہ کرے، یہ صلہ دیا ہے اس نے مجھے، ارے بیٹی بنا کر رکھا میں نے، نہ آگے کوئی نہ پیچھے کوئی، اکڑ کس بات کی ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد میں نے سر پر ہاتھ رکھا، بیٹے سے شادی کی، پر اسے عزت راس نہ آئی، مجھے ہی آنکھیں دکھانے لگی۔"

"بس خالہ! بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔"

"چلو! اللہ بہتر کرے گا۔"

مختلف آوازیں ابھر رہی تھیں۔

وہ ساکت بیٹھی اس من گھڑت کہانی کو سن رہی تھی تب اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، یعنی وہ سب جا رہی تھیں۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی سے عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

اماں نے اصل بات کے بجائے کوئی اور ہی کہانی سنائی تھی، گو کہ سب باتیں بھی اس کے خلاف ہی تھیں۔ اماں کی غلط بیانی پر اسے دکھ بھی ہو رہا تھا لیکن اس کی اتنی برائیوں کے باوجود اماں نے اصل بات چھپا لی، جانے اماں کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

بانو کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ گھر سے نکلتے ہی انہوں نے باتیں شروع کر دی تھیں۔

"ویسے اتنی سیدھی سادی خالہ بھی نہیں ہے جتنی بن رہی تھی۔"

"ہاں! یہ تو ہے، تالی دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے، اگر لڑائی جھگڑا اتنا بڑھا کہ بانو نے اتنی جرأت کر لی تو یقیناً خالہ بھی اس لڑائی میں برابر کی قصوروار ہے۔"

"ہاں! تو اور کیا، ہمیں کیا پتا کہ اندر ہی اندر کیا چل رہا ہے۔" اوپر کھڑکی کے پاس کھڑی بانو اور نیچے دروازہ بند کرنے کی غرض سے کھڑی برکت بی بی دونوں ہی تلخی سے مسکرائی تھیں اور اس مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ بانو کے اور برکت بی بی کے گالوں پر آنسو لڑھکے تھے جنہیں بانو نے بہہ جانے دیا اور برکت بی بی نے سختی سے صاف کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اسلم جب کمرے میں آیا تو بانو ساتھ لے جانے والا سامان باندھ رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی لیکن مستقل طور پر جانا تھا اور اتنا اچانک پروگرام بنا تھا۔ منے کی چھوٹی چھوٹی اتنی چیزیں تھیں، وہ ذہن میں دہرائی جاتی اور رکھتی جاتی۔

"تیاری ابھی پوری نہیں ہوئی۔"

"بس تقریباً ہو ہی گئی ہے۔ ضروری چیزیں ساری رکھ لی ہیں، باقی چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں وہ رکھ رہی ہوں۔" وہ بنا اس کی طرف دیکھے مصروف سے انداز میں بولی۔

وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی کہ کہیں اس کی روئی روئی سرخ آنکھیں کوئی راز نہ افشا کر دیں۔ اس لیے وہ خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

"ویسے مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ اماں نے خود مجھ سے تمہیں ساتھ لے جانے کو کہا، وہ تو تمہیں میرے ساتھ بھیجنے کے بالکل حق میں نہیں تھیں۔" بولتے ہوئے اس کے چہرے پر خوشی کی رمق تھی۔

وہ اماں کے فوری طور پر بلانے پر ابھی دو گھنٹے پہلے پہنچا تھا اور آتے ہی تھوڑی دیر بعد اماں نے بانو کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کی پیشکش کر دی تھی۔ اس کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ رکھے، لیکن اماں کے اکیلے پن کی وجہ سے خاموش ہو جاتا تھا۔

وہ اس کے ساتھ جاتی تو اماں اکیلی رہ جاتیں اشرف ایک مل میں ملازم تھا، صبح کا گیا رات کو آتا تھا۔ اماں کہتی تھیں کہ بانو اس کے ساتھ رہے گی تو خرچہ زیادہ ہوگا، اس کے لیے کرائے پر گھر بھی لینا پڑے گا۔ اماں بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں ابھی اشرف کی شادی بھی کرنی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا تھا کیونکہ وہ بڑا بھائی تھا، ابا کے بعد یہ اس کا فرض بنتا تھا۔ ویسے بھی وہ کوئی لاکھوں کی نوکری تو کرتا نہیں تھا دس جماعتیں پاس کر گیا تھا۔ ابا نے اپنی زندگی میں کہہ سن کر اسے ایک سرکاری دفتر میں نائب قاصد بھرتی کروا دیا تھا، گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔

اب اس کی حیرانی بھی بجا تھی کہ یکا یک اماں نے یہ فیصلہ صادر کیا تھا اور کہا تھا کہ اشرف کی دو مہینے میں شادی کرنی ہے تو ان کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی، یہ فیصلہ تو انہوں نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ بانو کو اس کے ساتھ بھیج دیں گی لیکن اب بانو کو جلدی اس لیے بھیج رہی ہیں کہ کچھ دنوں سے اس کے سر میں درد رہنے لگا ہے۔ لاہور بڑا شہر ہے، وہاں اچھے ڈاکٹر ہیں، وہاں اس کا علاج اچھا ہو جائے گا۔

"تو سر درد کی فکر نہ کر، میں تجھے وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" اسلم اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، ان شاءاللہ۔" وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتی پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"چل تو بھی جلدی ہاتھ چلا اور سو جا، مجھے بھی نیند آ رہی ہے، اماں نے کہا ہے، صبح تڑکے ہی نکل جانا، تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہی پہنچ جائیں، دن چڑھ گیا تو گرمی ہو جائے گی۔" وہ لیٹتے ہوئے بولا اور جلد ہی نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے جلد ہی نیند آ گئی۔

ذہنی طور پر تو وہ بھی بہت تھک چکی تھی لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

بیگ کی زپ بند کر کے وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ آج کیسا دن چڑھا تھا؟ ایک ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دن بھر کے واقعات ذہن میں گردش کرنے لگے۔

آج صبح بارہ بجے کی ہی تو بات تھی، وہ احمد کو سلا کر خود بھی آرام کی غرض سے اس کے ساتھ ہی لیٹی تھی کہ اشرف اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔ وہ اکثر اس کے کمرے میں بلا دستک دیے دھڑلے سے آ جاتا تھا کہ وہ گھبرا جاتی تھی لیکن آج تو اسے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے عجیب بے باک سے انداز سے وہ اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔ وہ جو اسے ہمیشہ بڑے بھائیوں والا مان دیتی آئی تھی اس کی بدلتی نظروں سے بری طرح خائف ہو گئی۔

"اشرف بھائی! یہاں سے جائیں، ورنہ میں اماں کو بلا لوں گی۔" وہ قدرے سخت اور بلند آواز میں بولی، اندر سے وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی لیکن خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔

"تو بلا لو، جتنی بلند آواز میں بلا سکتی ہو، بلا لو۔"

جواباً وہ اس کی بات کو قطعاً اہمیت نہ دیتے ہوئے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے، اس کی طرف پیش قدمی کرنے لگا تھا تو گویا کچھ عرصے سے اسے اس کا جو بدلا انداز کھٹک رہا تھا آج وہ روپ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

وہ بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتی پیچھے ہٹتی ہوئی

دیوار سے ٹکرائی تھی، تب ہی اسے اپنے پیچھے کسی روزن کی طرح کھڑکی نظر آئی تھی۔ لمحوں میں اس نے فیصلہ کیا تھا اور اس کے ناپاک ارادے کو ناکام بناتے ہوئے کھڑکی سے کود گئی تھی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بلندی سے گرنے کی وجہ سے سوائے زوردار جھٹکا لگنے کے خراش تک نہ آئی تھی۔ اسے اپنے اردگرد سب چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تب اس نے اماں کو اپنے پاس کھڑے پایا تھا۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اماں بالکل سپاٹ چہرہ لیے خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر، اسے لوگوں کے درمیان سے گزار کرا نے ساتھ گھر لے گئی تھیں۔

گھر جا کر اس نے بے حد گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا لیکن اسے اشرف کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جان کر اماں کو روتے ہوئے ساری بات بتا دی تھی اور انہوں نے بھی بنا اسے ٹوکے خاموشی سے سب سنا تھا۔ وہ ان کی مسلسل خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہی تھی۔

☆☆☆

یہ اسلم کے آنے سے کچھ دیر پہلے کی بات تھی جب برکت بی بی، اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ جو مارے ڈر کے اپنے کمرے سے نہیں نکل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ مجھے بلا لیتیں، سیڑھیاں چڑھ کر آئیں، پہلے ہی آپ کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے کچھ ضروری بات کرنی تھی تم سے۔" ان کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی بستر پر بیٹھیں تو وہ بھی نظریں جھکائے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اماں! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی، میں بے قصور ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ حلق میں نمکین پانی کا گولہ سا اٹک گیا تھا۔

"تم نے جو کچھ کہا، میں نے سن لیا، کوئی باز پرس نہیں کی۔ جانتی ہو کیوں؟" وہ سوالیہ انداز میں بولیں تو وہ سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھنے لگی۔

"کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، تم جب احمد کو سلانے کمرے میں لے گئی تھیں تو میں گھر کی چند ضروری چیزیں لینے بازار گئی تھی، احمد کی نیند نہ خراب ہو اس لیے تمہیں نہیں بتایا، اشرف آج گھر پر تھا کام پر نہیں گیا تھا میں اسے بتا کر چلی گئی تھوڑی دور جا کر احساس ہوا کہ جو پیسے نکالے تھے وہ تو گھر میں ہی رہ گئے، پرس میں رکھنا ہی بھول گئی، پیسے ہی پاس نہیں تھے تو آگے کیا جاتی اس لیے وہ لینے کی غرض سے میں واپس گھر کی سمت آ گئی تھی۔ دروازے کی ایک فالتو چابی ہمیشہ میرے پرس میں ہوتی ہے تم جانتی ہو لیکن اشرف نہیں جانتا تھا۔

آج جو کچھ ہوا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسی شبے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اشرف کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تم چھلانگ لگا چکی تھیں۔" وہ سانس لینے کو رکیں اور پھر بولیں۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی! میں اپنے بیٹے کی اچھی تربیت نہ کر سکی بجائے اس کے کہ وہ اپنے بھائی کی عزت کی حفاظت کرتا، وہ تو خود موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے محلے کی عورتوں سے اس لیے غلط بیانی کی کہ میرے اور تمہارے جھگڑے پر چار دن لوگ باتیں کر کے پھر اسے روایتی ساس بہو کا جھگڑا سمجھ کر بھول جائیں گے لیکن حقیقت تلخ ہوتی ہے، لوگوں کو پتا چلتا تو اپنے اپنے انداز میں اس پر تبصرے کرتے، چار لوگ اشرف کو برا بھلا کہتے تو کچھ انگلیاں تمہارے بے قصور ہونے کے باوجود تمہاری طرف بھی اٹھ جاتیں۔"

وہ رسان سے اسے سمجھا رہی تھیں اور وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہ کہہ رہی تھیں۔

"اسلم کو میں نے فون کر کے بلا لیا ہے تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا، میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ کئی دنوں سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائے، وہاں اچھے ڈاکٹر ہیں تمہارا

علاج اچھا ہو جائے گا۔ اب تم نے اسلم کے سامنے اس بات پر پکار رہتا ہے۔ اس درخواست کو ایک ماں کی مجبوری سمجھ لو یا التجا میں نہیں چاہتی کہ میرے دونوں بیٹے آمنے سامنے ہوں اور صبح تڑکے ہی نکل جانا تاکہ اسلم گلی میں کسی سے مل ہی نہ سکے میری بچی مجھے معاف کر دو یہ سب جو ہوا، اس میں میری ہی غلطی ہے۔"

اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"آپ کا اس میں کیا قصور، آپ تو میرے لیے ڈھال ثابت ہوئی ہیں۔" وہ آنسو بھری آنکھوں میں ان کے لیے تشکر کے جذبات لیے بولی۔

"غلطی ہے میری بچی! میری غرض مجھ پر حاوی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد اسلم کا دل چاہتا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھے لیکن میرے احترام میں اس کا اظہار نہ کرپاتا تھا اور میں اس کے دل میں دبی یہ خواہش جانتی تھی لیکن جان بوجھ کر اس سے نظریں پھیر لی تھیں۔ تم آئیں تو گھر میں رونق ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے گھر کے کاموں کے لیے بھی سہارا مل گیا میں نے اپنا فائدہ سوچا لیکن یہ میری خطا تھی۔ میں نے تمہیں تمہارے محرم رشتے سے تو دور رکھا اور نامحرم رشتے کے پاس، ایک ہی چھت تلے اکیلا چھوڑ دیا۔ میری نیت بری نہیں تھی بس غرض حاوی ہو گئی تھی۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

بات کے اختتام پر برکت بی بی کی آنکھیں برس پڑیں۔ بانو تڑپ اٹھی اور ان کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ایک شرط پر مانوں گی اماں۔" وہ مان بھرے لہجے میں بولی۔

"وہ کیا۔"

"جب آپ کی دوسری بہو اس گھر میں آجائے گی تو پھر آپ کی گھر کے لیے فکر ختم ہو جائے گی، اس لیے تب آپ مستقل ہمارے پاس آجائیں گی۔"

"فکر نہ کرو، تمہیں اکیلی میں رہنے بھی نہیں دوں گی، صرف پاس رہوں گی بلکہ تمہارے سارے کاموں پر نظر بھی رکھوں گی۔"

بانو نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور دونوں روتے روتے ہنس دی تھیں۔

☆☆☆

"خالہ برکتے کی بہو اور بیٹا صبح تڑکے ہی لاہور کے لیے روانہ بھی ہو گئے۔" محلے میں یہ خبر گردش کر رہی تھی۔

"اب سمجھ آئی، بانو یہ ساری لڑائی اور فساد اسی لیے کر رہی تھی۔ شوہر کے ساتھ جانا چاہتی ہو گی۔" خالہ بتول بولی تو محلے کی کئی عورتوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"تو اس میں برائی کیا ہے خالہ! چار سال وہ سسرال میں ہی رہی ہے۔ اب اسلم بھائی کی بھی مجبوری ہے کہ ان کا روزگار دوسرے شہر میں ہے خود تو وہ نہیں آسکتے، اچھا ہے بیوی کو اپنے ساتھ رکھیں، ہاں لیکن یہ بانو نے اچھا نہیں کیا مجھ سے مل کر بھی نہیں گئی۔" بانو کی ایک سہیلی کے لبوں پر اس کی طرف داری کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی ابھرا۔

"خالہ برکتے سمجھ دار عورت ہے، اس سے پہلے کہ آپس کے لڑائی جھگڑے اور بڑھتے، بہو کو بیٹے کے ساتھ بھیج دیا۔"

"ہاں! صحیح کہہ رہی ہو اور ویسے بھی خالہ اشرف کی شادی بھی جلد ہی کر رہی ہے، وہ کون سا اکیلی رہ جائے گی۔ جاتی ہے بانو تو جائے اس کی بلا سے۔"

گلی میں ان کے گھر کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔

تب ہی چہرے پر خجالت لیے اشرف گھر میں داخل ہوا تھا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے ابھی لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ برکت بی بی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بنا بات کیے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆

آسیہ رئیس خان

رفاقتیں

وہ دروازے کی چوکھٹ میں ایستادہ اسے اپنے دھیمے اور محتاط انداز میں کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی یہ عادت جوں کی توں قائم تھی کہ اس کی وجہ سے بلاضرورت شور ابھرے نہ کسی کو پریشانی ہو۔ حالاں کہ اب اس کے ہونے اور پاس ہونے کا احساس اس کی سب سے بڑی آسودگی تھا۔ اس نے اتنا کچھ کھو دیا تھا کہ اب اس کی پیدا کردہ آوازیں، آہٹیں، بالوں اور دوپٹے کی سرسراہٹیں، کلائی میں ڈولتی چوڑیوں کی کھنک، قدموں کی چاپ، سانسوں کے زیروبم سب کچھ اس میں طمانیت بھر دیتا تھا۔ اس کا خالی پن ان سب سے بھر جاتا تھا۔

وہ تکیے کے غلاف اور چادر بدلنے کے بعد، میلی چادر اور غلاف تہ کر کے پلٹی اور سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے منیب کو دیکھ کر مسکرائی۔

''آپ لیٹ جائیں، میرا کام ہو گیا ہے۔''

اسے لگا تھکا ہارا شوہر اس کے وہاں سے ہٹنے کا منتظر ہے۔ اس نے میلی چادر اور غلاف کرسی پر رکھے اور الماری سے ہلکا سا لحاف نکال کر پائنتی رکھ دیا۔ تب تک وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے پلنگ کے کنارے بٹھایا۔ وہ اس کی سنجیدہ صورت دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس کے دو لفظ سہمے اور انجانے خوف سے لبریز تھے۔ ان سب پر ہی ہر لمحہ کسی انہونی کا خدشہ سایہ کیے رہتا تھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ اسے تسلی دینے کے لیے مسکرایا۔

''مجھے یونہی خیال آیا کہ ماضی کی کوئی بڑی بات جو حال میں بھلے ہی معمولی ہو گئی ہو اگر غلط وقت پر ظاہر ہو تو عظیم دکھ اور ملال کا باعث بن جاتی ہے اور





"میرے پاس ایسی ہی ایک معمولی بات ہے جو میں خود تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔"

مثیب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اس کی سیدھی ہتھیلی پر اپنا انگوٹھا پھیر رہا تھا۔

مکمل ناول



"میری بات تمہیں اچھی نہیں لگے گی، تمہیں دکھ بھی ہوگا لیکن تمہیں کسی بڑے دکھ سے بچانے کے لیے مجھے یہ سچ کہنا ہے، میں نہیں چاہتا ۔ایک طویل مسافت کے بعد کسی بھی وجہ سے رائیگانی کا احساس تمہیں زندہ درگور کردے......" اس کا دل بات سننے سے پہلے ہی ڈوبنے لگا تھا۔

☆☆☆

اطلاعی گھنٹی کے جواب میں دروازہ دیبا نے کھولا اور وہ اس کی شکل دیکھ کر ہی کوفت زدہ ہوگیا۔ یہاں آتے ہوئے راستے بھر جو سرور چھایا تھا۔وہ دروازے پر ہی غائب ہوگیا۔

اعتماد سے مبرا الجھی جھجکتی، اپنے آپ میں گمی اور خاموش سی دیبا کو دیکھ کر ہمیشہ ہی اسے الجھن اور بےزاری گھیر لیتی تھی۔

اس کے خاندان کی ساری لڑکیاں شانو سمیت بااعتماد، اپنی اہمیت سے آگاہ اور شخصیت کی تعمیر پر بھرپور توجہ دینے والی تھیں اور ان سب میں دیبا آنکھوں میں چبھنے والا منظر تھی۔

وہ سلام کرکے واپس چلی گئی اور وہ اس کی بد اخلاقی پر کڑھتا اندر آیا حالاں کہ اچھی طرح جانتا تھا یہ بداخلاقی نہیں اس گھر میں اس کے لیے مقرر کی گئی حدود ہیں۔

عروبہ کو 'سرپرائز' دینے کے فراق میں اس نے اسے اطلاع نہیں دی تھی اور اب گھر میں صرف نانی، چھوٹی ممانی اور دیبا کو دیکھ کر پچھتا رہا تھا کہ ادھر کا رخ کیا ہی کیوں۔

نانی ہال میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔انہوں نے ہی مطلع کیا کہ گھر والے سب عروبہ کی خالہ کے یہاں کسی تقریب میں گئے ہیں۔

"عابدہ!" نانی نے چھوٹی ممانی کو آواز لگائی۔

"جی اماں۔" وہ فوراً ہی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی دروازے میں نمودار ہوئیں۔اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ بلا ارادہ ہی سلام میں پہل کرکے اس نے انہیں عرصے بعد اپنے لیے کسی کے برتاؤ میں عزت محسوس کرکے ہونے والی خوشی سے ہمکنار کروایا تھا۔

"میرے کمرے میں الماری کے باہر ہی شاپر رکھا ہے، وہ لے آؤ۔"

"جی۔" وہ جیسے فوراً آئی تھیں ویسے ہی یکایک دروازے کے اندر غائب ہوگئیں۔

"اپنے لیے شاپنگ کو گئی تھی تو شانو اور قرۃ العین کے لیے بھی کچھ جوڑے لیے ہیں۔" انہوں نے شاپر کے مشمولات پر روشنی ڈالی۔وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"تم فون کردیتے ناں۔ذرا دیر پہلے ہی سب نکلے ہیں۔"

"اس طرف اچانک کسی کام سے آنا پڑا تو سوچا مل بھی لوں، پہلے سے کوئی پلان نہیں تھا۔" یہ مکمل سچ نہیں تھا۔

"دیبا!" نانی نے منہ دروازہ کی طرف کرکے ناگواری سے پکارا۔"سو گئی ہو کیا؟"

"اعظم اچھے ہیں؟" انہوں نے رخ دوبارہ اس کی طرف کرکے پوچھا تو پل بھر قبل والی آواز کی تختی اور ناگواری غائب تھی۔

"پاپا بھی اچھے ہیں، اس ویک اینڈ نہیں اگلے سیٹر ڈے آئیں گے۔"

شہر شہر گھومنے کے بعد تین سال پہلے اعظم میر نے آبائی شہر میں مکان تعمیر کیا تھا۔اعظم میر اور قرۃ العین نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اور بچے اپنے گھر میں رہیں گے بس وہ ملازمت کے سلسلے میں جہاں تعنیات ہوں گے وہاں جائیں گے۔ویسے بھی ان کو سرکاری رہائش اور ملازم کی سہولت حاصل تھی۔وہ دو ہفتوں بعد دو دن کے لیے گھر آتے تھے۔

تب ہی دیبا اندر آئی اور ٹرے میز پر رکھی۔ چائے کے ساتھ کیک اور نمکین بھی تھا۔

"میں یہ سب نہیں لوں گا نانی......" اس نے دیکھتے ہی کہا۔

"عقل تو نام کو نہیں ہے اس لڑکی میں۔" وہ جو

کپ اٹھا کر اسے دینے لگی تھی، سہم کر اپنی دادی کو دیکھنے لگی۔ یہ ان ہی کی ہدایت تھی کہ 'مخصوص' مہمانوں کو خالی چائے نہ پیش کی جائے۔
"کھانے کا وقت ہے یہ۔" انہوں نے جیسے اس کا چہرہ پڑھ کر ڈانٹ لگائی۔ تب ہی عابدہ وزنی سا شاپر اٹھائے اندر آئیں۔
"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے نانی۔" اس نے دیبا کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔
"لیٹ لنچ کیا تھا، بس چائے کی طلب تھی۔"
اس نے دیبا کو بچانے نہیں کہا تھا بلکہ یہ واقعی سچ تھا۔ دیبا نے دوسرا کپ انہیں تھمایا اور چلی گئی۔
عابدہ نے پلاسٹک کا بڑا سا تھیلا فرش پر اس کے قریب رکھا تو اس نے دیکھا۔ ان کے دوپٹے کی لیس نکل کر جھول رہی تھی۔ وہ بھی دیبا کے پیچھے ہو لیں۔
جیسا برتاؤ یہاں سب کا بیوہ ممانی اور ان کی یتیم بیٹی سے تھا اور جو رویہ ان دونوں کا تھا، وہ یہ دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ پہلے کبھی کبھار ہی نانی کے گھر آتا تھا۔ عروبہ کے لیے اپنے بدلے احساسات کے بعد وہ اسے سرپرائز دینے لیے اب اکثر آنے لگا تھا ورنہ تو ان کی ملاقاتیں باہر ہی ہوتی تھیں۔
ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ فون بجنے لگا۔ دوسری طرف شانو تھی۔
"تمہیں کیسے پتا چلا میں نانی کی طرف ہوں؟ " اس نے خوش دلی سے کہا۔
"بھائی۔ کہاں ہیں آپ؟" اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔
"ہیلو۔ کہا تو نانی کی طرف آیا ہوں۔"
"امی ابھی تک گھر نہیں آئی ہیں۔" اس نے اب غور کیا کہ وہ رو رہی تھی۔
"سلمان بھائی کب سے انہیں ڈھونڈنے گئے ہیں۔"
"اس میں رونے والی کیا بات ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔
"بھائی! تین گھنٹے ہونے آئے ہیں۔"
"اچھا پہلے رونا بند کرو اور پوری بات بتاؤ۔" نانی بھی چونک کر اس کی بات سننے لگیں۔

"امی قریبی مارکیٹ گئی تھیں، وہ ہمیشہ تیس چالیس منٹ بعد واپس آجاتی ہیں لیکن دو گھنٹے ہو گئے وہ نہیں آئیں، میں نے انہیں فون لگایا تب پتا چلا فون گھر میں ہی پڑا ہے اور اب تو سلمان بھائی کو گئے بھی بہت دیر ہو گئی ہے، انہیں ابھی تک ملیں نہیں امی۔" وہ پھر رونے لگی۔
"اچھا تم روؤ نہیں۔ میں آرہا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔
"نانی! میں چلتا ہوں۔"
"ارے یہ تو لو۔" انہوں نے شاپر اٹھایا۔ "کیا کہہ رہی تھی شانو؟"
"کچھ نہیں، امی فون گھر بھول کر مارکیٹ گئی ہیں، دیر ہو گئی انہیں تو شانو پریشان ہو رہی ہے، وہ اکیلی ہے گھر میں۔" اس نے حتی المقدور وہ بات کی جسے سن کر وہ فکر مند نہ ہوں۔
"شانو بھی! اکیلی ہے تو چاچا کے یہاں چلی جائے اسی کالونی میں چار قدم پر تو گھر ہے۔"
"جی بس۔ میں چلتا ہوں۔"
وہ راستے میں تھا تب فون مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے فون اٹھانے کے بجائے گھر پہنچنا درست سمجھا۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ جیسے تیسے گاڑی کھڑی کر کے اندر آیا تو ان تینوں کو دیکھ کر طمانیت اس کے اندر سرائیت کر گئی۔
"ڈرا دیا آج تم سب نے مجھے!"
"ہم خود اتنے ڈرے ہوئے تھے۔" شانو اپنی جگہ بھائی کے لیے خالی کرنے کھڑی ہو گئی۔
"کیا ہوا تھا امی؟" اس نے بیٹھ کے ماں کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ماں کا لاڈلا تھا تو قرۃ العین بھی اس کی دنیا تھیں۔
"پتا نہیں بیٹا، میں تو بس واپس آرہی تھی پھر اچانک چلتے چلتے تھک گئی تب غور کیا کہ ابھی تک گھر کیوں آیا، کہاں آ گئی ہوں۔ آس پاس دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، جانے بے خیالی میں کون سا موڑ مڑ گئی کہ پھر راستہ ملا ہی نہیں۔"

"پھر کیسے آئیں گھر؟" اس نے سوال پوچھتے ہوئے سلمان کو دیکھا۔
"ایک شاپ کے باہر بیٹھی تھیں۔"
"تھک گئی تو ایک جگہ ٹھہر کر تم سب کے فون نمبر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر کسی کا نمبر کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا تو کیسے یاد آتا۔" وہ نڈھال سی لگ رہی تھیں۔
"شانو! اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ امی کبھی فون نہ بھولیں اور امی آپ بھی پلیز کسی ایک کا فون نمبر تو یاد کرلیں۔" دونوں نے اس کی بات پر سر ہلایا۔
"امی نام اور برتھ ڈیٹس کے ساتھ ساتھ اب راستہ بھی بھولنے لگی ہیں۔" سلمان ہنسا۔
"میں راستہ بھولی نہیں تھی بس بے خیالی میں کہیں اور نکل گئی تھی۔" انہوں نے یقین سے کہا۔
"آپ کوشش کریں کہ چاچی کے ساتھ جایا کریں۔" منیب کا مشورہ معقول تھا۔
"یہ تو بس آج ہو گیا بیٹا! ہر دفعہ تھوڑی نہ ہوگا، ویسے شانو نے خوامخواہ تمہیں بھی پریشان کردیا۔"
"خوامخواہ۔؟ اور کیا کرتی میں؟ ایک گھنٹہ بعد بھی آپ بھائی کو ملی نہیں تھیں۔"
"اب بس کریں سب۔" سلمان بھی کھڑا ہوا۔ "کھانا ہی دے دو اب کوئی بھوک لگی ہے۔"
"کھانا۔؟" شانو نے ماں کو دیکھا۔
"امی نے بازار سے آکر بنانا تھا۔"
"تمہیں وقت دیکھ کر بنا لینا چاہیے تھا ناں۔ امی آپ کب اسے کچن کی ذمہ داری دیں گی؟" وہ جھنجھلا گیا تھا۔ بھوک کا کچا تو ہمیشہ سے تھا اور بھاگ دوڑ نے تھکا بھی دیا تھا۔
"امتحان ہو جانے دو پھر کچن یہ ہی سنبھالے گی۔" قرۃ العین نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"میں دیکھتی ہوں۔"
"آپ رہنے دیں امی۔ میں کچھ آرڈر کردیتا ہوں۔" منیب نے انہیں روکا۔
"پزا منگوائیں بھائی۔" شانو نے دیر نہیں کی۔
"روٹی چاول جیسا کچھ کھانا منگواؤ ورنہ میں بنا لیتی ہوں۔" اندر جاتے ہوئے وہ رک کر پلٹیں۔
شانو نے برا سا منہ بنایا اور سلمان اور وہ مسکرا دیے۔ قرۃ العین کے کھانے کا مطلب روٹی چاول کے ساتھ گوشت سبزی اور دالیں تھا۔ ان کے علاوہ باقی چیزوں کو وہ 'کھانے' میں شمار نہیں کرتی تھیں۔
اس واقعے کے بعد سب کچھ معمول پر چل رہا تھا اتنا کہ قرۃ العین میں در آرہی تبدیلیوں کو بھی وہ معمولی ہی سمجھ رہے تھے جیسے منیب کا فون نمبر یاد کرتے وہ کوفت زدہ ہو جاتیں اور ابھی تک انہیں درست نمبر یاد نہیں ہو پایا تھا۔ وہ جب بھی انہیں نمبر سناتے ہوئے غلطی کرتیں وہ سب ہنس پڑتے۔
"امی! آپ کی اتنی لائق اولادیں ہیں پر اب لگتا ہے ہم سب پاپا پر گئے ہیں۔" سلمان کہتا۔
"میں بھی اپنی کلاس کی ٹاپر ہوا کرتی تھی، اب تو عمر کا تقاضا ہے۔"
ویک اینڈ پر اعظم میر آئے تو حسب عادت ان کے پیچھے گھر کے واقعات سنانے کے دوران شانو نے انہیں قرۃ العین کے راستہ بھٹکنے والی بات بھی سنائی اور وہ بھی بیوی کو چھیڑتے رہے۔
"بیگم! کسی دن ہمیں نہ بھول جانا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ان کی طرف جھکے اور قرۃ العین ہمیشہ کی طرح بری طرح شرما گئیں۔
"ہزار بار کہا ہے بچوں کا لحاظ کیا کریں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی، چہرے پر مصنوعی ناراضی سجائے اٹھ کر جانے لگیں۔
"بچوں کے رومانس کے دن ہیں، اب آپ کے نہیں۔" انہوں نے باورچی خانے میں جاتے جاتے کہا۔ پیچھے سے ان تینوں نے ہو ہو ہاہا کا غوغہ مچا دیا۔
اعظم میر معمول کی طرح اتوار کی رات واپس چلے گئے۔ اگلے دن چاچی آئیں اور قرۃ العین کو ہفتہ بھر پہلے کی بات یاد ہی نہیں آرہی تھی۔
"حد کرتی ہو قرۃ العین! تم بھی، تم نے ہی تو کہا تھا اگلے سنیچر کو نوروز جانا ہے تمہیں ڈور میٹ اور نئے تولیے وغیرہ لینے ہیں۔" انہوں نے دوکان کا نام

لے کر یاد دلانا چاہا۔

"ڈور میٹ اور تاول......" وہ الجھی سی سوچنے لگیں۔

"چلو، لے لوں گی۔" وہ جانے کے مقصد سے تیار ہو کر آئی تھیں اور اب اگر جانا منسوخ ہوتا تو ان کا بگڑا مزاج کئی ہفتوں تک ٹھیک نہیں ہوتا تھا، سو وہ جانے تیار ہو گئیں۔

☆☆☆

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" سلمان بڑی دیر سے فون اور ڈائری میں الجھا تھا۔

"امی کا ڈیلی حساب کتاب ٹیلی کر رہا ہوں، جو ٹیلی ہو نہیں رہا۔" اس نے کام جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"لاؤ، میں کر دوں۔"

"تم رہنے دو۔" قرۃ العین نے ٹوکا۔

"پچھلے کئی مہینوں بلکہ سال بھر سے یہ ہی کر رہا ہے مجھ سے ہوتا نہیں اب۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔ وہ یہ ہی ایک کام سلمان سے کرواتی تھیں۔

"امی! آپ نے کچھ تو غلط لکھا ہے۔" سلمان نے فون ایک طرف رکھ دیا۔

"شاید۔"

"چھوڑیں بھی اور اب ڈائریوں میں کون لکھتا ہے، دنیا بھر کی ایپس موجود ہیں جو خود ہی آدھے سے زیادہ کام کر لیتی ہیں۔"

"میں نے امی کو وہ بھی انسٹال کر کے دیں لیکن ان سے نہیں ہوا مینج۔"

"اب پاپا تھوڑی نا آپ سے حساب کتاب مانگتے ہیں جو آپ اتنا تردد کر رہی ہیں، نہیں ہو رہا تو جانے دیں۔"

"یہ تو میں اپنے لیے لکھتی تھی بیٹا۔"

"امی!" شانو پکارتے ہوئے اندر آئی۔ "آپ بھائی کی شادی کب کر رہی ہیں؟" وہ دھم سے صوفے پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اتنی اچانک یہ فرمائش؟" سلمان کی بھنویں

اونچی ہوئیں۔

"میری سہیلیاں پوچھتی ہیں مجھ سے اور میں پڑھ پڑھ کے اتنا پک گئی ہوں کہ کوئی ہنگامہ چاہیے مجھے۔"

"اس بار تمہارے پاپا آئیں تو یہ مسئلہ اور حل ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔" قرۃ العین مسکرائیں۔

اور وہ بھی مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب عروبہ کے متعلق گھر میں بتا دینے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ کزنز تھے پھر بھی دونوں نے یہ اب تک سب سے چھپا کے رکھا تھا۔

☆☆☆

اعظم میر عام طور پر جمعہ کی رات میں آتے تھے لیکن اس بار وہ سنیچر کے دن دوپہر تک پہنچ رہے تھے۔ شانو کی چھٹی تھی۔ سلمان دفتر اور وہ اپنے دفتر میں تھا۔

ایک بار پھر شانو نے اسے روتے ہوئے فون کیا اور وہ گھر پہنچا۔

قرۃ العین بھول گئی تھیں کہ انہوں نے کھیر کا برتن کم آنچ پر رکھا ہے جسے چند منٹ بعد بند کرنا تھا۔ جب پتیلی بمع کھیر کے جل کر سیاہ ہو گئی، دھواں اور بو سارے گھر میں بھر گیا تب پڑوسی نے اطلاعی گھنٹی بجا کر کہا کہ پچھلی کھڑکی سے سیاہ دھواں نکل رہا ہے۔ شانو اپنے کمرے میں بند تھی اور قرۃ العین بھی غسل کے بعد نماز ادا کر کے اپنے تئیں سب کام ختم کر کے کچھ دیر کے لیے لیٹیں تو ان آنکھ لگ گئی تھی۔ باورچی خانے کا حلیہ خاصا بگڑ گیا تھا۔

قرۃ العین یہ سوچ کر کانپ گئیں کہ اگر دودھ کی جگہ تیل یا گھی ہوتا تو!

انہوں نے کھیر بنائی تھی اور گرم پوریاں وہ کھانے سے ذرا پہلے تلنے کا ارادہ کیے تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ بھولنے کی عادت باورچی خانے میں کتنا شدید نقصان کروا سکتی تھی۔ سب کو ہی کچھ کھٹک رہا تھا۔ مثیب انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

جب ڈاکٹر نے سوال پوچھے اور کچھ سوچ کر قرۃ العین کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی جواب دیے تو خود ہی ششدر رہ گئے کہ یہ ایک دو دن نہیں بلکہ آہستہ آہستہ چند سالوں میں ان کے اندر کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ جس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی خود قرۃ العین نے بھی نہیں۔ چیزوں کے نام اور جان پہچان والوں کے نام جلد ان کے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ کتنی ہی سنجیدہ علامتیں تھیں جو ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی تھیں۔

ذہنی استعداد اور آگاہی جانچنے والے ٹیسٹ اور دماغ کے اسکین کے بعد ڈاکٹر نے اپنی تشخیص بیان کی تو کوئی بھی فوری ردعمل نہیں دے پایا۔ ڈاکٹر نے مرض مفصل بیان کیا اور قرۃ العین سن ہو گئیں۔ اعظم میر اور مثیب خود کو سنبھالے تھے لیکن 'الزائمر' کی اطلاع ان کے لیے بھی اتنی ہی پریشان کن تھی۔

☆☆☆

کمرے میں پانچ نفوس موجود تھے لیکن سناٹا ایسا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی بہ آسانی سنی جا سکتی تھی۔

"کچھ تو ہوتا ہوگا نا دوائیاں، سرجری کوئی تھیراپی؟" شانو نے پہل کی۔

"جب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے تو پھر یوں چپ کیوں ہو گئے ہیں سب؟" اس نے باری باری سب کو دیکھا۔ اس کے اکسانے پر بھی کسی نے منہ نہیں کھولا اور قرۃ العین رونے لگیں۔ سلمان نے چڑ کے بہن کے سر پر چپت لگائی اور ماں کی طرف اشارہ کیا۔

"اس لیے چپ تھے!" اس نے منہ کھولے بنا اپنی بات جتا دی تھی۔

"امی! اس میں رونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، اسے کیسے سنبھالا جا سکتا ہے۔"

"اور نہیں تو کیا، ہم سب ساتھ ہیں نا مل جل کر اسے آسان بنا ئیں گے۔" اعظم نے بیوی کا کاندھا تھپتھپا کر حوصلہ دیا۔

"کیسے کوئی بات نہیں ہے۔ میں کچھ دنوں میں سب بھول جاؤں گی، تم سب کے نام اور رشتے بھی، مجھ سے اپنے کام بھی مشکل سے ہوں گے، میری سوچنے سمجھنے فیصلہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی،

مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا اور۔" آگے ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"یہ سب مشکل نہیں ہے امی۔" اس نے رسان سے کہا۔

سب کا متفقہ فیصلہ اور پہلا اقدام قرۃ العین کو باورچی خانے کے کاموں سے چھٹی دینا تھا۔

گھر کے کام کے لیے آنے والی ملازمہ نے ایک پکانے والی خاتون کا انتظام کر دیا تھا جو صبح آ کر ان سب کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بنا کر چلی جاتی پھر شام میں آ کر رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ قرۃ العین نے سب کو سختی سے منع کیا تھا کہ ان کی بیماری یا حالت کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہا جائے۔ شانو کا زیادہ وقت پڑھائی میں گزرتا تھا لیکن اب اسے چائے بنانے تو کبھی کھانا گرم کرنے کے لیے باورچی خانے کے چکر لگانے پڑتے۔ قرۃ العین کے لیے اپنے ہی گھر میں یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بھی مشکل تھا۔ وہ خود حد درجہ محتاط ہو گئی تھیں۔

ذہین میں بار بار اپنے پیاروں کو یاد کرنے کی مشق کرتیں کہ وہ اس طرح کسی کو بھولے نہیں۔

باورچی خانے والے حادثے سے وہ خود بھی حد درجہ سہمی ہوئی تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ ایسا کچھ دوبارہ ہو۔ سارے گھر پر ایک عجیب سی سوگواری چھائی تھی۔ اعظم میر ہر ہفتے گھر آنے لگے تھے۔ وہ بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے متمنی تھے۔ جتنا بچا وقت تھا وہ اسے یادگار بنانا چاہتے تھے، اسے بھرپور طریقے سے جینا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے تو بڑے بڑے منصوبے تھے کہ ان کی سبکدوشی کے بعد انہیں سارا ملک اور پھر دنیا گھومنے جانا تھا۔ قرۃ العین جو دن میں ایک بار تو قریبی بازار جاتی تھیں اب گھر سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ اعظم میر گھر آتے تو رات انہیں چہل قدمی کو لے جاتے۔

بخار ہو، سر درد یا کوئی اور جسمانی تکلیف تو انسان کو بستر سے لگے رہنا برا نہیں لگتا۔ ایسے میں گھر والوں کا خیال رکھنا، فکر کرنا بھی طمانیت دیتا ہے لیکن یہاں کوئی جسمانی تکلیف نہ تھی، کوئی ذمہ داری بھی نہیں رہی تھی۔ وہ جو چند دن پہلے تک گھر کی مالکن تھیں، اپنے گھر کا سارا کاروبار سنبھال رہی تھیں، چھوٹی بڑی ہر بات اور چیز کا خیال رکھتی تھیں اب بالکل فارغ تھیں۔ انہیں اپنا آپ ناکارہ لگنے لگا تھا۔ اب وہ باتیں یاد نہ آنے پر جھنجھلا جاتی تھیں، انہیں اس بات پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ جسے پہلے عام سی بھلکڑ طبیعت سمجھ کر اہمیت نہیں دی تھی، اب وہ سب باتیں ان پر منفی طریقے سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اب اکثر وہ کبھی رونے لگتیں تو کبھی بے انتہا حساس ہو جاتیں، غصہ کرنے لگتیں۔ ان کا ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ان جیسی مضبوط عورت کچھ دن بعد اس قدر محتاج ہو جائے گی کہ اپنے بارے میں بھی سب بھول جائے گی۔

ملازمہ کے ہاتھوں کا کھانا وہ سب زہر مار کر رہے تھے۔ سلمان نے تو باہر ہی کھانا شروع کر دیا تھا۔ چاچی ملنے آتیں تو وہ بھی کرید کر گھر میں ہوئی تبدیلیوں کی وجہ پوچھتیں۔ سب کے پاس جواب میں باورچی خانے والا حادثہ ہی تھا اور وہ سب بچوں پر ڈال دیتیں کہ انہوں نے معمولی بات پر زبردستی ماں سے اس کا کچن چھین لیا ہے۔ نانی ملنے آئیں تو قرۃ العین ماں کے آگے ڈھے گئیں۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا، سارا گھر کیسے الٹا ہوا پڑا ہے، لگتا ہے کئی دن سے جالے بھی نہیں اتارے تم نے۔" وہ بیٹی کی نفاست پسندی سے واقف تھیں اس لیے حیرت اور سوال لازم تھا۔

"میں ٹھیک کہاں ہوں اماں! میں بیمار ہوں۔ میں آہستہ آہستہ سب بھول جاؤں گی، میں ایک جیتی جاگتی لاش ہو جاؤں گی۔ سب کے لیے، بوجھ، کسی کو پہچاننے کے قابل نہیں رہوں گی نہ کوئی جسمانی دماغی کام ہو گا مجھ سے۔" وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

"ہیں!" نانی حواس باختہ سی بیٹی کو روتے اور عجیب سی باتیں کرتے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہو قرۃ العین! پہلے رونا بند کرو۔"

پھر انہوں نے انگشت بدنداں بیٹی کی بات سنی۔

"یہ نسیان موا تو کسی کسی کو ساٹھ کے بعد ہوتا تھا، تمہیں کس لیے آ لگا؟ ہمارے خاندان میں تو دور دور ایسا کوئی ہوا نہیں، سب اللہ کے کرم سے آخری عمر تک ہوش حواس میں ہر بات اور یاد سے باخبر گزرے ہیں۔"

"میری ہی قسمت۔" انہیں خراب کہنا تھا لیکن لفظ نہ ذہن میں آیا نہ زبان پر۔

ہے اماں۔" انہوں نے یونہی جملہ مکمل کر لیا۔

نانی نے جب ملازمہ کے ہاتھ کا کھانا اور شانو کی بنائی چائے پی تو ان سب کی ایک مشکل آسان کر دی۔

"دیبا پکاتی اچھا ہے، میں اسے یہاں بھیج دیتی ہوں۔ وہ کچن سنبھالنے کے علاوہ تمہارے ہاتھ کے نیچے رہے گی۔"

ملازماؤں کے بجائے دیبا ان سب کی زیادہ فرماں بردار ملازمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ مان گئیں۔

اگلے دن ماموں دفتر جاتے ہوئے دیبا کو چھوڑ گئے۔ دیبا اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"صفائی اور برتن کے لیے۔" انہیں ملازمہ کا نام یاد نہیں آیا۔ حالاں کہ گھر میں سب اسے نام سے ہی بلاتے تھے۔

"ایک ماسی آتی ہے۔ تمہیں پکانا ہے اور ماسی سے ٹھیک طرح کام لینا ہے۔ باقی باتیں تمہیں منیب سمجھا دے گا۔"

آخر انہوں نے 'ماسی' سے کام چلا لیا۔ اکلوتی پھپھو کا رویہ بھی ان کے ساتھ روکھا اور لیا دیا سا ہی ہوتا تھا پھر بھی دادی، تایا تائی اور چاچا چاچی اور ان کی اولاد سے بہتر تھا۔ سال میں دو بارہ پھوپھی کی طرف سے ملنے والے کپڑے جوتے معیاری اور اچھے ہوتے تھے۔ وہ ہر عید پر اسے عیدی بھی دیتی تھیں لیکن بے تکلفی یا بات چیت نہیں تھی۔

منیب کو دیبا کی موجودگی اچھی نہیں لگی تھی لیکن رات میز دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑے دن بعد روٹی، چاول اور ایک سالن یا سبزی کی جگہ اہتمام سے کھانا چنا گیا تھا اور چکھنے کے بعد اسے بس ذائقہ یاد رہا دیا نہیں۔ سب نے ہی اس دن بڑے وقت بعد سیر ہو کر کھایا تھا۔

بیگ باورچی خانے میں ایک طرف رکھ کے وہ سارا دن کام میں مصروف رہی تھی۔ اس نے ملازمہ کے لیے برتن چھوڑنے کے بجائے خود ہی دھو لیے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ کسی نے اسے نہیں بتایا تھا اسے کہاں سونا ہے۔ اس کے لیے باورچی خانے کے علاوہ کوئی اور کونا ہے بھی یا نہیں۔

"پھپھو نے کہا تھا، منیب بھائی سب بتا دیں گے۔" وہ اتنی تھکی تھی کہ فرش پر بیٹھ کر پیچھے کیبنٹ سے پیٹھ ٹکا کر آنکھ بند کر لیں۔

"انہوں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ اگر مجھے یہیں سونا ہے تو بستر۔" اس نے آنکھیں کھول کر جائزہ لیا۔ وہ ایک طرف کچھ بچھا کر سو سکتی تھی لیکن بچھاتی کیا۔ اپنا دوپٹا یا کوئی جوڑا۔ اس نے چھپاتے فرش پر ہاتھ پھیرا جو چکنا اور سرد تھا۔

"اس پر کچھ بھی نہیں نکلے گا۔" تب ہی اس کا فون بجنے لگا۔

"السلام علیکم امی۔"

"سب ٹھیک ہے بیٹا! وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں؟"

"ہاں امی! سب ٹھیک ہے۔" ماں کی محبت ہی ایسی تھیں کہ ساری سچائی جانتے ہوئے بھی وہ یہ سوال پوچھے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

"میں بس سونے جا رہی تھی۔"

"اچھا اچھا۔" انہیں خوشی ہوئی ورنہ وہاں تو باورچی خانہ سمیٹتے ہوئے بارہ بج جاتے تھے۔

"کمرے میں ہو یا کہاں ہو؟"

"کمرے میں ہوں امی۔" ہم سب سے زیادہ جھوٹ ان ہی سے کہتے ہیں جنہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

"اچھا سو جاؤ بیٹا۔"

"آپ بھی جلدی سو جایئے گا۔"

"ہاں ہاں اللہ حافظ۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

اس نے پھر سر پیچھے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

اب امی وہاں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دونوں مل کر کام نپٹاتی تھیں تو آسانی تھی لیکن اب سارا بوجھ عابدہ پر آن پڑا تھا۔

مثیب کو ایک دم قدم روکنے پڑے۔ وہ دروازے سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب وہ کاؤنٹر کے پاس آیا تو وہ نظر آئی۔

وہ دیوار سے لگے کاؤنٹر کے دروازے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ اس نے کاٹن کا دوپٹا چادر کی طرح خود پر ڈال رکھا تھا۔ اس کا بیگ بھی قریب ہی تھا۔

اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی نے اس کا انتظام کیا ہے نہ اسے کچھ بتایا ہے۔ گھر کا کوئی سربراہ ہی نہیں رہا تھا۔ سلمان پہلے سے ہی گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ شانو پر پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔ آنے کے بعد کھانے کے لیے ہی کمرے سے نکلتی تھی۔ وہ اسے آواز دینے یا اٹھانے کے بجائے جس کام سے آیا تھا وہ کرنے لگا۔ اس کی نیند کچی تھی جو وہ لائٹر کی آواز پر ہی جاگ گئی اور اسے دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے دوپٹا بیگ پر ڈالا اور بیگ پیر سے ایک طرف کھسکایا۔ ایسی حرکتوں پر ڈانٹ ہی پڑا کرتی تھی۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" اس نے فریج سے دودھ کی پتیلی نکال کر سلیب پر رکھی تو دیا نے کہا۔

"کوریڈور کے لیفٹ میں براؤن دروازے والا کمرہ خالی ہے۔ اپنا سامان وہاں رکھ دو۔" اس نے اس کی بات ان سنی کر کے شکر اور پتی کے ڈبے نکالتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر اگلے حکم کی منتظر رہی لیکن وہ یوں چائے بنانے لگا جیسے وہاں تنہا ہو۔ دیا نے جھک کر بیگ اور اس پر پڑا دوپٹا اٹھایا۔

مثیب نے اوپر والا کیبنٹ کھول کر کوکیز کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سے دو کوکیز نکال کر چھوٹی طشتری میں رکھ کر ڈبہ واپس رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی پھر اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اس کا بتایا کمرہ رقبے کے اعتبار سے واقعی کمرہ تھا اسٹور نہیں لیکن وہاں کافی کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ پرانی کرسیاں ایک میز کے اوپر رکھی تھی۔ ایک طرف پرانی واشنگ مشین تھی اور اس کے اوپر دو بڑی بڑی گٹھڑیاں تھیں۔ وہاں پلنگ تھا اور اس پر بستر بھی بچھا تھا۔ اس نے بیگ ایک طرف رکھا اور بستر جھٹک کر لیٹ گئی۔

"آج میں جلدی سو رہی ہوں تو امی کو دیر ہوگی۔" وادی نوم میں گم ہونے سے پہلے اسے آخری خیال آیا تھا۔

☆☆☆

قرۃ العین کی پہلے دن والی بات کے علاوہ اسے کسی نے کوئی ہدایت دی تھی نہ اپنے کھانے پینے کے اوقات بتائے تھے۔ اس نے چند دن کے مشاہدے کے بعد خود ہی اندازہ لگا کر اس کے مطابق اپنا معمول بنا لیا تھا۔ قرۃ العین کی بیماری اور حالت اب راز نہیں رہی تھی۔ رشتے دار اور جان پہچان والے ٹن گن لینے کسی نہ کسی بہانے آتے رہتے۔ وہ دلاسا بھی اس انداز میں دیتے تھے کہ بیمار انسان کا حوصلہ مزید ٹوٹ جائے۔

کھانے میں کیا بنانا ہے کبھی قرۃ العین خود اسے بتا دیتیں۔ کبھی وہ خود ان سے پوچھ لیتی۔ اس کی تائی چاچی اور دادی ملنے آئیں تو عابدہ بھی ساتھ آئی تھیں لیکن یہاں بھی وہ مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ باورچی خانے میں اس کے ساتھ تھیں۔ ان کی حیثیت کا جو تعین شوہر کی وفات کے بعد طے ہوا تھا اس میں تبدیلی ناممکن تھی۔

اس نے انہیں اپنا کمرہ بھی دکھایا جس کی شکل اس نے اول دن کے مقابلے میں کافی سدھار لی تھی۔ عابدہ بیٹی کے لیے خوش تھیں۔

اسے فجر کے وقت جاگنے کی عادت تھی۔ یہاں بھی وہ نماز کے بعد کام پر لگ جاتی۔ سب سے پہلے سلمان جاتا تھا۔ وہ گھر والوں کے جاگنے سے پہلے ناشتے کے لیے موجود ہوتا۔ ناشتہ بھی آملیٹ پراٹھے کے ساتھ یا چائے پراٹھا۔ پھر شانو اور قرۃ العین ایک ساتھ ناشتہ کرتیں۔ مثیب کبھی ان کے ساتھ ہوتا اور

کبھی ان کے بعد آتا۔

رات کا کھانا سب ایک ساتھ میں کھاتے تھے سوائے مثیب کے۔ وہ دیر رات گھر آتا تھا اور اس کے انتظار میں وہ باورچی خانے میں اونگھتی رہتی۔ دوپہر کے وقت شانو اور قرۃ العین ہوتیں اور جب اعظم میر آئے ہوتے تو وہ بھی۔

چھٹی والے دن سارا گھر تینوں وقت ایک ساتھ میز پر موجود ہوتا تھا۔

مثیب اور سلمان میں ڈیڑھ سال کا فرق تھا جب کہ شانو سلمان سے دس سال چھوٹی تھی۔ ان سب میں مثیب اور اعظم میر ہی تھے جو کھانے کے اوقات کے علاوہ بھی باورچی خانے میں آجاتے تھے۔ مثیب اپنے لیے چائے، کافی خود بنا لیتا تھا۔ وہ باقیوں کی طرح اسے کبھی کوئی کام نہیں کہتا تھا۔

قرۃ العین، غائب دماغی اور وقتاً فوقتاً مخصوص لفظ، نام اور تاریخیں بھولنے کی عادت کے علاوہ وہ عام صحت مند انسان دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اپنی دیورانی اور بھابھیوں کے کریدتے سوال اور ہمدردیوں کو بھی تحمل سے سنبھال رہی تھیں۔ ان کے سامنے وہ ایسے ہی پیش آتیں جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو۔ گھر میں ملازمین کی نگرانی کے لیے اپنے طور پر کڑی نظر رکھی تھی کہ کوئی ان کی غفلت کا فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی ذہنی الجھن اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت کمزور پڑ رہی تھی۔

وہ گھر کا ایک کونہ پکڑ کر بیٹھنا نہیں چاہتی تھیں لیکن گزشتہ حادثوں نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس لیے اب وہ محتاط تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی کیفیت اور بیماری کے لیے ان کی قبولیت کا درجہ بڑھ رہا تھا۔ بے یقینی، دکھ، اللہ سے شکایت اور میں ہی کیوں اور یہ ہی کیوں سے آگے بڑھ کر وہ اپنے اور گھر والوں کے لیے آسانیوں کا سوچنے لگی تھیں۔

جب تک ذہن اور یادداشت ساتھ تھی، سوچنا سمجھنا ممکن تھا، وہ اسے ماتم اور افسردگی کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کمرہ بند کر کے سب سے چھپ کر بیٹھنے اور رونے کے بعد وہ نئے عزم کے ساتھ اپنی بیماری کے ساتھ جینے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔

آج وہ بڑے دن بعد شانو کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ شانو کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہی تھی۔ کچھ دن پہلے کی بات ہوتی تو وہ اس 'وقت بربادی' کے لیے کبھی ان کے آگے نہ بیٹھتی مگر اب اسے احساس تھا وقت سب کا قیمتی ہے۔

قرۃ العین نے جب چوٹی گوندھنا شروع کی تو ٹھہر گئیں۔ بالوں کے تین حصوں کو کیسے چوٹی کی شکل دیتے ہیں، انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ ہاتھ روکے رہی۔ شانو کو احساس ہوا تو وہ جو اونچی آواز میں رٹے لگا رہی تھی، اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔

''میں کچھ لگا لوں گی امی۔'' اس نے دبی سی آواز میں کہا اور خاموش آنسو بہاتی قرۃ العین کی آواز اونچی ہو گئی۔

دیبا باورچی خانے سے دوڑتی باہر آئی اور دور ہی رک گئی۔

''امی!'' شانو ماں کی سمت مڑی۔

''میں یہ صورت نہیں پہچان سکوں گی۔'' انہوں نے تیل سے چپچپے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

''لیکن شانو۔'' آنسو روکتے ہوئے انہوں لہجہ مضبوط کیا۔ ''تم ہمیشہ یاد رکھنا، تم میری پیاری بیٹی ہو، مجھے بہت عزیز تمہاری ماں نے بہت پیار کیا ہے تمہیں، ہمیشہ کرتی رہے گی، کوئی بیماری اس سچ کو نہیں بدل سکتی میری جان۔'' انہوں نے ایک ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔

''امی!'' شانو بھی رونے لگی۔ سلمان اور مثیب ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ باہر آوازیں سن کر انہوں نے دوڑ لگائی تھی۔

''کیا ہوا؟'' مثیب قرۃ العین کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے شانو کا چہرہ چھوڑا اور اسے حسرت سے دیکھنے لگیں۔

''تم بھی یاد رکھنا۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرا ہاتھ اٹھایا۔

"سلمان۔" آگے آ کر سلمان نے ان کے ہاتھ تھامے اور ان کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

"میں سب بھول جاؤں لیکن تم یاد رکھنا، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی، میری ممتا میری دعائیں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی، مجھ سے تو تصور بھی نہیں ہوتا کہ میری آنکھوں میں تمہارے لیے اجنبیت اترے گی۔" وہ رک گئیں۔

"امی!" کافی لمحے ان کے بولنے کا انتظار ختم نہ ہوا تو منیب نے پکارا۔

"کیا کہہ رہی تھی میں۔" وہ الجھی سی اسے دیکھنے لگیں۔ منیب کا دل جیسے کسی ٹرک کے نیچے کچلا گیا۔ شانو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبایا۔ سلمان کی گرفت ماں کے ہاتھ پر مضبوط ہو گئی۔ اس پل وہ سب وقت کی ریت کے مٹھی سے پھسلنے کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ دیبا بھی ساکت سی اپنے ذہن میں سامنے کے منظر کا حصہ بن گئی تھی۔

"آپ شانو سے کمرے میں جا کر پڑھنے کا کہہ رہی تھیں۔" منیب نے آواز پر قابو پا کر کہا۔

"جا رہی ہوں میں۔" قرۃ العین اس کا چہرہ دیکھیں اس سے پہلے ہی وہ اپنی نوٹس اٹھا کر اندر چلی گئی۔

"مجھے بھوک لگی ہے، کھانا بن گیا؟" انہوں نے سامنے کھڑی دیبا سے پوچھا۔ سلمان اور منیب بھی اسے دیکھنے لگے۔

"جی۔ ابھی نہیں بنا۔ کک۔ کچھ دیر لگے گی۔" وہ ہکلائی۔ ذرا دیر پہلے انہوں نے کہا تھا آٹھ بجے پکانا شروع کرنا تاکہ سب ایک ساتھ کھانے بیٹھیں تو کھانا گرم ہو۔

"بہت غیر ذمہ دار ہو، کیسے گھر سنبھالو گی۔ جاؤ جلدی کرو۔ یہ دونوں بھی بھوکے ہوں گے۔" ان کا لہجہ تیز اور حاکمانہ تھا۔

"جی۔" وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

دادی اور ممانی کو کھانے کا ضیاع سخت ناپسند تھا پھر وہاں کوئی ایک وقت کے بچے کھانے کو دوسرے وقت ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہاں بھی چند دن کے بعد اسے میزان سمجھ میں آ گیا تھا اور وہ کھانا اتنی مقدار میں ہی بناتی تھی کہ بچے نہیں۔

اس نے پیاز ٹماٹر نکالے اور ٹماٹر دھو کر پلٹی تھی کہ منیب اندر آیا۔

"ایسے وقت میں وہی جواب دیا کرو جس کی امی توقع کر رہی ہوں۔"

اسے بات سمجھ میں نہیں آئی اور یہ ناسمجھی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی چپ پر منیب نے اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، وہ بات نہ کیا کرو جس سے ان کا موڈ بگڑے یا ٹینشن ہو جیسے ابھی کہہ دیا ہوتا کہ ہاں کھانا بن گیا ہے۔"

"اور۔ اگر وہ۔ ابھی مانگ لیتیں تو؟" اسی خوف نے اس سے سچ کہلوایا تھا۔

"دوپہر کا دے دیتیں۔"

"دوپہر کا کچھ بچا ہی نہیں ہے۔" اس کا انداز اقبال جرم کرنے سا تھا۔ منیب نے بس ایک نظر اس پر ڈالی اور چپ ہو گیا۔

☆☆☆

انہیں بھی بیشتر عورتوں کی طرح گھر کے آرائشی سامان اور باورچی خانے کے لیے خوبصورت اور یکتا برتن اور کٹلری اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ اب جب بھی وہ باورچی خانے میں کیبنٹ کھول کر اپنے برتن دیکھتیں افسردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیے یہ خیال بڑا جان لیوا تھا کہ جب انہیں یاد نہیں رہے گا تو ان کا یہ خزانہ کس حال میں ہو گا۔ وہ ان چیزوں کے گم ہونے اور ٹوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

اس وقت بھی وہ سامنے رکھی ترکش ڈیزائن کی پلیٹ پر احتیاط اور پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اندر آئی دیبا انہیں دیکھ کر رک گئی۔

"ادھر آؤ۔" انہوں نے اسے دیکھ کر کہا اور میز سے پلیٹ اٹھا کر کیبنٹ کے پاس آ گئیں۔

"یہاں جو برتن ہیں، یہ کسی خاص مہمان اور دعوت پر ہی نکالا کرو اور انہیں فوراً دھو کر خشک کر کے

رکھ دیا کرو۔ یہ سب میں نے بڑے جتن اور محنت سے جمع کیے ہیں، کہاں کہاں سے نہیں منگوائے تھے۔" انہوں نے پلیٹ احتیاط سے اندر رکھی۔

"جب بھی نکالو، مکمل سیٹ ایک ساتھ نکالنا یہ نہیں کہ پلیٹیں ایک ڈیزائن اور باول دوسرے کلر اور ڈیزائن والے، ادھر جو گولڈن کٹلری ہے، اسے دھونے کے لیے عام کچن بار یا لیکوڈ یوز نہیں کرتے۔" وہ کہتے ہوئے ایک دم رک گئیں۔

انہیں احساس ہوا کہ وہ کن چیزوں کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہیں۔ جب کہ وہ مستقبل قریب میں خود فراموشی تک پہنچ جائیں گی۔ ان کا انداز ایک دم ڈھیلا ہو گیا۔ انہوں نے کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور چلی گئیں۔ دریا ششدر سی وہیں کھڑی تھی۔

قرۃ العین نے کمرے میں پہنچ کر آنکھیں رگڑیں۔ وہ کیا کرتیں انہیں اپنی گرہستی کی معمولی اور چھوٹی سی بات کی بھی فکر تھی۔ انہوں نے یہ سنسار چٹکیوں میں نہیں سجایا بنایا تھا۔ گھر کے مکینوں کے ساتھ انہیں ان در و دیوار اور ان میں موجود ہر چیز سے پیار تھا۔ انہیں اپنے بعد انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی فکر تھی لیکن اس پل انہیں ان بے جان چیزوں کے لیے اپنی فکر نادم کر رہی تھی کہ جب وہ شوہر اور بچوں کو نہیں پہچان سکیں گی تو یہ چیزیں کیا معنی رکھتی ہیں۔

وہ نڈھال سی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ آنسو خاموشی سے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ اپنی بے بسی قبول کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر کبھی تو وہ چپ چاپ روتی رہتیں اور کبھی ان کا دل کرتا خوب چیخیں چلائیں، سب تہس نہس کر دیں۔

☆☆☆

"اعظم!" انہوں نے دھیرے سے پکارا۔ وہ انہیں اکیلے میں ہی نام سے بلاتی تھیں۔

"ہمم۔" انہوں نے ان کی سمت کروٹ لی۔

"آپ کو پتا ہے، مجھے سب سے زیادہ ڈر کس بات کا ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کس بات کا؟"

"میں بھلے سب بھول جاؤں، کسی کو پہچانوں نہ لیکن اگر میں نے کسی پرانی، کسی آدھی ادھوری یاد یا بات سے آپ سب کا دل دکھا دیا تو؟" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ ایسے مریضوں کو کبھی کبھی کچھ بھی یاد آجاتا کہ وہ ان پریڈیکٹیبل ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی اپنی فیملی کے لیے شرمندگی کا باعث بھی۔"

"ایک بات کا یقین رکھو ہم میں سے کوئی بھی کبھی تمہاری وجہ سے شرمندہ نہیں ہو سکتا چاہے کچھ جائے اس لیے ایسا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں وہ آدھی ادھوری بات اور یاد ہوگی اور پھر ماضی میں تو ایسا بہت کچھ ہوا ہوتا ہے جو آگے اہمیت کھو دیتا ہے۔ ویسے تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"میں اس کے بارے میں سرچ کر رہی تھی تو۔"

"تم یہ سب نہ کرو پلیز۔" انہوں نے لجاجت سے کہا۔ "اس طرح تم پریشان اور فکر مند ہوگی جو اچھی بات نہیں۔ ہم سب ہیں ناں۔ تمہیں خود سب علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جو وقت ہے سب کے ساتھ اسے انجوائے کرو اور آگے کیا ہوگا نہ سوچو۔"

"کیسے نہ سوچوں؟" وہ رونے لگیں۔ "اس کے علاوہ میرے دماغ میں اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔" انہیں اس بارے میں سوچنے سے روکنا بھی زیادتی تھی۔

"تمہاری کسی بات سے ہمیں دکھ پہنچے گا یہ خیال تو ذہن سے نکال سکتی ہو ناں؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر بچوں کے سامنے تم نے خدانخواستہ ایسا کچھ کہہ بھی دیا تو میرا وعدہ ہے میں سنبھال لوں گا، انہیں دکھی نہیں ہونے دوں گا میں ہر اچھی بری سچویشن ہینڈل کر سکتا ہوں، اتنا تو یقین ہے رکھو۔"

"اور آپ؟"

"مجھے تمہاری کس بات یا انکشاف سے تکلیف ہوگی بھلا؟ ہم تو کبھی روایتی میاں بیوی نہیں رہے۔" وہ مسکرائے۔

"اتنے برسوں کی رفاقت کے بعد تمہیں کم از کم

میرے لیے قطعی پریشان اور فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ سچ تھا۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی ایک ہی محلے میں گزارنے کے بعد ان کی 'ارینج میرج' بہت خاص تھی۔ قرۃ العین نے ان کے بازو پر سر ٹکا دیا۔

"یہ ہی ایک بات مجھے پاگل نہیں ہونے دیتی کہ میرے ساتھ آپ ہیں، میرے بعد آپ ہیں۔"

"بعد اور پہلے نہیں ہم ہر حال میں ساتھ ہیں عینی!" انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اور تم اتنا آگے کا کیوں سوچ رہی ہو، یہ تبدیلیاں بہت سلو ہوتی ہیں ابھی بہت وقت ہے ہمارے پاس۔"

لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ قرۃ العین کی دماغی صحت بڑی تیزی سے روبہ زوال تھی۔ ان کی بیماری اور ذہنی انحطاط کی رفتار تیز تھی۔

☆☆☆

اول دن تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے جب اس نے باورچی خانے میں قرۃ العین کو دیکھا۔ ہر سو چائے کی خوشبو پھیلی تھی۔ ایک طرف دودھ کا برتن ڈھکا تھا، سلیب پر رکھی کڑھائی بتا رہی تھی کہ کھانا بھی بنا چکی ہیں۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا کھیرا مکمل کاٹ لینے کے بعد سلاد کی پلیٹ فریج میں رکھی اور سلیب صاف کرنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ آگے بڑھ کر معافی مانگے یا ان کے ہاتھ سے گیلا پونچھا لے لے۔ وہ سانس روکے کھڑی تھی کہ وہ ہاتھ دھو کر پلٹیں۔

"میں بچوں کو اٹھاتی ہوں تب تک تم روٹی بنا کر ناشتہ لگا دو۔" وہ مصروف انداز میں کہتی جانے لگی تھیں کہ اس کے پاس پہنچ کر رک گئیں۔

"تینوں کے ٹفن بھی ریڈی کر دینا۔ سلاد فریج میں ہے، سلمان بھنڈی نہیں کھاتا، اس کے لیے رات کا سالن رکھا تھا فریج میں۔" اس نے سر ہلایا اور ان کے باہر نکلتے ہی رکا سانس بحال کیا۔

وہ ماضی کا کوئی دن جی رہی تھیں جب ان کے بچے اسکول جاتے تھے۔ انہیں اب رات کو نیند بھی کم ہی آتی تھی اس لیے شاید وہ اتنی جلدی جاگ کر باورچی خانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ابھی گھر میں کوئی اور جاگا نہیں تھا۔ اچانک اسے خیال آیا، کہیں وہ بچوں کو جگانے نہ گئی ہوں، وہ فوراً باہر آئی۔ سب کے کمروں کے دروازے بند تھے اور کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"شاید کمرے میں جا کر سو گئی ہیں، اتنا کام جو کر لیا ہے۔" اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

وہ آٹا گوندھتے اور پھر پراٹھے بناتے ہوئے منتظر رہی کہ وہ دوبارہ آئیں گی لیکن وہ نہیں آئیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لیے چائے نکالی اور پہلا گھونٹ لیتے ہی تھم گئی۔ چائے میں چینی نہیں تھی۔ جیسے تیسے وہ گھونٹ معدے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کڑھائی کا ڈھکن اٹھایا۔ سبزی کے نام پر کچھ تیل کی موجودگی کے ثبوت کے ساتھ وہاں پیاز اور بھنڈی تھی۔

اس نے چائے اور بھنڈی کو 'درست' کیا اور پھر چائے کا کپ لیے اپنی مخصوص جگہ بیٹھ گئی۔ کیبنٹ سے ٹیک کر آزادی سے سامنے پیر لمبے کرنے کی عیاشی اسے اب پسند آنے لگی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ جہاں وہ کام کرتی ہے، اس کمرے میں اسے مکمل آزادی میسر ہے۔ دادی کے گھر کی طرح ان ماں بیٹی پر نظر رکھنے کو کوئی نہ کوئی آنہیں دھمکتا۔ یہاں چینی اور گھی کے ڈبے دیکھ کر تنبیہ کی جاتی تھی۔ یہاں اس کے لیے ستانے کا وقت اور جگہ تھی۔

"امی کو آج پھر اکیلے سب کا ناشتہ بنانا پڑے گا۔" چائے کے دو گھونٹ بھرنے تک ہی اس کا فرحت بخش احساس قائم رہ پایا تھا۔ اس گھر میں آنے کے بعد جہاں وہ اپنی موجودہ صورت حال میں ذرا سا خوش ہوتی فوراً ہی ماں کا خیال اسے شرمندہ و رنجیدہ کر دیتا۔ اسے یہاں مل رہی رعایت اور آزادی نادم کرنے لگتی کہ عابدہ تو اب بھی اسی جگہ تھیں۔ تیسرے گھونٹ کے ساتھ آنسو گال پر لڑھک آیا۔

وہ دروازے سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب

بھی جب وہ آئی لینڈ کاؤنٹر کے آگے آیا تو اس پر نظر پڑی۔ وہ آہٹ پر ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرا کے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا کہ کہیں اس سے غلطی تو نہیں ہوگئی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ منیب آج جلدی اٹھ گیا تھا اور اپنے تئیں وہ خود ہی اپنا ناشتہ بنانے باورچی خانے میں آیا تھا۔ اس کی موجودگی اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔ کاؤنٹر اور چولھے پر دھرے برتن دیکھ کر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''چائے دینا۔'' اس نے اپنا کپ رکھ کر چولھا جلایا۔ آج پہلی بار اس نے چائے مانگی تھی ورنہ وہ اس کی موجودگی میں بھی خود ہی بنا لیتا تھا۔

''پہلے تم پی لو۔'' اس نے یوں سر ہلایا گویا کہہ رہی ہو پی لی۔

''ٹفن کوئی نہیں لے جاتا، اس لیے اتنی صبح صبح اٹھ کر کھانا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے کہنے کا انداز اگر مختلف ہوتا تو یہ جملہ حساس بندے کی پروا اور مروت ظاہر کرنے والا تھا۔ دیبا بھی اپنی سچائی سے اس قدر باخبر تھی کہ کبھی غلطی سے بھی کوئی بات یا جملہ اسے التفات نہیں لگتا تھا۔

چائے چھانتے ہوئے وہ آج کا واقعہ اس کے گوش گزار کرے یا نہیں اس شش و پنج میں تھی۔ چند پل بعد اس نے چائے کا کپ اور طشتری میں کوکیز میز پر رکھیں۔ منیب کوکیز دیکھ کر چونکا تھا۔

''اسے کیسے علم ہوا؟ شاید امی یا شانو نے کہا ہوگا۔'' اپنے قیاس پر اس کا اپنا یقین ہی ڈھل مل تھا۔

''میں کچن میں آئی تو اس سے پہلے ہی پھپھو یہاں موجود تھیں۔ انہوں نے چائے اور سبزی بنا لی تھی، سلاد کاٹ کر فریج میں رکھا ہے اور مجھے سب کے ٹفن کے لیے روٹی بنانے کی ہدایت دے کر گئی ہیں۔'' اس نے کپ واپس رکھ دیا۔ وہ اپنی الجھی سوچ کے ساتھ دیبا کو دیکھے جا رہا تھا۔

''ابھی کہاں ہیں امی؟'' خیالات کی یورش کے بیچ اس نے غائب دماغی سے سوال داغا۔

''شاید کمرے میں ہیں۔'' وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکلا۔

بنا آہٹ کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ سامنے بستر پر سو رہی تھیں۔ وہ سست قدم اٹھاتا پاس آیا اور ان پر لحاف ڈال کر کنارے بیٹھ گیا۔

عجیب سی بے بسی میں لپٹا دکھ اس کے اندر ٹھہر گیا تھا۔ ہر گزرتی ساعت ان کے درمیان اجنبیت اور فاصلہ پیدا کر رہی تھی۔ وہ پل سوچ کر ہی اس کا سانس رکنے لگتا تھا جب ان کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق بھی نہ ہوگی۔

☆☆☆

اس رات کھانے کے بعد جب وہ باورچی خانہ سمیٹ رہی تھی تو ایک بار پھر منیب چلا آیا۔

''اب سے ماچس، لائٹر، نائف جیسی چیزوں کو ایسی جگہ رکھا کرو جہاں وہ امی کو نہ ملیں، گیس ہمیشہ سوئچ آف کروا دو۔'' ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے اس نے فریج پر لگے پھلوں کی شکل کے میگنیٹ کوڑے دان میں پھینک دیے۔

''کچن اور کوریڈور کی لائٹس آن ہی رہنے دیا کرو، اس کے علاوہ۔'' وہ قرۃ العین کے ڈاکٹر سے مل کر آیا تھا اور اب اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اسے بھی سمجھا رہا تھا۔

قرۃ العین کی نیند کم ہوگئی تھی۔ انہیں رات میں نیند نہیں آتی تھی اگر سو بھی جاتیں تو علی الصبح اٹھ جاتیں۔ سلمان اور شانو کی اپنی مصروفیت تھی اور جب بھی قرۃ العین کے کسی مسئلے پر بات ہوتی تو شانو پریشان ہو کر رونا شروع کر دیتی۔ منیب نے اب اس کے سامنے یہ ذکر چھیڑنا ہی بند کر دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ کمرے سے نکل کر لان میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ اچانک رونے لگی۔

''شانو!'' وہ اسی وقت آیا تھا۔

''کیا ہوا، رو کیوں رہی ہو؟''

''بھائی! میں نے کل پورا چیپٹر یاد کیا تھا، ابھی ریوائز کرنے بیٹھی تو لگ رہا ہے، پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ کیا میرا دماغ بھی امی جیسا ہو رہا ہے؟'' بات

قہقہہ لگا کر اڑانے والی تھی لیکن وہ بمشکل مسکرا سکا۔

"پاگل!" منیب نے اس نے سر پر چپت لگائی۔

"یہ بہانا نہیں چلے گا، محنت کرو۔ ڈاکٹر ایسے ہی نہیں بن جاتے۔" شانو نے منہ بنایا۔

"پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، اب ہی ہو رہا ہے میرے ساتھ اور الزائمر میں جینیٹکس اور فیملی ہسٹری بھی تو اہم رول پلے کرتی ہے۔"

"ہماری فیملی میں دور دور تک امی پہلی پیشنٹ ہیں اس لیے جینیٹکس اور فیملی ہسٹری کو اتنی اہمیت دینے اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے تم نے کبھی توجہ نہیں دی اب سوچ رہی ہو ورنہ پہلی بار میموررائز کیے آنسرز جلد بھول جاتے ہیں، وہ پکے کئی بار ریوائز کرنے پر ہی ہوتے ہیں۔" اس نے اسے اپنے طور پر مطمئن کر دیا تھا لیکن وہ اکثر اس قسم سے اندیشوں کا اظہار کرنے لگی تھی۔

سب ہی اپنے طور پر گوگل سرچ کر کے اپنی معلومات بڑھانے کے ساتھ ساتھ انجانے اندیشوں اور متوقع تبدیلیوں سے خوف زدہ تھے۔ وہ سب اپنے تئیں خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہے تھے۔

☆☆☆

قرۃ العین اب بھی رات میں یا علی الصبح اٹھ کر باورچی خانے جاتی تھیں۔ منیب اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھنے لگا تھا۔ اس کا کمرہ باورچی خانے سے قریب تھا۔

اس رات بھی وہ جاگ رہا تھا کہ گرنے کی آواز پر باہر نکلا۔ قرۃ العین باورچی خانے اور ڈرائنگ روم کی درمیانی راہداری کے اختتام پر بنی تین سیڑھیوں کا اندازہ نہیں کر پائیں یا پھر بھول گئی تھیں کہ وہاں سیڑھیاں ہیں۔ پیر غلط پڑا تو توازن بگڑا اور وہ فرش پر آ رہیں۔

کچھ پل بعد ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دیبا بھی باہر نکلی۔ انہیں زمین پر دیکھ کر وہ ان کی سمت دوڑی۔ اسے دیکھ کر منیب کو حیرت اور اطمینان دونوں نے گھیرا تھا۔ انہوں نے مل کر قرۃ العین کو اٹھایا۔

"کلائی سوج رہی ہے۔" انہیں صوفے پر بٹھانے کے بعد دیبا نے دھیرے سے کہا۔

"بہت درد بھی ہے۔" قرۃ العین کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ انہوں نے چہرہ فرش سے نہ ٹکرائے اس کوشش میں ہاتھ زمین پر ٹیکا تھا۔

"ابھی اسپتال چلتے ہیں امی۔" اس نے قرۃ العین کی کلائی دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پھپھو کی چادر لے آتی ہوں۔" وہ ان کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

اتنی رات گئے وہ انہیں اسپتال لے گئے۔ شانو یا سلمان کو اٹھانے کے بجائے اس نے دیبا کو ہی ساتھ لے لیا تھا۔ وہاں ایمرجنسی میں ایکس رے کے بعد فریکچر کی تصدیق ہوگئی۔ وہ ان کے ہاتھ پر پلاسٹر لگوا کر گھر آئے تب صبح کے ساڑھے چار ہو رہے تھے۔

"آپ چائے لیں گے؟" وہ دونوں نیم خوابیدہ سی قرۃ العین کو کمرے میں بستر پر سلا کر باہر نکلے تو آگے جا رہا منیب اس کی آواز پر پلٹا۔ اسے اس وقت چائے کی شدید طلب تھی۔ وہ تو جاگ رہا تھا مگر دیبا گرنے کی آواز پر نیند سے اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اس کے سلوٹ زدہ کپڑے اور ڈھیلی سی چوٹی سے نکل کر ادھر ادھر بکھرے بال اس کے گواہ تھے تاہم اس وقت وہ نیند غائب تھی جو اسپتال جانے سے پہلے اس کے چہرے پر بکھری تھی۔

"ہمم۔" اس نے کہا اور دیبا سے پہلے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ وہ پیچھے کرسی پر بیٹھا تھا اور دیبا اس کی موجودگی میں چائے بناتے ہوئے حد درجہ زود حس اور گھبرائی سی تھی۔ منیب کے فون کی بیٹری ڈیڈ ہوگئی تھی، اس لیے وہ ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔

اس کے سامنے چائے کا کپ اور کوکیز کی طشتری رکھ کر وہ جانے لگی تھی کہ منیب بولا۔

"تمہاری چائے؟" یہ قطعی غیر متوقع سوال تھا۔ وہ مضطرب سی کھڑی رہ گئی۔

"تم نے اپنے لیے نہیں بنائی؟" اس نے

سادگی سے پوچھا۔

"بنائی ہے۔" وہ منمنائی۔

"تو بیٹھ کر پی لو۔" اس نے اپنا کپ اٹھایا۔

وہ سست سے قدم اٹھاتی واپس چولھے کے پاس آئی اور کپ میں اپنے لیے چائے نکال کر کپ لیے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ منیب نے کوکیز والی طشتری اس کے آگے کی۔ اسے خواہش تھی یا نہیں اس سے قطع نظر وہ اس پیشکش کو ٹھکرانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے یہ ہی جتایا گیا تھا اس پر کی جانے والی ہر مہربانی اسے سر جھکا کر قبول کرنی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے ایک کوکی اٹھائی۔ منیب نے ایک نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے چائے کے گھونٹ بھر کے کپ خالی کیا۔

"تھینک یو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور دیبا نے جھٹکے سے حیران آنکھیں اٹھائیں۔ اس میں شکریے کی کیا بات تھی۔ وہ تو اسی لیے یہاں بھیجی گئی تھی۔ منیب نے اس کی بے ساختہ حرکت اور حیرت محسوس کی۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ دیبا نے ہاتھ میں پکڑی کوکی کو دیکھا پھر منیب کے خالی کپ کو اور زیرِ لب بڑبڑائی۔

"تھینک یو۔"

☆☆☆

اس کے بعد جب تک ان کا پلاسٹر نہیں نکلا، قرۃ العین کے سارے کام دیبا کے ذمہ ہو گئے تھے۔ ان کا منہ دھلانے سے لے کر کپڑے تبدیل کرنا، بال بنانا سب کچھ۔ قرۃ العین کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ تحکمانہ اور سرد نہیں رہا تھا۔ انہیں ہر ایک کام کے لیے دوسرے کی محتاجی بھی جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تو بھی عاجز ہی تھیں۔ کبھی وہ تنے چہرے کے ساتھ اس سے کام کرواتیں تو کبھی ان کے انداز میں نرمی اور شفقت ہوتی۔

شانو کے امتحان بھی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد 'نیٹ' (میڈیکل کے لیے لازمی انٹری ٹیسٹ) سے فارغ ہوئی تو ماں کے کام وہ بھی کرنے لگی۔ کبھی وہ اسے کرنے دیتیں اور کبھی بضد ہوتیں کہ دیبا ہی کرے گی۔ جب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا یا کچھ کرتے یا سوچتے ہوئے وہ الجھ جاتیں تو رونے لگتیں۔

"یہ سب کیا ہونے لگا ہے میرے ساتھ؟"

"کچھ بھی تو نہیں پھپھو۔ سب کچھ تو ٹھیک ہے۔" وہ ان کے کمرے کے پردے بدل رہی تھی جب الماری کھول کر کھڑی قرۃ العین کو کوشش کے باوجود یاد نہیں آیا کہ انہیں اندر سے کیا چاہیے تھا۔

"آپ نے یہ پردے نکال کر دیے ہیں مجھے لگانے کے لیے۔ اب الماری بند کر دیں۔" ان کے ہاتھ کا پلاسٹر ابھی نکلا نہیں تھا۔

"میں نے دیے ہیں؟" وہ الجھ کر دیکھنے لگیں۔

"جی۔" اس نے اتارے ہوئے پردے دونوں ہاتھوں سے سمیٹے۔

"اور آپ نے کہا ہے کہ اب اس گھر کو نئے پردوں کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔" انہوں نے کھڑکی پر جھول رہے میرون پردوں کو دیکھا۔

"چلو، ابھی چلتے ہیں مارکیٹ۔" وہ ایک دم تیار ہو گئیں۔

"تم شانو سے پوچھ لو اسے چلنا ہے تو اسے بھی ساتھ لے لو۔" وہ الماری سے اپنا پرس نکالنے لگیں۔

پھر شانو اور اس کے ساتھ مل کر انہوں نے سارے گھر کے لیے پردے کا کپڑا پسند کیا اور وہاں سے درزی کو لے کر گھر لوٹیں جو سب کھڑکیوں کے ناپ اور ڈیزائن لے کر گیا۔

"تمہارے کمرے کے پردے میں نے اس بار لائٹ بلیو لیے ہیں۔" رات کھانے کے دوران انہوں نے منیب سے کہا اور شانو نے پانی کا جگ میز پر رکھ رہی دیبا کو دیکھا۔ انہوں نے سب سے زیادہ وقت منیب کے کمرے کے پردوں کا رنگ منتخب کرنے میں لگایا تھا کہ اسے گہرے رنگ کے پردے پسند تھے۔ آخر میں انہوں نے گہرا سرمئی رنگ چنا تھا۔

"اچھا کیا کمرے کو چینج کی ضرورت تھی۔" اس نے بھی ماں کو خوش کرنے والا جملہ ادا کیا۔

وہ سب وقت کی چال سے قدم ملانا سیکھ گئے تھے۔ وہ اب قرۃ العین کی باتوں کی کھینچ تانچ یا اس سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

اس بار اعظم میر آئے تو دونوں باپ بیٹا بڑی دیر تک قرۃ العین اور گھر میں رونما ہو رہے واقعات پر تبادلہ خیال کرتے رہے اور آخر میں یہ طے ہوا کہ اب انہیں 'والینٹری ریٹائرمنٹ' لے کر ہمیشہ کے لیے گھر آجانا چاہیے۔ ان کی نوکری کے دو سال باقی تھے لیکن اب گھر کو اور قرۃ العین کو ان کی ضرورت تھی جو ہمیشہ ان کی پہلی ترجیح تھیں۔ وہ زیادہ وقت اپنی محبوب بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔

قرۃ العین کے گرنے اور فریکچر کے بعد سے ہی اعظم میر اس بات کو سوچ رہے تھے کہ قرۃ العین کے ساتھ کسی کا ہمہ وقت رہنا لازمی تھا۔ وہ رات کے کسی بھی پہر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی جاتیں تو کبھی اٹھ کر لان میں نکل جاتیں۔ گیٹ کو مقفل کر کے چابی کی جگہ بدل دی گئی تھی۔

"جب تک میں نہیں آجاتا، دیبا کو عینی کے کمرے میں سونے دو۔" اعظم کو اب انہیں کو تنہا چھوڑنا گوارا نہ تھا۔

"امی مانیں گی نہیں۔"

"میں کسی طرح منالوں گا۔ تم دیبا سے کہہ دو۔"

"امی مان جائیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

"ویسے دیبا نے گھر کو احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے، وہ نہ ہوتی تو پتا نہیں کیا بنتا اس گھر کا۔" ان کی آواز میں تشکر تھا۔

"کچن ہی تو دیکھنا ہوتا ہے، باقی کام کے لیے ماسیاں ہیں۔" اس کی نظر میں دیبا کا تعاون یا حصہ اتنا نہیں تھا جتنا اعظم میر اس کے ممنون ہو رہے تھے۔

"بیٹا! اس نے ہماری پسند ناپسند اور کھانے کے معاملے میں سب کی عادت اور طریقے کسی کی مدد کے بنا خوبی اور جلدی سے سمجھ لیے۔ بنا کسی بدمزگی اور چیخ و پکار کے اس قدر آسانی سے سب چلے گا مجھے یقین نہیں تھا۔ چند دن ہی کک کا پکایا کھایا تھا اور یاد ہے وہ ہفتہ، کچن کا کیا حال تھا گندے برتن، افراتفری۔ مشکل میں جو احساس کرائے بنا ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

"جی۔" ان کی آخری بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس کے تصور میں کوکیز کی طشتری گھوم گئی۔

اور یہ ان کی بات کا اثر تھا کہ وہ آج دروازے سے ہی دبے پاؤں اندر آیا۔ حسب معمول وہ اپنی جگہ بیٹھی اس کا انتظار کرتے ہوئے سر ٹکا کر سو رہی تھی۔ وہ اس کی آہٹ پر جاگ جاتی تھی۔ اسے ایک بار پھر اپنے پاپا کی بات یاد آئی۔

"مشکل میں جو احساس کرائے بنا ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

وہ بنا آواز کیے ہی اپنے لیے کھانا نکالنے کا سوچ رہا تھا لیکن وہ اس قدر حساس تھی کہ اس کی مسلسل نظر بھی اسے جگا گئی۔

"سوری!" وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔ مثیب پیچھے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے جب مثیب کے آگے میز پر کھانا رکھا تو اس نے اچانک سر اٹھایا۔

"آئندہ سے میرا ویٹ نہ کیا کرو، کچن کے کام ختم ہو جائیں تو کمرے میں سو جایا کرو۔" نیند سے بوجھل اس کی آنکھیں اور سوئے سوئے چہرے پر ایک دم پریشانی پھیل گئی۔

"سوری، بس ابھی آنکھ لگ گئی تھی، آئندہ نہیں سوؤں گی۔" اس کے انداز میں لجاجت تھی۔

"میں غصے سے نہیں کہہ رہا ہوں۔" اس کا ارادہ اتنی دیر تک اسے دیکھتے ہوئے بات کرنے کا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ اس بار اس کے سادہ لہجے میں ہلکی سی نرمی تھی۔

"مجھے کبھی کبھی بہت دیر ہو جاتی ہے اور تمہیں صبح جلد اٹھنا بھی ہوتا ہے۔ میں خود کھانا لے سکتا ہوں۔"

اس بار وہ چپ رہی۔ کھانا گرم کرنے کے بعد

اس کے سامنے رکھا تو منیب نے حکم دیا۔
"جاؤ سو جاؤ۔" اس نے توجہ پلیٹ پر مرکوز کی اور کھانے لگا۔
وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے کھانا کھانے کے بعد برتن دھو کر کمرے میں جاتی تھی۔ دیبا چند پل تعجب سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے جھوٹے برتنوں کا خیال آیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر سختی سے بند کر لیا۔ کیا پتا کس بات پر مزاج برہم ہو اور ڈانٹ پڑ جائے اس سے بہتر تھا چپ چاپ وہاں سے چلی جائے۔
بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے سوچا۔
"ویسے انہوں نے کبھی مجھے ڈانٹا نہیں ہے۔"

☆☆☆

اعظم میر جانے سے پہلے ان سے کہہ گئے تھے دیبا اب سے ان کے کمرے میں سوئے گی۔
قرۃ العین نے پہلے دن تو کچھ نہیں کہا۔ وہ ان کے کمرے میں دروازے کے آگے اپنا بستر لگا کر سو گئی تھی تاہم اگلے دن جب وہ اپنا مختصر بستر لے کر وہاں پہنچی تو وہ پچھلا دن بھول گئی تھیں۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" ان کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں نمایاں تھیں۔
"میں یہاں سونے آئی ہوں پھپو۔ کل بھی تو یہیں سوئی تھی۔" ان کے بدلے انداز پر وہ ڈر گئی۔
"تم کیوں سوؤ گی یہاں؟ تمہیں جگہ دی ہے نا سونے کی۔" وہ پلنگ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھیں، دیبا ایک طرف ہو گئی۔
"منیب!" انہوں نے باہر جا کر اونچی آواز میں پکارا۔ گھبرایا سا منیب گرتا پڑتا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ اب اپنے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رکھتا تھا۔
"یہ کیوں یہاں سونے آئی ہے؟" وہ قریب پہنچ کر کیا ہوا پوچھتا اس سے پہلے ہی انہوں نے سوال کیا۔
"پاپا نے کہا تھا امی۔"
"کیا کہا تھا؟"

"اس بار وہ آئے تھے تو آپ کئی بار رات میں نیند سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ پاپا تھے تو وہ جاگ جاتے تھے اور آپ کو دوبارہ بیڈ پر لے آتے تھے، ان کی ایبسینس میں انہوں نے دیبا کو آپ کے پاس سلانے کہا ہے۔" اس نے بات کرتے ہوئے ان کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھے تھے۔
"آپ آرام سے سوئیں۔ اگر نیند میں آپ باہر جانے لگیں گی تو دیبا آپ کو دوبارہ بیڈ تک لے آئے گی، بس اتنی سی بات ہے، آئیں۔" وہ انہیں لیے اندر آیا۔ دیبا دروازے کے پاس بستر سینے سے لگائے کھڑی تھی۔
"یوں سمجھیں، آپ کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں ہے، لیٹ جائیں۔" اس نے انہیں بستر پر بٹھا کر کہا۔ وہ لیٹ گئیں۔ منیب نے ان پر لحاف ڈالا۔
"اب آپ سو جائیں اور کچھ نہ سوچیں۔ پاپا نے کہا ہے ناں، وہ اب ہمیشہ کے لیے آ رہے ہیں تو بس کچھ دن ہی دیبا یہاں ہوگی۔"
"ہمم۔" وہ کبھی اس طرح فوراً آرام ہو جاتی تھیں اور کبھی کسی صورت سننے تیار نہ ہوتیں۔ اس نے بتی بجھا کر نائٹ بلب جلایا۔ پلٹا تو وہ یونہی سہمی سی کھڑی تھی۔
"سو جاؤ۔" باہر نکلنے سے پہلے اس نے نرمی سے کہا تھا۔ اس کی صورت پر ذرا ذرا سی بات پر بھی وہ سراسیمگی اور گھبراہٹ چھا جاتی تھی کہ اس کا لہجہ خود بخود ملائم ہونے لگا تھا۔
جانے وہ ان کے کمرے میں اس کی کون سی رات تھی جب اچانک انہوں نے پکارا۔
"بیا!" اس نے سنا لیکن سمجھ نہیں پائی۔ وہ اس کی سمت کروٹ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"بیا...... وہاں کیوں سوئی ہو؟ ادھر اوپر آ جاؤ، جگہ ہے یہاں۔" انہوں نے خود پیچھے دیوار کی طرف سرکتے ہوئے کنارے پر اس کے لیے جگہ بنائی۔
"آؤ۔" انہوں نے خالی جگہ پر ہاتھ رکھا۔ اسے ان کی بات ماننے اور سننے کا حکم تھا سو وہ اپنا تکیہ

اور دری ایک طرف چھوڑ کر، چادر لیے ان کے بازو میں لیٹ گئی۔

"یہ بیبا کون ہے؟" اس نے آنکھ بند کر کے سوچا۔

اس کے بعد قرۃ العین سے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ کروٹ بدلتے ہوئے آنکھ کھلنے پر اس سے مخاطب ہوئی تھیں اور اب پھر نیند میں ڈوبی تھیں۔

☆☆☆

دو مہینے بعد اعظم سبک دوش ہو کر گھر آ گئے۔

اس دوران قرۃ العین کو دیبا میں اپنی کزن اور سہیلی بیبا نظر آنے لگی تھی۔ اعظم کے آنے کے بعد گھر میں کچھ تبدیلیاں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ جس میں سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ دیبا کو اہمیت دیتے تھے، اس سے محض کام کی بات نہیں کرتے بلکہ اس کا احوال پوچھتے تھے اور ادھر کی غیر اہم بات بھی کر لیا کرتے۔ اس کی امی سے اس کی بات ہوئی ہے یا نہیں، وہ کیسی ہیں، وہ سب پوچھتے رہتے۔ اسے یاد اور پابندی سے سلمان، منیب کے ساتھ عابدہ سے ملنے دادی کے گھر بھیجتے تو کبھی عابدہ کو ادھر بلوا لیتے۔

جب وہ میز پر سب کچھ رکھ دینے کے بعد باہر جانے لگی تو انہوں نے پکارا۔

"تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"ابھی نہیں۔" وہ عشاء پڑھنے جا رہی تھی۔ ان سب کے کھانا کھا کر چلے جانے کے بعد وہ میز اور باورچی خانہ سمیٹنے کے بعد کھانا کھاتی تھی۔ یہ ہی اس کا معمول تھا۔

"تو بیٹھو، سب کے ساتھ ہی کھا لیا کرو۔"

وہ تو چونکی ہی ساتھ سب بھی لمحہ بھر کو رک گئے۔ یہ تو کبھی کسی نے سوچا نہ تھا وہ کب کھاتی ہے، کھاتی بھی ہے یا نہیں۔

"آؤ۔" قرۃ العین نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ شانو، سلمان، منیب سب مختلف تاثرات لیے دیکھ رہے تھے۔ وہ واحد خالی کرسی کھسکا کر اس پر بیٹھ گئی۔ بازو میں بیٹھے منیب نے درمیان سے خالی پلیٹ اٹھا کر اس کے آگے رکھی۔ شانو نے سالن کا پیالہ، اعظم میر نے روٹی والا ہاٹ پاٹ اور چاول باری باری اس کے قریب رکھے۔ وہ سب اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے تھے لیکن اسے بار بار آنکھیں صاف کرنا پڑ رہی تھیں۔

"ہمیشہ کی طرح سب کچھ مزے دار تھا بیٹا۔"

اعظم میر نے اسے دیکھا۔ وہ خفیف سا آگے جھک کر مسکرا دی۔ وہ یگانگت کے اظہار کا کوئی موقع نہیں گنواتے تھے۔

وہ سب ایک ساتھ ہی باورچی خانے سے نکلے تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا لیکن یہ اپنائیت اور عزت حاصل کرنے کا پہلا پہلا تجربہ اس کے ننھے سے دل کے لیے بڑا بھاری تھا۔ وہ بچپن سے آج تک اپنی امی کے ساتھ باورچی خانے کے فرش پر بیٹھ کر کھاتی آئی تھی۔ ناشتہ تو چلتے پھرتے ہوتا تھا۔ اس کی امی کو احتجاج کرنا آتا تھا نہ اپنا حق لینا تو وہ دوسرے سے اپنی عزت کیسے کرواتیں۔

جب میکے نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ انہیں بیوگی کے بعد بھی سسرال میں ہی رہنا ہے تو وہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ دنیا میں سر چھپانے کے لیے اس گھر کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے۔ انہوں نے اسے بھی اطاعت گزاری اور خاموشی کا ہی درس دیا تھا لیکن اسے رویے برے لگتے تھے اور ان کی خود غرضی اور مطلب پرستی زہر۔ اس کے اندر اپنی دبی کچلی ذات کا دکھ تھا لیکن اسے ان سب کے اظہار کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ تو کبھی اپنی ماں سے بھی نہیں کہتی تھی کہ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔

وہ زندگی میں پہلی بار ان کے ساتھ، ان کے اونچے مقام کے برابر بیٹھی تھی جن کے لیے وہ صبح سے شام تک مشقت کرتی تھی، جنہیں آرام پہنچانے کے لیے وہ بے آرام رہتی تھی اور اس پل اسے ادراک ہوا کہ یہی بدلہ اور معاوضہ تو اس کی خواہش تھا۔

اپنا ایئر پوڈ میز پر بھول چکا منیب واپس اندر آیا تو وہ جو دونوں ہاتھ سے چہرہ ڈھانپے رو رہی تھی آہٹ پر سٹپٹا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے یہ بھی نہیں

دیکھا تھا کہ کون آیا ہے۔ چہرے پر ہتھیلیاں پھیرتے ہوئے اس کا سر مزید جھک گیا تھا۔ اس کے پیچھے سے گزر کر مثیب نے ایئر پوڈ اٹھایا اور اس پر اچٹتی نظر ڈالتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شانو کا نتیجہ آیا تو بورڈ میں اس کے نمبر ٹھیک تھے لیکن 'نیٹ' میں نمبر اتنے نہیں ملے تھے کہ 'ایم بی بی ایس' میں داخلہ مل پاتا۔ اس نے ایک سال کا وقفہ لے کر دوبارہ 'نیٹ' دینے کا فیصلہ کیا۔

اس نے 'نیٹ' کے لیے باقاعدہ کوچنگ لی تھی مگر اب وہ دوسرے انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ مثیب نے ہامی بھر لی تھی کہ اگلے دن اس کا داخلہ کروا دے گا لیکن رات میں وہ اس کے پاس آئی۔

"مجھے پونا میں ایڈمیشن لینا ہے بھائی۔" اس کی بات پر سب ہی چونک گئے۔

"یہاں مل رہا ہے تو پھر کیوں۔"

"میں نے کہہ دیا مجھے پونا ہی جانا ہے وہاں انسٹیٹیوٹ کا ہاسٹل بھی ہے۔ میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ آپ بس میرے ساتھ چلیں، پرسوں جانا ہے۔"

"لیکن شانو۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! جانے کی تیاری کرو۔" اعظم میر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیٹی کو نرمی سے کہا۔ وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔

"پاپا! آپ بھی۔ یہاں بیسٹ انسٹیٹیوٹ ہے پونا سے بھی اچھا۔"

"بات اچھے برے کی نہیں ہے، شانو کو گھر سے بریک چاہیے۔"

ان کی بات میں اتنے الیے چھپے تھے کہ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس کی خواہش کے مطابق اسے پونہ میں داخلہ مل گیا تھا۔ اور وہ اپنا سامان لیے ہاسٹل رہنے چلی گئی۔ اس نے عجیب روٹھے اور پھولے منہ سے تیاری کی تھی۔ حالاں کہ وہ جا اپنی مرضی سے رہی تھی تاہم انداز یوں تھے جیسے زبردستی اسے بھیجا جا رہا ہو۔

قرۃ العین کا رویہ اس دوران معمول سا تھا۔ کبھی کہتیں سب چیزیں رکھ لو پھر کچھ دیر بعد کہتیں کہ دو دن میں واپس آنا ہے تو اتنا سامان کیوں؟ کبھی فکر مندی کا اظہار کرتیں، کبھی خوشی کا۔

بمشکل ایک ہفتہ ہوا ہوگا کہ پھر روتی شانو نے اسے فون کیا۔

"مجھے گھر لے چلیں بھائی! مجھے نہیں رہنا یہاں۔" اور وہ اسے سامان سمیت واپس لے آیا۔

"میری خود سمجھ میں نہیں آتا میں کیا چاہتی ہوں، گھر کا ماحول اتنا ڈپریسنگ ہو گیا ہے کہ بھاگ جانے کا دل کرتا تھا اور میں نے وہی کیا مگر وہاں ایک پل کو سکون نہیں ملا۔ مجھے بار بار یاد آتا رہا کہ میں کتنی بری بیٹی ہوں۔ مجھ سے امی کا اجنبی رویہ اور شناسائی سے خالی آنکھیں برداشت ہوتی ہیں نہ ان سے دور رہنا۔" اب وہ اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔

"شانو!" مثیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"امی وہی ہیں ہم سے پیار کرنے والی، ہم پر جان چھڑکنے والی۔ ان کی آنکھوں اور رویے کے پیچھے دیکھو۔ تمہیں سب کچھ ملے گا، ان کا دل وہی ہے ہماری فکروں اور انسیت سے بھرا بس یہ دماغ ہے جو دغا دے گیا اور اب یہ دن بہ دن ڈیٹوریٹ (انحطاط پذیر) ہو رہا ہے، امی بیمار ہیں، ہم سے دور یا ناراض یا اجنبی نہیں۔ میں نہیں کہوں گا کہ زبردستی ان کے ساتھ اور پاس رہو۔ جتنا تم ہینڈل کر سکتی ہو۔ اتنا ہی کرو، خود پر جبر نہ کرو لیکن امی کی محبت پر شک بھی نہ کرو، انہیں مریض کی طرح دیکھو، امی جو کہتی اور کرتی ہیں وہ اس مرض کی علامتیں ہیں ہماری امی کے جذبات نہیں۔ ان کے جذبات وہی ہیں جو ہم آج بھی ان کو دیکھ کر اور چھو کر اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔" اس کی آواز بھاری ہونے لگی تھی۔

"یہ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے بھائی؟ میں نے پڑھا ہے الزائمر تو لوگوں کو ساٹھ سال کے بعد ہوتا ہے، بہت ضعیفی میں پھر امی کو کیسے اتنی جلدی ہو گیا؟" ساری بردباری اور سمجھ داری کے باوجود یہ

سوال تو وہ خود سے بھی کرتا تھا۔

"ارلی آن سیٹ الزائمر تھرٹیز اور فورٹیز میں بھی ہو سکتا ہے امی تو اگلے سال پورے پچاس کی ہو جائیں گی۔ بس ہم نے ان کی علامتوں کو سنجیدگی سے لینے میں بہت دیر کر دی، خیر! ہم ہی کیوں اور امی ہی کیوں جیسے خیالات میں الجھ کر حاصل کچھ نہیں ہونا ہے اس لیے اسے ایکسیپٹ کرنے اور ڈیل کرنے پر توجہ دو۔"

شانو نے ایک سال تعلیم سے وقفہ لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے اس فیصلے سے اعظم اور منیب خوش نہیں تھے تاہم اس کا کہنا تھا۔ وہ اس وقت ذہنی طور پر پڑھائی کے لیے تیار نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے قرۃ العین کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کیا۔ وہ دور سے ہی قرۃ العین کو دیبا کے ساتھ باتیں کرتا دیکھتی رہتی۔ اس مشاہدے سے ہی اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اب وہ ان کے سوالوں پر روتی نہیں تھی وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا اور جس سے وہ راضی اور خوش ہوں، ایسے جواب دینا سیکھ گئی تھی۔

☆☆☆

"بیبا کہاں ہے؟" قرۃ العین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔ انداز میں عجلت تھی۔

"کچن میں ہوگی۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی کام تھا؟"

"بیبا! بیبا!" وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے اونچی آواز میں اسے بلانے لگیں۔

"جی۔" وہ ہاتھ میں چمچہ لیے باہر آئی۔

"ارے آج دو تاریخ ہے ناں، بک اسٹال پر ڈائجسٹ آ گیا ہوگا۔ چلو لے آتے ہیں۔" ان کے انداز میں دبا دبا جوش اور مسرت تھی۔ تب ہی کمرے سے اعظم میر بھی نکلے اور بیٹے کے بازو میں جا کر بیٹھ گئے۔

"ابھی؟" اس نے مری سی آواز میں کہتے ہوئے منیب اور اعظم میر کو دیکھا۔ دونوں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔

"ہاں ہاں ابھی۔"

"میں یہ رکھ کے آتی ہوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑا چمچہ دکھاتی اندر چلی گئی۔ قرۃ العین ان کے پاس آ گئیں۔

"پیسے دیں۔" انہوں نے اعظم میر کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ان کے بجائے منیب نے کافی ٹیبل سے بٹوہ اٹھا کر اس میں سے چند نوٹ نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ تب ہی دیبا باہر آئی۔

"چلو۔" وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔

"ایسے نہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"دو منٹ رکیں۔" وہ بھاگتی ان کے کمرے میں گئی اور واپس آئی اس کے ایک ہاتھ میں ان کی چادر تھی اور دوسرے میں ان کے آرام دہ میڈیکیٹڈ سلیپرز تھے۔ چپلیں پیر کے پاس رکھنے کے بعد اس نے ان کے گرد چادر پھیلائی۔

"اب چلیں۔" وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئیں۔

"دیبا ہمارے لیے اللہ کا بڑا انعام ہے۔" اعظم نے ایک لمبی سانس لے کر سر صوفے پر گرا دیا۔ منیب نے کچھ نہ کہا۔

"عینی کے ڈائگنوسس سے پہلے ہم نے ان ماں بیٹی کا ہونا بھی اکنالج بھی نہیں کیا تھا۔ ہم رشتے داروں کو خوش اور راضی کرنے کی کوشش میں ان دونوں کو ان ہی کی طرح اگنور کرتے آ رہے تھے۔ اس گھر میں بھی اسے تمہاری نانی نے بھیجا ہے، اس کی مرضی اور خوشی کا اس میں دخل نہیں لیکن۔ دیبا نے جس ذمہ داری ایمان داری اور خلوص سے اس گھر میں سب کچھ سنبھالا ہے وہ ہماری سب سے بڑی محسن بن گئی ہے۔"

ان کی خود کلامی سے فقروں پر اس کے اندر سوچ کی نئی کونپلیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ بھول گئی تھیں کہ کیوں باہر آئی ہیں۔ خاموشی سے چلتے ہوئے ایک جگہ رک کر قرۃ العین کے کہنے پر اس نے سیب خریدے اور پھر دونوں واپس گھر آ گئیں۔

☆☆☆

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے بھائی جان۔" وہ انہیں لان میں تنہا دیکھ کر باہر آئی تھیں۔

"جی بیٹھیں۔" انہوں نے فون بند کر کے ایک طرف رکھا جس میں وہ کوئی مضمون پڑھ رہے تھے۔

وہ انگلیاں مروڑتی، جز بز سی کرسی پر ٹک گئیں۔

"آرام سے بیٹھیں۔" ان کی کشمکش بڑی واضح تھی۔

"آپ بلا جھجک جھجک سے ہر بات کر سکتی ہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ وہ جو انہیں بلا لیتے تھے اور دیبا کو بھی ان سے ملنے بھیج دیتے ہیں پھر دیبا نے بھی ان کے بارے میں اچھی باتیں سنائی تھیں ان سب کے بعد ہی وہ یہ ہمت کر پائی تھیں۔

"آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ میرے علاوہ کوئی نہیں ہے جسے دیبا کی فکر ہو، مجھے اس کے یہاں آپ سب کے ساتھ رہنے اور کام کرنے پر کوئی اعتراض یا شکایت نہیں ہے بلکہ میں تو ایک طرح سے خوش ہوں لیکن میں ماں بھی ہوں، ایک جوان بیٹی کی ماں جسے طرح طرح کے خوف اور اندیشے ستاتے ہیں۔ بخدا میری بات کو غلط نہ سمجھیں، مجھے آپ سب پر اعتبار ہے بلکہ میں تو شکر گزار اور احسان مند ہوں سب کی۔ لیکن۔" وہ رک گئیں۔

"جی۔ میں سن رہا ہوں۔" اعظم میر نے کہا۔

"دو جوان لڑکوں کے گھر میں اپنی بیٹی کو چھوڑتے ہوئے مجھے اللہ کا خوف ڈراتا ہے بھائی جان۔ دیبا کو یہاں بھیجنے کے لیے کسی کو میری اجازت کی ضرورت نہیں تھی نہ میں ان کے آگے کچھ کہنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ آپ اسے میری بزدلی کہہ لیں یا خوف جو بھی سمجھیں لیکن میں اس امید پر آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ سمجھیں گے۔" عابدہ نے یوں سر جھکایا جیسے جرم کا اعتراف کیا ہو۔

اعظم میر بری طرح چونک گئے۔ انہوں نے اس نہج پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔ ان کے آنے سے پہلے شانو سارا وقت پڑھائی کے لیے اپنے کمرے میں بند رہتی تھی اور اس کے علاوہ ایک دماغی طور پر کمزور اور غائب دماغ عورت کے علاوہ یہاں ان کے دو بیٹے تھے اور ان کے بیچ ایک کمزور سی لڑکی۔

انہیں جیسے ہی اپنی غفلت کا احساس ہوا، ندامت ان کے اندر اتر گئی۔ یہ باریکیاں اور نزاکتیں سمجھنے والی ان کی نصف بہتر اب اس حال میں تھیں کہ یہ کام بھی ان کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ انہیں اچانک بے چینی نے گھیرا کہ جانے ایسی کون سی معمولی مگر اہم باتیں اور چیزیں ان کی غفلت کا شکار ہو رہی ہوں گی۔ انہیں ایک دم اپنے گھر کے 'بنا عورت' کے ہونے کا احساس ہوا۔

"میں چاہتی ہوں، آپ اسے واپس بھیج دیں یا مجھے بھی یہیں بلا لیں۔" وہ بھی اتنی ہی کمزور تھیں جتنی دیبا لیکن ماں تھیں خود کو بیٹی کے تحفظ کا ذمہ دار سمجھنے والی ماں۔ اپنی حیثیت اور مجبوری کے باوجود جہاں پہلا موقع ملا انہوں نے کوشش کی۔

"آپ کی بات بالکل درست ہے۔ میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ایک گزارش ہے آپ سے، جب تک کوئی اور انتظام نہیں ہوتا آپ تب تک دیبا کو یہاں رہنے دیں۔ تب تک میں منور بھائی سے بات کرتا ہوں کہ وہ آپ کو یہاں بھیج دیں۔"

"آپ ان سے یہ مت کہیے گا کہ میں نے یہ بات۔" وہ ایک دم پریشانی سے بولیں۔

"آپ بے فکر رہیں، میں اپنے طور پر بات کروں گا۔"

☆☆☆

وہ اس مسئلے پر منیب سے بات کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اس سے پہلے سلمان ان کے پاس چلا آیا۔

وہ اپنے دفتر کی ساتھی فاریہ کو پسند کرتا تھا اور فاریہ کے گھر والے اب اس کی شادی کرنا چاہتے تھے، لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ اعظم میر اس کے گھر شادی کا پیام لے کر جائیں۔

"ٹھیک ہے، پہلے منیب کی شادی ہو گی یا پھر تم دونوں کی ساتھ میں۔" اعظم نے سلمان کو سمجھانے یا باز پرس کرنے کے بجائے دوسرے اہم امور پر توجہ

دی۔ یہ سب اب انہیں ہی سوچنا اور کرنا تھا۔
عابدہ کی بات کے بعد سے ہی وہ سنجیدگی سے منیب کی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے مگر انہیں منیب سے اس بارے میں بات کرنے کا وقت ہی نہیں مل پایا تھا۔
"تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو بتادو۔ یہ کام تمہاری امی کا تھا، یہ میں نہیں کرسکتا۔ اگر رشتہ تلاش کرنا ہے تو پھر میں آپا کو بلالیتا ہوں۔ وہ اور ناظمہ مل کر دیکھ لیں گی۔" انہوں نے بڑی بہن اور بھابھی کا نام لیا۔
اس نے عروبہ کا نام لے کر پہلے خود اس سے بات کرنے کی خاطر ان سے ایک دن کی مہلت مانگی کہ وہ اس کے بعد نانی اور ماموں سے یہ ذکر کریں۔
☆☆☆
جب اس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے عروبہ کو یہ خوش خبری سنائی تو اس کے تاثرات اس کے تصور اور امید کے برعکس تھے۔
"بہت کچھ بدل گیا ہے منیب! تمہیں یاد ہے ہم آخری بار باہر کب اور کہاں ملے تھے؟ اب تو میری ہر کال مِس ہوتی ہے اور تمہیں کال بیک کرنا پڑتا ہے، میسج بھی تم سونے سے پہلے دیکھتے ہو، سلام کا جواب اور تھک گیا ہوں، سو رہا ہوں، کل بات کرتے ہیں کہ علاوہ کوئی اور بات نہیں لکھتے۔ سال بھر سے زیادہ ہوگیا ہے اور اس دوران ہم جب بھی ملے تمہارے پاس بات کرنے کے لیے پھپو اور گھر کے علاوہ کوئی اور ٹاپک ہی نہیں ہوتا ہے۔"
"تم ان سب کی وجہ جانتی ہو عروبہ! ورنہ میں ایسا تو نہیں ہوں۔"
"تم ایسے نہیں تھے مگر اب ہو گئے ہو اور آئندہ بھی یونہی رہو گے۔ مجھے جو منیب پسند تھا، جس سے مجھے محبت ہوئی تھی، جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے، وہ اب ہے ہی نہیں۔" منیب بے یقین سا اسے دیکھ رہا تھا۔
"ساری دنیا جانتی ہے کہ تم پھپو کو بہت اہمیت دیتے ہو، تمہارا رشتہ عام ماں بیٹے سے بڑھ کر گہرا اور خاص ہے، مجھے اس بات پر کبھی اعتراض نہیں تھا۔ پھپو اچھی ہوتیں تو میں۔"
منیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ اگلی بات وہ بنا سنے جانتا تھا۔ کچھ بت ہم توڑنا نہیں چاہتے۔ وہ سنے بنا جانتا تھا۔ آگے ادا ہونے والے الفاظ اسے عمر بھر ستاتے رہیں گے۔ کچھ تلخ یادیں وجود ہی نہ پائیں وہی اچھا۔
"مت کہو آگے کچھ عروبہ۔ تم آسانیوں کی ساتھی تھیں میں سمجھ گیا ہوں۔" اس نے دکھ سے کہا۔ عروبہ نے پہلو بدلا، لب وا ہوئے لیکن کچھ کہا نہیں۔
عروبہ سے مل کر وہ جانے کتنی دیر سے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک دم خالی تھا۔ دل و ذہن پر سناٹا چھایا تھا۔ ہم چاہے بڑی سے بڑی آفت اور کٹھنائی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوتے ہوں، ہمارے حوصلے اور ارادے بلا کے مضبوط ہوں تاہم جن پر بھروسا ہو وہ نظر پھیر لیں تو ہماری ساری خوبیاں شرمندہ اور تنہا رہ جاتی ہیں۔
وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ گھر کو اس کی امی کے ایسے نعم البدل کی ضرورت تھی جو اس گھر کی نگراں، حاکم اور مالک ہو۔ سلمان کا مزاج اور پھر جس انداز میں اس نے شادی کی بات کی تھی، اس تناظر میں فاریہ سے امید رکھنا لاحاصل نہ تھا لیکن قبل از وقت اور غیر یقینی تھا پھر وہ بھی جاب کرتی تھی۔ گھر کو وقت دینا اس کے لیے مشکل ہی تھا۔
"پاپا! آپ ہی کوئی دیکھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے رات میں اعظم میر سے کہا تو انہوں نے اس کا شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔
"یہ قسمت کی باتیں ہیں بیٹا۔"
انہیں بھی ایسی امید نہیں تھی۔ جب اس نے عروبہ کا نام لیا تو وہ بھی بہو کے روپ میں اسے سوچ کر خوش اور مطمئن تھے کہ ان کے بیٹے کی پسند ہے۔
☆☆☆
اس کے بعد انہوں نے اپنی آپا سے بات کرنے سے پہلے چھوٹے بھائی سے ان کی بیٹی کے

لیے بات کی جو کچھ دن پہلے ہی اپنے فائنل امتحان دے کر گھر آئی تھی۔ انہوں سوچنے کا وقت مانگے بنا، کسی لگی لپٹی کے بغیر معذرت کر لی، وہ حیران تھے۔ ان کے خاندان اور بیٹے میں وہ سب کچھ تھا جس کی لڑکی اور اس کے والدین تمنا کرتے ہیں۔ بس ایک بیماری کی وجہ سے سب اتنے خوف زدہ کیوں ہو رہے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ منیب اکلوتا تھا جس پر دیکھ بھال کی ذمہ داری ہوتی، نہ بیماری کوئی چھوت والی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے کہ رشتے سے انکار کی وجہ محض قرۃ العین کی دماغی صحت نہیں ہے بلکہ منیب کی اپنی ماں کے لیے غیر معمولی محبت بھی ہے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' قرۃ العین کی آواز پر وہ بری طرح ٹھٹکے۔ وہ جانے کب باہر آئی تھیں۔

''بچوں کی شادی کے بارے میں؟'' انہوں نے بغور اپنی چہیتی بیوی کو دیکھا۔

''کون؟'' ان کے بولنے کا انداز بھی دھیما ہو گیا تھا۔ وہ پہلے جیسی رفتار اور جوش میں بات نہیں کرتی تھیں۔

''منیب اور سلمان۔''

''اچھا مذاق کرتے ہیں آپ بھی۔'' وہ ہاتھ سے مکھی اڑانے کے انداز میں ہنستے ہوئے گویا ہوئیں۔

''بیگم! منیب کو اپنی سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ فرم اسٹارٹ کیے چار سال ہو گئے ہیں، آپ کہتی تھیں بس دو سال کی بات ہے پھر شادی کر دوں گی تمہاری۔'' ان کی ہنسی میں کھو کر وہ بھی کہہ گئے۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' وہ پرتشویش سی انہیں غور سے دیکھنے لگیں جیسے ان کی دماغی صحت پر شبہ ہو۔

''منیب کا لاسٹ سمسٹر ہے ابھی۔''

''مذاق کر رہا تھا بیگم۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس تبسم میں کرب تھا۔ جب آپ اپنے ساتھی، ہمراز، ہم زبان سے ہم کلام ہوں اور درمیان میں بات کے مطالب بدل جائیں تو اس سے بڑا المیہ کوئی نہیں۔

تب ہی دیبا وہاں ان دونوں کے لیے چائے لے کر آ گئی۔ ٹرے میں بسکٹ اور نمکین بھی رکھا تھا۔

قرۃ العین کو شام کی چائے کے ساتھ کچھ نمکین کھانے کی عادت تھی۔

''شکریہ بیٹا۔'' انہوں نے تشکر سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کر چلی گئی۔

''شکر ہے یہ لڑکی اچھی ہے۔ پچھلی والی کی طرح چوریاں نہیں کرتی۔'' انہوں نے کپ کے ساتھ ایک بسکٹ اٹھایا۔

''ہمم۔'' انہوں نے کپ اٹھاتے ہوئے ہنکار بھرا۔ ایسے وقت انہیں حقیقت سمجھانا لاحاصل تھا۔

☆☆☆

اب بیٹے تک بات پہنچانے کے لیے ان کے پاس ماں والا پل نہیں تھا سو خود ہی منیب سے بات کرنا پڑی۔ وہ ان کی بات سن کر ایسا شدید حیران ہوا کہ بت ہی بن گیا۔

''یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اگر تعلیم اور اسٹیٹس دیکھیں تو وہ تمہارے قابل نہیں لیکن بیٹا! اس وقت ضرورت اور سہولت ہر بات پر حاوی ہے۔ مجھے وہ بچی پسند ہے، اس کا مزاج، اطاعت گزاری پسند ہے۔ تم بھی اگر اسے دیکھنے کا نظریہ بدل لو تو وہ تمہیں بھی اچھی لگے گی۔ تمہیں لگ رہا ہوگا۔ میں خود غرض ہو کر سوچ رہا ہوں تم سے زیادہ عینی اور اس گھر کا سوچ کر کہہ رہا ہوں تو یہ کسی حد تک سچ ہے لیکن بیٹا جتنا میں تمہیں اور تمہارے اپنی ماں سے پیار کو سمجھتا ہوں، اس کے مطابق دیبا سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں۔''

وہ اب بھی بولنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ بات ہی ایسی انوکھی تھی۔

''تم سوچ کر اپنا فیصلہ بتا دو، اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو پھر میں آپا سے بات کروں گا کہ وہ کوئی قابل لڑکی دیکھ کر بتائیں۔''

وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ قرۃ العین کے مرض کی تشخیص کے بعد بھی وہ بڑا پر امید اور مثبت تھا۔ اول اول فکر اور پریشانی تھی لیکن جب یہ حقیقت قبول کر لی تو وہ پریقین تھا کہ سب ٹھیک ہوگا، وہ سب مل کر

سنبھال لیں گے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کے خواب، مستقبل کے منصوبے، زندگی کے اہم فیصلے سب کچھ اس وجہ سے بدل جائیں گے۔ وہ جو اپنی زندگی کی باگ خوبی سے سنبھالے تھا، اب حالات کے دھارے پر رخ موڑنے لگی تھی۔ محبت جیسا خالص جذبہ بھی مشروط نکلا تھا، عروبہ کے جواب نے اسے دکھ دیا تھا تو کہیں اس کے اندر اطمینان بھی تھا۔ وہ یہ سب شادی کے بعد کہتی تو اس کے لیے کتنی بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

وہ جیسی بھی تھی، اس نے ویسا فیصلہ کیا تھا، غلطی اس کی تھی وہ اسے سمجھ نہیں پایا۔ اس نے تکلیف اور دکھ کے ساتھ ہی مان لیا تھا کہ عروبہ نے پریکٹیکل فیصلہ کیا ہے۔

اور اب جو اس نے سنا۔ وہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ ایسی زندگی کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ زندگی کے ساتھی کا تصور اس کے لیے ایک پراعتماد، پروقار اور جدید طرز زندگی کے تقاضوں کو نبھانے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اس خوبصورت ساتھ اور احساس کو جس کے ساتھ سوچتا آیا تھا۔

وہ فریب نکلا اور اب اسے جس سے منسوب کرنے کا اعظم میر کہہ رہے تھے۔

اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک اور حقیقت پسند انسان تھا لیکن پھر بھی اس وقت اس کی بند آنکھوں سے نمی چھلک کر پلکوں پر چمکنے لگی تھی۔ خواب ٹوٹے تو اتنا تو ہوتا ہے!

"اس وقت ضرورت اور سہولت ہر بات پر حاوی ہے۔"

اس کے ماؤف ہوتے ذہن میں باپ کی آواز کی تکرار جاری تھی۔

☆☆☆

اعظم میر نے ماموں کے گھر جا کر بات کی تھی۔ بات ہی ایسی تھی کہ سب سکتے میں آ گئے۔ عروبہ اسے انکار کر چکی تھی لیکن اس کی جگہ دیبا کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات جتنی حیرت انگیز تھی اتنی ہی بری بھی لگ رہی تھی۔ کہاں اعلا تعلیم یافتہ، خوبرو، بااعتماد اور وجیہہ منیب اور کہاں بارہ جماعتیں پاس دبوسی اعتماد سے خالی دیبا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کسی زاویے سے بھی ان کا جوڑ نہیں بنتا تھا۔

سب منیب کے مان جانے پر بے یقین سے تھے۔ بس ایک عابدہ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اعظم میر کو انکار کرنا آسان نہیں تھا اور پھر ان کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی نہیں تھی جس کی بنیاد پر وہ دیبا اور اس کی شادی پر اعتراض کرتے۔ جنھیں تحفظات ہونا چاہیے تھے۔ وہ خود بیٹے کی رضامندی سے رشتہ لے کر آئے تھے تو ان کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی نانی نے دبے لفظوں میں کہا کہ گھر میں اور بھی لائق بچیاں ہیں۔

"ساری بچیاں ہی ہمیں ایک سی عزیز ہیں، بس یہ ہے کہ دیبا کی ہم سب کو عادت ہو گئی ہے، وہ ہی اب سارا گھر سنبھال رہی ہے لہٰذا وہی مستقل ہمارے گھر آ جائے تو ہمیں خوشی ہوگی۔" اعظم میر کی بات کے بعد دنیاداری نبھانا ہی بچا تھا۔

☆☆☆

عابدہ نے اسے فون پر بتایا تو اسے لگا، کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ ان سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ان کے نزدیک یہ بے جوڑ یا مصلحت والا رشتہ نہیں تھا بلکہ ان کے صبر کا انعام تھا، ان کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ماں کی خوشی پر کیا ردعمل دے۔ اس کے لیے ان کی خوشی اور اطمینان سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ان سے بات کرنے کے بعد پرسوچ سی فون ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ تب ہی منیب ڈرائنگ روم میں آیا۔ اس نے کار کی چابی چیسٹ کے اوپر دھرے جوٹ کے پیالے میں رکھی اور جوتے اتار کر صوفے پر گر سا گیا۔ اس نے کونے میں کھڑی دیبا کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے علم تھا، ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر کمرے میں جائے گا پھر نہانے کے بعد چائے کی طلب اسے باورچی خانے میں لے آئے گی۔ وہ عموماً اس وقت رات کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوتی

تھی۔ وہ پیچھے میز پر بیٹھ جاتا اور وہ ایک چولھا خالی کر کے پہلے اس کی چائے بناتی وہ کبھی وہیں بیٹھ کر فون دیکھتے ہوئے پی لیتا اور کبھی کپ لے کر باہر چلا جاتا تھا۔ قرۃ العین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے اس میز پر بیٹھنے کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں بھی لاشعوری طور پر وہی کرتا تھا۔

اس نے صوفے کی پشت پر گردن ڈال کر آنکھیں موند لی تھیں۔ دیبا دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ صبح استری شدہ شرٹ سلوٹ زدہ اور ڈھیلی سی تھی۔ چہرے پر دن بھر کی مصروفیت نے اپنے نشان چھوڑے تھے۔ سیاہ الجھے سے بال اس کا حلیہ صبح کے مقابلے میں مختلف بنا رہے تھے۔ اپنی محویت اور اس قدر تفصیلی جائزے کا احساس ہوتے ہی اس کا دل شور کرنے لگا۔ اس نے پہلی بار سینے میں ایسی ہلچل محسوس کی تھی۔ خود کو سرزنش کرتی وہ آگے بڑھی اور جب اس کے سامنے سے گزری تو منیب آنکھیں کھول کر سیدھا ہوا۔

وہ باورچی خانے میں اس کی آمد کا انتظار ہی کرتی رہ گئی مگر وہ نہیں آیا۔ اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ یہ منیب کی خواہش پہ ہو رہا ہے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے وہ بھی جانتی تھی کہ اس گھر کو ایک ذمہ دار شخص کی ضرورت تھی اور وہ اس کردار کے لیے موزوں امیدوار تھی۔

شانو اور سلمان کا پہلا ردعمل وہی تھا جیسا منیب کا تھا لیکن پھر اعظم میر نے انہیں قائل کر لیا۔ بدلے حالات نے سمجھوتے کی اہمیت سب پر اجاگر کر دی تھی۔ قرۃ العین دونوں بیٹوں کی شادی کا سن کر خوش ہوئی تھیں۔

شادی کے انتظامات کے لیے اعظم میر نے اپنی بڑی بہن کو بلایا تھا۔

☆☆☆

تھکے ہارے زیادہ مہمان چاچی کے یہاں چلے گئے تھے۔ انہیں بھی علم تھا، کاروبار سنبھالنے والی آج فارغ نہیں ہوگی۔ سلمان اور فاریہ کے لیے ان کے دوستوں نے ہوٹل کا کمرہ بک کیا تھا۔ اس سے بھی اعظم میر نے پوچھا تھا مگر اس نے منع کر دیا تھا۔

تھکی ہاری قرۃ العین سو گئی تھیں۔ سارا وقت ان کے ساتھ رہی شانو بھی کمرے میں بستر پر ڈھیر تھی۔ انہیں اپنے بیٹوں کی شادی کا علم تھا لیکن وہی ذرا ذرا دیر میں مختلف باتیں۔

''کس کی شادی میں آئے ہیں؟''

''دلہنیں پیاری ہیں، اپنے منیب کی دلہن کا میک اپ بھی ایسا ہی کروائیں گے۔''

''کتنے پیارے لگ رہے ہیں میرے بچے!''

''اب چلو گھر، بہت دیر ہوگئی ہے۔ صبح سب کو اپنے کام پر جانا ہے۔''

اس کے کمرے میں جانے سے پہلے اعظم میر اس کے پاس آئے تھے۔

''بیٹا! تم سمجھ دار ہو، میں لیکچر نہیں دوں گا، میری ساری دعائیں تم بچوں کے لیے ہیں۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ دیبا کی حق تلفی نہ ہو، اسے کوئی دکھ نہ پہنچے۔ مجھے وہ بچی بھی شانو کی طرح عزیز ہے۔''

''جی پاپا۔'' اس نے مسکرا کے ایک اور بوجھ شانے پر اٹھایا اور کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ جو دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی، دروازہ کھلنے پر خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے ایک طرف ہوئی۔

''سوری۔'' اس کے پاس پہلا ہی لفظ معافی کا تھا۔

وہ گہرے سبز اور ہلکے سنہری لہنگے، زیور اور میک اپ میں روز کی دیبا سے بہت مختلف لگ رہی تھی تاہم چہرے پر انتہا کی سنجیدگی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر پلنگ تک پہنچ گیا لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا جو کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وہ کئی دنوں سے خود کو سمجھا رہا تھا اس گھڑی کے لیے خود کو راضی اور تیار کر رہا تھا پھر بھی اس وقت اس کا رواں رواں احتجاج میں مصروف تھا جب کہ اسے باپ کی باتیں بھی بھولی نہیں تھیں۔

"کچھ کہنا ہے؟" وہ دو قدم آگے آیا۔ وہ شعوری طور پر دروازے سے دور ہونے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اپنی بات کس طرح اس تک پہنچائے۔

"کہو۔" اسے یونہی جز بز اور چپ دیکھ کر اس نے پھر کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ مطلب آپ انکل۔ میں انہیں پتا نہیں لگنے دوں گی۔ میری اور امی کی مجبوری تو آپ بھی جانتے ہیں۔ ہم کسی سے نہ نہیں کہہ سکتیں۔ ویسے امی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ۔" اس نے ذرا سا سر اونچا کر کے اسے دیکھا اور اس غلطی پر جو بے ربط سے جملے نکل رہے تھے، وہ بھی روٹھ گئے۔

"میں۔" اس نے کسی طرح گم ہوئے الفاظ تلاش کیے۔

"پریشان نہیں کروں گی۔ اور جیسا آپ کہیں گے۔" وہ آگے آیا اور دیبا سہم کر خاموش ہوگئی۔

"ڈرو نہیں، ریلیکس!" اس کے حسین چہرے پر در آئے خوف نے اس کی آواز خود بخود نرم کردی۔

"فلحال جو سچویشن ہے اور جیسے اتنی جلدی شادی ہوئی ہے، بس اسی وجہ سے۔"

وہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم مجھے بیوی کی حیثیت سے پسند نہیں، میں نے یہ شادی بڑے جبر سے، مجبوری میں کی ہے، میں خوش نہیں ہوں اور میں کبھی تمہارے ساتھ خوش رہ بھی نہیں سکتا۔

اگر دیبا نے اتنے دن اس گھر میں نہ گزارے ہوتے تو وہ یہ سب کچھ شدید نفرت اور غصے میں اس سے کہہ رہا ہوتا لیکن بات تو یہ بھی سچ تھی کہ اگر اس نے کچھ دن اس گھر میں نہ گزارے ہوتے تو اس سے شادی کی نوبت بھی نہیں آنا تھی۔

وہ بات کے بیچ اچانک چپ ہوگیا تھا اور اب کسی خیال میں ڈوبا اسے دیکھ رہا تھا۔ دیبا نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ہوش میں آیا۔

"تم چینج کرلو۔" اس کا مزید کچھ بھی کہنے سے دل اچاٹ ہوگیا۔

وہ احتیاط سے لہنگا سنبھالتی کپڑے بدلنے چلی گئی۔ جب وہ حلیہ بدل کر واپس آئی تو منیب کپڑے بدل کر سوگیا تھا۔ اب جانے سچ میں سویا تھا یا سویا بن رہا تھا۔ اس کا بھی دل کیا، اپنے کمرے میں جا کر سو جائے لیکن اس وقت وہاں اس کی امی برسوں بعد پر سکون اور خوش ہو کر سو رہی تھیں۔

ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کمرے میں ایک صوفے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دیوار سے لگا صوفہ چیزیں رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس پر بڑے بڑے کارٹن اور کتابیں رکھی تھیں۔ سارے ممکنات پر غور کرنے کے بعد اس نے کرسی پر بیٹھ کر پیر اوپر کیے، دوپٹا پھیلا کر چادر کی طرح اوڑھا اور پیچھے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

رات کسی پہر اس کی آنکھ کھلی اور کروٹ بدلتے ہوئے نظر کرسی پر گھٹڑی بنی دیبا پر پڑی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے افسوس سے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسائے۔ اسے یوں کرسی پر رات گزارتے دیکھ کر اسے اپنے ظالم اور بے حس ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔

جس رات کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ غم دہ دل کے ساتھ اپنے ارمانوں اور خوابوں کا سوگ منائے گا۔

اس شب اس نے دنیا کی سب سے بڑی سچائی جان لی کہ جو ہمارے پیاروں سے اچھا سلوک کرتا ہے، ہمارا دل اس کی پروا خود بخود کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆

وہ معمول کی طرح اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی تھی۔ منیب کمرے میں سو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ عابدہ بھی اٹھ کر سیدھی ادھر ہی چلی آئیں۔

"تم کیوں ادھر آگئیں، جاؤ کمرے میں۔ آج میں سنبھال لوں گی سب۔" اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے بولتے ہوئے آگے آئیں اور اس کے ہاتھ سے چاقو لے کر سامنے سے پیاز کی پلیٹ دور کی۔ وہ دھیرے سے ہنسی۔

"امی! عادتیں ایک دن میں نہیں بدلتیں۔ جیسے

آپ اس وقت اٹھ کر کچن میں آئی ہیں ویسے ہی میں بھی۔" اس نے ہلکے انداز میں بات ٹالنی چاہی۔
"تم جاؤ، منیب جاگے تب اس کے ساتھ آنا۔"
وہ بضد تھیں۔
"امی!" اس نے رسان سے کہا۔ "آپ اس بات کی طرف سے بالکل بے فکر رہیں کہ یہاں کوئی مجھ سے ناراض یا غصہ ہوگا یا کسی کو کچھ برا لگے گا، یہاں ایسا مزاج الحمدللہ کسی کا نہیں ہے۔" اس نے ماں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔
"صدفی صد درست کہہ رہی ہے ہماری بیٹی۔" اعظم میر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ دیبا کا گھر ہے جیسی اس کی مرضی اسے کرنے دیں۔" وہ دونوں ان آمد پر گڑبڑا گئی تھیں۔
"مجھے بھی چائے دینا بیٹا۔"
"آپ بھی جلدی جاگ گئے؟" اس نے چولہا جلاتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں، بیگم کو پانچ بجے چہل قدمی کرنا تھی۔ واپس آ کر خود تو سو گئی ہیں لیکن اب میری نیند چہل قدمی کو نکل گئی ہے۔" انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی بات پر مسکرا دی۔ عابدہ کو ان دونوں کی بے تکلفی اور باتیں خوش گوار لگ رہی تھیں۔
"آپ کہیں تو میں منور بھائی سے بات کرلوں کہ اب آپ یہیں رہیں گی؟" انہوں نے عابدہ سے کہا۔ دیبا خوشی سے ان کی سمت پلٹی لیکن اس سے پہلے عابدہ کہنے لگیں۔
"ابھی نہیں، کچھ دن رک جائیں۔" وہ سب دیبا کے رشتے اور شادی پر حیران تو تھے ہی ساتھ ناخوش بھی تھے، وہ انہیں مزید خفا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دیبا نے انہیں دیکھا تو انہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہا۔
"ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

☆☆☆

اسی شام عابدہ واپس چلی گئیں۔ سلمان اور فاریہ ہنی مون پر روانہ ہو گئے تھے۔ گھر میں منیب کی پھپھو کے علاوہ اور کوئی مہمان نہیں تھا۔ ان کے بہو بیٹا بھی واپس چلے گئے تھے۔
"کرسی پر مت سونا۔" وہ آدھے گھنٹے کے کام کو دو گھنٹے میں ختم کر کے آئی تو چپکے سے دروازہ کھولا تا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو لیکن وہ تو جیسے اسے اطلاع دینے کے لیے جاگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کہا۔
دیبا کی نظر بے اختیار صوفے کی سمت گئی جہاں آج کوئی سامان نہیں تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے پلنگ کی سمت دیکھا۔ منیب کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ صوفے پر تکیہ اور چادر بھی پڑی تھی۔ اس کی ایسی فکر ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں کرتا تھا۔ اس نے ممنونیت بھری نگاہ سے سوئے منیب کو دیکھا۔ محرومیاں زود حس بنا دیتی ہیں۔ دکھ، انبساط سب ذرا ذرا سی باتوں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

کھانا پکانے کے علاوہ جب اسے فرصت ہوتی، وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی لیکن اب کمرہ بدل گیا تھا۔ حالاں کہ دن کا زیادہ وقت منیب کمرے میں ہوتا نہیں تھا پھر بھی وہ جانے سے کتراتی تھی۔ کبھی لان میں بیٹھ جاتی تو کبھی خالی ڈرائنگ روم میں۔ اعظم میر اور قرۃ العین کہیں ایک ساتھ ہوتے تو ان کے پاس نہیں جاتی تھی۔ ثنا تو کا رویہ اس کے ساتھ شادی سے پہلے ہی نرم اور اپنائیت بھرا ہو گیا تھا لیکن ان کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی۔
وہ صبح منیب کے جاگنے سے پہلے ہی کمرے سے چلی جاتی تھی۔ رات میں وہ کمرے میں کام کر رہا ہوتا یا ٹی وی پر کچھ دیکھ رہا ہوتا، اس وقت وہ تھکی ہاری اندر آتی اور اپنی چادر تکیہ لے کر صوفے پر سو جاتی۔ وہ خود بستر پر جانے سے پہلے اس پر ایک آدھ نظر ڈال لیتا کبھی صوفے سے نیچے لٹکتی چادر اس پر ڈال دیتا۔ اس کی لاعلمی میں اسے دیکھتے رہنے کا نتیجہ تھا کہ اسے دیبا کے چہرے کے نقوش یاد ہو گئے تھے۔ اس کی کمان سی سیاہ بھنویں، چھوٹی سی ناک، چوڑی پیشانی اور بھرے سے ہونٹ جو سوتے ہوئے

ادھ کھلے رہتے تھے۔

پہلے اسے عابدہ سے ملنے جانا ہوتا تو وہ یا سلمان، ماموں کے گھر چھوڑنے اور لینے جاتے تھے۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری مکمل اس کی ہوگئی تھی۔ وہ اسے باہر ہی چھوڑ آتا تھا اور لینے کے لیے بھی جاتا تو فون کرکے اسے باہر بلا لیتا تھا۔

سلمان اور قاریہ صبح ایک ساتھ جاتے اور رات ساتھ گھر آتے تھے۔ اکثر تو رات کا کھانا بھی ان کا باہر ہی ہو جاتا تھا۔ چھٹی کے دن دیر سے جاگتے۔ اکثر چھٹی کے دن ان کی کسی دوست کے یہاں دعوت ہوتی اور جس دن دوست کے یہاں نہ ہوتی اس دن قاریہ کے گھر مدعو ہوتے۔

آج بھی گیارہ بجے اٹھ کر وہ اس وقت باورچی خانے میں آئی تھی جب دیبا کھانا بنا کر وہاں سے جانے والی تھی۔ برتن دھونے والی ماسی جا چکی تھی۔ چھٹی کے دن اس نے صفائی والی ماسی کو دیر سے بلانا شروع کر دیا تھا تاکہ سب کمروں کی صفائی ممکن ہو سکے۔

"میرے لیے بھی پراٹھا اور چائے بنا دو۔" قاریہ نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ روز صبح وہ دونوں بنا ناشتہ کیا جاتے تھے کہ ان کے دفتر میں ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔

اس نے فریج سے آٹا نکالا اور چائے رکھی۔ قاریہ اپنے فون میں مصروف تھی۔ اعظم میر کمرے کے جگ میں پانی بھرنے آئے تو وہ چائے چھان رہی تھی۔

"ابھی تک ناشتہ نہیں کیا بیٹا؟"

"یہ میرے لیے ہے انکل۔" قاریہ نے فون سے سر اٹھایا۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے قاریہ کا ناشتہ میز پر رکھا تو وہ اسے ساتھ لیے باہر نکلے۔

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھے اس سے اردو اخبار سن رہے تھے جب سلمان کمرے سے برآمد ہوا۔

"مجھے ناشتہ بنا دیں۔" اس نے باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے رک کر کہا۔

"اندر آپ کی بیگم موجود ہیں، ان سے کہیں، آپ کی خدمت ان کا فرض ہے دیبا کا نہیں۔"

اعظم میر کا لہجہ عام اور سادہ نہیں تھا۔ سلمان تو لب بھینچتا وہاں سے چلا گیا لیکن وہ بے چین ہو اٹھی۔

"میں بس پانچ منٹ میں انہیں ناشتہ دے کر آتی ہوں۔"

"بیٹا! تم پہلے بھی اس گھر کی ملازم نہیں تھیں ہماری معاون اور محسن تھیں اور اب اس گھر کا فرد ہو بلکہ تم نے ہی سب سنبھالا ہوا ہے، سربراہ ہو تم قرۃ العین کے بعد۔ میں کسی کو تمہیں کمتر گرداننے کی اجازت دیتا ہوں نہ ایسا کرتے دیکھ سکتا ہوں۔ ایک دوسرے کے لیے کام کرنے میں کوئی عار نہیں لیکن یہ میچوئل اور ایک ہی سطح پر رہ کر ہونا چاہیے، دوسرا آپ کو کمتر سمجھے تو اسے احساس دلانا ضروری ہے کہ ہم برابر ہیں۔" وہ چپ چاپ ان کی بات سن رہی تھی۔

"یہ معاملات گھر کی عورتیں دیکھتی ہیں، گھریلو ایشوز میں مجھ میں قرۃ العین جیسی قابلیت اور سمجھ نہ سہی لیکن ناانصافی نہ ہونے دوں، اتنا تو قائل ہوں۔"

وہ مسکرائے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ کی سمجھ اور قابلیت پھپھو سے بھی زیادہ ہے لیکن جواباً مدھم سا مسکرا کے رہ گئی۔ وہ اپنے طور پر بیوی کی ذمہ داریاں بھی نبھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دن بعد جب وہ ایک ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھے، قاریہ کو مرچیں تیز لگیں۔ اس نے پانی کا گلاس خالی کر کے آواز کے ساتھ واپس رکھا۔

"ایسا کھانا۔" اس نے پلیٹ دور کی۔

"گھر میں موجود بھی ممبرز کی پسند کا خیال رکھ کر کھانا بننا چاہیے، یہ نہیں کہ ایک کی مرضی اور پسند زبردستی سب کو کھانا پڑے۔" سب ہی اسے حیرت اور ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔

"بالکل ٹھیک۔ کل سے ڈنر قاریہ بنائیں گی

اور سنڈے لنچ ڈنر دونوں، ہمیں چھوٹی بہو کے ہاتھوں کا ذائقہ بھی تو پتا چلے۔" اعظم میر کی بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"چھوٹی بہو کون؟" قرۃ العین نے پرسوچ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔

"فاریہ۔" انہوں نے اس کی سمت اشارہ کیا۔

"ہمارے سلمان کی نصف بہتر، تمہاری چھوٹی بہو۔"

"اچھا۔" انہوں نے مسرت سے فاریہ کو دیکھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے ہی سلمان بھی اپنی پلیٹ چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" قرۃ العین نے باری باری سب کو دیکھا۔

"وہ کیوں ناراض ہو گئے؟"

"کچھ نہیں ہوا، آج میٹھے میں حلوہ ہے، اس کی جگہ رکھنا ہے ورنہ تم سے کھایا نہیں جاتا ہے پھر۔" انہوں نے دھیان بٹانے کے لیے حلوے کا پیالہ ان کے سامنے کیا۔

"آج میرا انڈے کا حلوہ کھانے کا دل تھا۔" قرۃ العین نے منہ بسورا۔ وہ میٹھے کی شوقین تھیں۔

"وہ کل بنا لیں گے۔" وہ انہیں باتوں میں لگا رہے تھے اور وہ تینوں خاموش تھے۔

کچھ دیر بعد فاریہ اور سلمان تیار ہو کر باہر چلے گئے۔ سب جانتے تھے، وہ باہر کھانے کے لیے گئے ہیں۔

"سلمان بھائی کتنے بدل گئے ہیں، یقین ہی نہیں آتا۔" شانو نے افسردگی سے کہا۔

اس کے چند دن بعد سلمان نے دھماکا کیا، وہ الگ گھر کرائے پر دیکھ چکا ہے اور اگلے اتوار وہاں منتقل ہو جائے گا۔ اعظم میر نے اسے کچھ نہیں کہا جب کہ مثیب نے سمجھانے، منانے کی کوشش کی۔ جواباً اس کا سرد اور دوٹوک رویہ اسے مزید دکھی کر گیا۔ جو جانے کا طے کر لیں وہ کسی سے نہیں رکتے۔

☆☆☆

زندگی لگے بندھے معمول پر کاربند تھی۔ سلمان کے جانے کے صدمے کے بعد کسی طرح سب نے صبر کر لیا تھا۔ قرۃ العین کو سلمان کی یاد آتی تھی۔ جب بھی وہ اس کا پوچھتیں ان کے پاس بہانے ہوتے تھے کہ وہ دفتر گیا ہے یا دفتر کے کام سے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر۔

شانو کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ دوسری بار بھی 'نیٹ' میں اس کے نمبر کم آئے تھے۔ تعلیمی میدان میں دو سال سے وہ ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔ وہ ایم بی بی ایس سے کم ڈاکٹر بننے تیار نہ تھی۔ پیڈ سیٹ پر داخلہ لینے سے اس نے منع کر دیا تھا۔ اسے بی ایس سی کرنے میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔

"مجھے ایک سال اور ریسٹ کرنے دیں۔" اس نے اعلان کیا۔ "ایک بار اور 'نیٹ' دوں گی۔"

اسے مصروف رکھنے کے لیے اعظم میر نے کسی طرح اسے بیکنگ سیکھنے کے بنیادی کورس میں داخلہ کروا دیا تھا۔ قرۃ العین بیکنگ میں ماہر تھیں اور ان کی بیماری کے بعد سے وہ سب ان کے ہاتھوں کے بنے کیک، کوکیز اور مفنز کو ترس گئے تھے۔ دیبا کھانا ذائقے دار بناتی تھی لیکن اسے روایتی پکوان ہی بنانے آتے تھے۔ اسی نکتے کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے شانو کو منا لیا تھا۔ پڑھائی شروع کرنے کے لیے وہ اب بھی تیار نہیں تھی اور حد درجہ فراغت بھی تو بیماری ہے۔

☆☆☆

"واؤ!" اسے دیکھتے ہی شانو کا منہ کھلا رہ گیا۔

"کتنا سوٹ کر رہا ہے آپ پر یہ کلر۔" اس نے گہرے فیروزی رنگ کا جوڑا زیب تن کیا تھا۔ شادی کے بعد سے اس کے پہننے اوڑھنے میں تبدیلی آئی تھی۔ چار پانچ ملگجے سے جوڑوں کی جگہ اب وہ 'ریڈی میڈ' نفیس اور اعلا برینڈ کے کپڑے پہنتی تھی جو شادی کے وقت شانو اور پھپھو وغیرہ نے مل کر

خریدے تھے۔

منیب نے لیپ ٹاپ سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھا جو مہینے بھر کے جمع اخبار ردی والے کو دینے کے لیے الگ کر رہی تھی۔ اس کی اجلی رنگت بلاشبہ اس رنگ میں مزید کھلی اور تر و تازہ لگ رہی تھی، اس کے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں بھی۔ اپنی محویت پر اس نے گڑبڑا کے دوبارہ اسکرین پر دھیان لگایا۔

"آپ یہ کلرز زیادہ پہنا کریں۔" شانو کی بات پر وہ مسکرائی۔

"ہے ناں بھائی؟" اس نے اسے گھسیٹا۔

"ہمم۔" اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے سے گریز کیا۔

"شاپنگ کرتے ہوئے ہمیں یاد آیا تھا کہ آپ سے تو پوچھا ہی نہیں کون سا کلر آپ کا فیورٹ ہے، تب پھپو نے کہا، میں آئی ہوں تب سے اسے زیادہ گرین کلر ہی پہنے دیکھا تو وہی فیورٹ ہوگا۔" شانو بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر اردو اور انگریزی اخبار الگ کرنے لگی۔ وہ اردو اخبار سے قرانی آیات کے ترجمے تفسیر والا حصہ قینچی سے کاٹ کر الگ رکھ رہی تھی۔ وہ بس مسکرا دی۔ اس نے کبھی اپنی پسند سے کچھ نہیں خریدا تھا۔ جو اسے دیا جاتا، اسے، وہی استعمال کرنا ہوتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

ویسے آپ بتا دیں، اب کیا پھپو کا اندازہ درست تھا؟

"مجھے کریم یا آف وائٹ پسند ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ! لائٹ کلرز تو لیے ہی نہیں تھے ہم نے۔" شانو نے افسوس سے کہا۔ یہ سچ تھا اس کے پاس اپنی پسند کے رنگ کا کوئی جوڑا نہیں تھا۔

اسی وقت اعظم میر قرۃ العین کے ہمراہ چہل قدمی سے واپس آئے۔

شانو ان کے لیے پانی لینے اٹھ گئی۔ اس نے ساری کترنیں اٹھا کر دراز میں ڈال دیں۔

"اخبار کی کٹنگ یہاں رکھی ہے انکل۔ آپ مسجد جاتے ہوئے لے جایئے گا۔" مسجد میں ایک ڈبہ اخبار کی عربی آیات وغیرہ کے لیے مختص تھا۔

"میں نے کہا تھا ناں چائے پی کر نہیں جاتے، اب پھر طلب ہو رہی ہے۔" قرۃ العین نے کہا۔ اعظم میر مسکرا دیے اور وہ اخبار ایک طرف رکھ کر چائے بنانے کھڑی ہوگئی۔ جاتے ہوئے قرۃ العین نے چائے پینے سے منع کر دیا تھا کہ پھر انہیں بہت پسینہ آتا ہے، اس لیے واپس آ کر پی لیں گے۔

اس کے بعد سے ہر دن منیب کا ذہن اس کے کپڑوں کا رنگ یاد کر رہا تھا اور وہ اس نئی اور عجیب پیش قدمی پر جھنجلا رہا تھا۔

"مجھے کیا جو کلر پہنے!" وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتا لیکن یہ صورت حال اس کے اختیار سے باہر ہوگئی تھی۔ شانو کی بات بہانا بن گئی تھی۔ اسے چلتے پھرتے کام کرتے دیکھتے ہوئے اب اس کی آنکھیں اور ذہن بھی مصروف رہنے لگے تھے۔ وہ اس وقت چونک اٹھتا جب کام کے دوران اچانک اس کے بال بنانے کے انداز سے لے کر اس کی بالی، چوڑی، دوپٹا اور کبھی وہ خود ہی چھم سے تصور میں در آتی۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور بالوں کو تولیے کی گرفت سے آزاد کر کے بال خشک کرنے لگی۔ تولیہ کرسی پر پھیلا کر اس نے آئینے کے سامنے رکھی اپنی چار چوڑیوں کو دیکھا۔ منیب کی پھپو نے اس کے ہاتھوں میں وہ کانچ کی چوڑیاں پہناتے ہوئے کہا تھا کہ کلائیاں کبھی خالی مت رکھنا۔ اب صرف چار چوڑیاں بچی تھیں۔ اسے عادت نہیں تھی سو اکثر کام کے دوران ٹوٹ گئی تھیں۔ اسے الجھن بھی ہوتی تھی سو وہ روز اتار دیتی کہ اب نہیں پہنے گی لیکن حکم عدولی اس کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ صبح کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ پھر پہن لیتی۔ اب بھی اس نے چاروں چوڑیاں اٹھائیں اور ایک ہی کلائی میں ڈالنے لگی تھی کہ پہلے سے دراڑ پڑ چکی چوڑی ٹوٹ کر بکھر گئی لیکن اس سے پہلے کلائی پر سرخ لکیر چھوڑ گئی۔ اس نے ہلکی سی 'سی' کے ساتھ تین

چوڑیاں واپس رکھ دیں۔ اچانک پیچھے سے آکر منیب نے اس کی کلائی ہاتھ میں لی تو اس بری طرح ڈری کہ منیب نے فوراً کہا۔

"میں ہی ہوں۔" منیب نے اس کے سہمے چہرے کو دیکھا۔

وہ روز اس کے جاگنے سے پہلے کمرے سے چلی جاتی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی، وہ اس وقت نہ صرف جاگ گیا ہے بلکہ پیچھے بیٹھا اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ چوں کہ وہ حصہ آئینے میں دکھائی نہیں دیتا تھا سو اسے پتا نہیں چلا۔

منیب نے کچھ کہے بنا دراز کھول کر ذرا سی تلاش کے بعد بینڈ ایج نکالی۔ سرخ سی لکیر کو بینڈ ایج سے ڈھانک کر اس نے دیبا کو دیکھا۔

"یہ پہننا ضروری ہے؟" اس نے نظر اس پر رکھتے ہوئے سر سے چوڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آنٹی نے کہا تھا، ہاتھ خالی نہیں رکھنا۔"

"آنٹی۔؟"

"آپ کی پھپو۔"

"وہ چلی گئی ہیں اور اگر تمہیں پسند نہیں یا اس سے مسئلہ ہے تو نہ پہنا کرو۔" وہ اسے روز سونے سے پہلے چوڑیاں اتارتے دیکھ رہا تھا۔

دیبا نے سر ہلا کر جانے کیا جواب دینے کی کوشش کی، منیب کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ وہ اپنا تولیہ لیے نہانے چلا گیا۔ واپس آیا تو دیبا کمرے میں نہیں تھی لیکن تین چوڑیاں آئینے کے سامنے پڑی تھیں۔

☆☆☆

اعظم میر اسے دو تین بار کہہ چکے تھے کہ کبھی دیبا کو باہر گھمانے پھرانے لے جاؤ۔ وہ کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کا بہانا بنا کر ٹال رہا تھا لیکن جب قرۃ العین نے اس سے کہا تو وہ بہانا نہیں بنا سکا۔

"تم اسے کہیں لے کر ہی نہیں جاتے ہو۔ شادی کے بعد تمہارے پاپا کسی اتوار مجھے باہر نہ لے جائیں تو میرا ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔"

اب وہ بہت کم اس طرح مناسب اور صحیح بات کرتی تھیں اور وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکا۔

"تم ریڈی ہو جاؤ، کہیں چلتے ہیں۔"

وہ مغرب کی نماز پڑھ کے جائے نماز اٹھا رہی تھی کہ منیب کی بات پر ہونق بنی ایسے ہی رک گئی۔ اس نے مصروف انداز میں فون لگاتے ہوئے اس سے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ حلیہ سدھار کر ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب کے درمیان بیٹھا منیب کھڑا ہو گیا۔ اسے یوں سب کے سامنے اس کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ وہ کبھی پاس پاس بھی نہیں بیٹھے تھے اور اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنے کے بعد اسے بند کار کی مختصر جگہ اور اس سے نزدیکی عجیب گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کہاں چلیں؟" کار سڑک پر موڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ اسکول، کبھی کبھار محلے کی دکان اور رشتے داروں کی شادی میں شادی ہال کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی تو اسے کیا بتاتی۔ اس کی جز بز سی خاموشی پر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ اپنے ازلی ٹھہرے، ہچکچاتے انداز میں گویا ہوئی۔

"کہیں۔ بھی۔" اس کے متوقع جواب پر وہ مسکرا دیا۔

مال میں بھٹک بھٹک کر خریداری کے بعد انہوں نے وہیں مال کی چھت پر ریسٹوران میں کھانا کھایا اور واپس گھر آئے تو گیارہ بج گئے تھے۔ وہ کپڑے بدلے بغیر ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کا رات کا آخری کام قرۃ العین اور اعظم میر کے کمرے میں دودھ پہنچانے اور دواؤں کی یاد دہانی کا ہوتا تھا۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی۔

"بیٹا!" وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو اعظم میر نے پیار بھرے انداز میں اسے پکارا۔

"ساری میڈیسن [illegible] لے لی ہے اور دودھ بھی۔ آج تمہارا کام شانو نے کر دیا۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔ باقی بھی تو ذمہ دار تھے۔

"تم آرام کرو، تھک گئی ہوگی۔"

"جی۔"

وہ کمرے میں آئی تو منیب کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ساری کاغذی تھیلیاں پلنگ پر رکھی تھیں۔ وہ کپڑے بدل کر اور وضو کر کے جائے نماز اٹھانے جا رہی تھی کہ منیب نے پکارا۔

"دیبا!" اس نے پہلی بار اسے نام سے آواز دی تھی۔ وہ رکی تو چہرے پر خوش گوار حیرت میں گھلی ملی خوشی بھی تھی۔ وہ پاس آیا تو اس نے اس کے ہاتھ میں چوڑیاں دیکھیں۔ مشہور برینڈ کا اشتہار ٹی وی پر دیکھتے ہوئے اس نے کب سوچا تھا کہ کبھی کوئی اس کے لیے یہاں سے کچھ خریدے گا۔ منیب نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما۔

"یہ تو تھی نہیں ہیں۔" پتلی سی نفیس اور نازک سی تین طلائی چوڑیاں اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے اس نے کہا۔ اس نے پھر یہ ہی دوسری کلائی کے ساتھ دہرایا۔ دیبا کا دل انجانی خوشی سے معمور ہو رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کے ساری تھیلیاں اٹھائیں۔

"یہ بھی تمہارے ہی ہیں۔" وہ یوں انہیں رکھ کر چلی گئی تھی جیسے کسی اور کے ہوں۔ دیبا نے قدرے تذبذب سے وہ اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ وہ سوچ رہی تھی اسے شکریہ ادا کرنا چاہیے لیکن اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ذرا سا سر خم کرتی وہاں سے ہٹ گئی۔

دیبا تو نماز پڑھ کے سو گئی لیکن منیب کو اس کے چہرے سے جھلکتی دبی دبی خوشی ایک عجیب سے احساس جرم میں مبتلا کر گئی تھی۔

"کیا تم اپنی خدمات کے بدلے بس اسی مادی صلے کی مستحق ہو؟ کیا میں نے تمہیں اس رشتے کو بنا کسی احتجاج اور ڈیمانڈ کے نبھانے پر یہ رشوت دی ہے؟ بنا احساس اور جذبات کے ان تحائف کی کوئی اہمیت ہے بھی۔؟ تمہارے لیے احساس اور جذبات تو ہیں میرے اندر لیکن محبت۔ تمہارا جائز مقام، حق۔؟"

وہ صوفے کے پاس کھڑا نیند میں ڈوبے چہرے پر پھیلی طمانیت کو دیکھ کر بے آواز اس سے مخاطب تھا۔ سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر اندرونی خوشی کا اثر تھا۔

وہ نیچے لٹک رہی چادر ٹھیک سے اس پر ڈال کر بستر پر آ گیا لیکن اس شب نیند اس کے پاس نہیں آئی۔

☆☆☆

اعظم میر کا زیادہ وقت قرۃ العین کے ساتھ گزرتا تھا ان دونوں کے ساتھ اکثر دیبا بھی شامل ہو جاتی۔ وہ اس سے بھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کے علاوہ کسی اور سے آرام اور بے تکلفی سے بات کرنے لگی تھی۔ ان کی پدرانہ شفقت اس میں اعتماد بھر رہی تھی۔ قرۃ العین کو دیگر جسمانی عارضے بھی لاحق ہونے لگے تھے۔ موتیا بند کے علاوہ انہیں ذیابیطس بھی لاحق ہو گیا تھا۔ سیڑھیوں سے گرنے کے بعد سے گھٹنے کا درد بھی رہتا ہی تھا۔

وہ دونوں چہل قدمی کے لیے جا رہے تھے کہ ڈرائنگ روم میں دیبا کو دیکھ کر قرۃ العین کا ارادہ بدل گیا۔

"میں بیا کے ساتھ جاؤں گی۔"

"آ جاؤ بھئی تم بھی ہمارے ساتھ۔" اعظم میر نے کہتے ہوئے ہاتھ سے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"آپ نہیں۔" انہوں نے نروٹھے پن سے کہا۔

"صرف میں اور بیا ہم دونوں ہی واک کو جائیں گے۔"

"او کے۔ جاؤ بیا۔" انہوں نے تو آرام سے کہہ دیا لیکن دیبا کو بڑا برا لگا۔

اتنا برا کہ اگلی صبح جب وہ اخبار پڑھ رہے تھے تو انہیں چائے دینے کے بعد وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ انہیں کہنا چاہتی تھی کہ آپ ان کی بات کو دل پر نہ لیں۔ اسے قرۃ العین کا اعظم میر پر اسے ترجیح دینا

اپنی خطا لگ رہا تھا۔ وہ ان حالات میں بیوی کا جتنا اور جیسا خیال رکھ رہے تھے، وہ اس کی گواہ تھی اور وہ اس برتاؤ کے مستحق نہیں تھے جیسا ان کے ساتھ اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے اپنی پھوپھو پر رشک آتا تھا اور ان دونوں کے ایک ساتھ جانے کے بعد اعظم میر کا پیچھے تنہا رہ جانا اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے اخبار بند کر کے رکھا۔

''کل پھوپھو نے مجھے۔'' اسے عادت کہاں تھی اب بھی اس سے جملے نہیں بن رہے تھے۔

''وہ۔ مجھے اپنی کزن سمجھ رہی تھیں، اس لیے۔ وہ ماضی میں تھیں۔ ورنہ پھوپھو۔ وہ آپ سے۔۔'' وہ جس طرح مسکرائے، وہ رک گئی۔

''تم بہت حساس ہو بیٹا۔'' ایسی شفقت سے اسے اعظم میر سے پہلے کسی مرد رشتے دار نے مخاطب نہیں کیا تھا، وہ سارے مرد جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔

''تم ابھی نہیں سمجھوگی۔ محبت احساس اور خلوص جب ایک سطح پر ہو تو پھر اس سے مضبوط رشتہ کوئی نہیں ہوتا، اس کے بعد کوئی بات، کوئی راز، کوئی انہونی، کوئی جھٹکا دو نفوس کو جوڑنے والی کڑی کو کمزور کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا اور تعلق کا حسن یہ ہی رفاقت تو ہے جس میں ماضی اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، سب کچھ حال ہوتا ہے، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں۔ اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ عینی کا دل بدلا ہے نہ محبتیں، کہیں کھوئی ہیں بس اس کا دماغ دغا دے گیا ہے لیکن میں خوش ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ وہ میرے پاس، میرے ساتھ، میرے سامنے ہے، مجھے اس کے ہر احساس کی خبر ہے۔ وہ کہنے سے قاصر ہے لیکن میں سمجھنے سے نہیں، وہ اظہار سے معذور ہے مگر میں پذیرائی سے نہیں۔'' وہ ذرا رکے۔

''مجھے عینی کی کسی حرکت، کسی بات سے تکلیف ہوتی ہے نہ برا لگتا ہے۔ ہم اس اسٹیج سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ تم اتنا نہ سوچو۔''

اس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔

''تمہیں پتا ہے نا ہمارا بچپن ایک ہی محلے میں گزرا ہے؟ ہم پڑوسی تھے۔ ساتھ میں چھپن چھپائی اور کرکٹ کھیلتے تھے۔ ہمارا اسکول بھی ایک ہی تھا۔ بعد میں میں پڑھائی کے لیے دوسرے شہر چلا گیا لیکن۔'' وہ دلچسپی سے سننے لگی تھی۔

☆☆☆

خود کو ہشاش بشاش اور صحت مند سمجھنے اور دکھانے والے اعظم میر کو اچانک شام میں اس قدر گھبراہٹ نے گھیرا کہ شانو انہیں لے کر اسپتال بھاگی۔ فون ملتے ہی منیب بھی وہاں پہنچا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔

جانے اور کون کون سی اور کتنی آزمائشیں باقی تھیں۔ اعظم دو دن اسپتال میں رہ کر ڈھیروں ہدایات اور دواؤں کے نسخے لے کر واپس آگئے۔ انہیں گھر میں موجود قرۃ العین کی فکر تھی۔ سلمان اور منیب باری باری ان کے پاس رکے تھے۔

منیب کو افسوس تھا کہ وہ باپ کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ ایک عمر کے بعد سب ہی کو احتیاط اور وقتی جانچ کے ساتھ ساتھ ذہنی و جسمانی سکون کی حاجت ہوتی ہے اور اعظم میر کی زندگی میں جب یہ وقت آیا تو انہیں وہ ملا جس سے انہیں بچنے کی ضرورت تھی، ذہنی جسمانی مشقت اور فکریں۔

''میں ٹھیک ہوں اب، تم سب اپنی پریشان شکلیں درست کر لو۔'' گھر آ کر انہوں نے سب کو ڈانٹ لگائی۔

''آپ خود سے بالکل لاپروا ہو گئے ہیں پاپا۔ آپ بھول گئے ہیں، اب آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑا اسلو ہونے کی ضرورت ہے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''اس اسپیڈ بریکر نے یہ بات ذہن نشین کرا دی ہے بیٹا۔ تم فکر نہ کرو، اب خیال رکھوں گا۔

ہمیں جتنی سانسیں گن کردی گئی ہیں وہ کسی بیماری یا صحت مندی کو دیکھ کر اپنی گنتی کم زیادہ نہیں کرتیں، وہ بس مقررہ وقت کی منتظر ہوتی ہیں، مدت پوری ہوئی اور وہ تھم گئیں اس لیے وقت سے پہلے فکر کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں احتیاط تو لازم ہے جو میں کروں گا۔"

وہ پہلے سے فکر مند اولاد کو اپنی وجہ سے مزید تفکرات نہیں دینا چاہتے تھے۔

"تم سب بھی اسے سر پر سوار مت کرو۔" وہ حوصلہ دینے کے لیے خوش دلی سے مسکرائے تھے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے دیبا کو ان کی غذا اور پرہیز کا بتایا اور وہ خود ان کی دوائیوں اور وقفے وقفے سے ڈاکٹر سے جانچ کا خیال رکھنے لگا۔

سلمان اور قاریہ بھی باپ کی خیریت پوچھنے آئے تھے۔ فاصلوں نے ان کے بیچ تکلف کی دیوار کھڑی کردی تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی یکسانیت بھی انسان کو تھکا دیتی ہے۔ یہاں تو یکسانیت کے ساتھ اداسی اور ذہنی پریشانیاں بھی تھیں۔ زندگی جس نہج پر چل پڑی تھی، وہ کسی نے سوچا نہ تھا۔ سلمان ان تینوں میں پہلے سے ہی قدرے خود غرض اور لاپروا سا تھا لیکن وہ اس مشکل وقت میں یوں آنکھیں پھیر لے گا ایسا بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ مہینوں گھر آتا تھا نہ فون کرتا تھا۔ جب اعظم میر یا منیب اسے فون کرتے تو بات ہوتی، وہ اسے گھر آنے کا کہتے تو ملاقات۔ چند سالوں میں ہی ان سب کی زندگی کے منصوبے، خواہشیں اور خواب بدل گئے تھے۔ سب کچھ قبول کر لینے کے بعد بھی کبھی کبھی اسے لگتا وہ کسی اور کی زندگی جی رہا ہے۔

وہ اسی شہر میں اٹک گیا تھا۔ جب کہ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک سال بعد اپنی فرم ممبئی یا بنگلور منتقل کرے گا۔ اسے اپنا کام خوب بڑے پیمانے پر پھیلانا تھا۔ کبھی کبھی ساری باتیں ایک ساتھ اسے اداس کرنے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی تھیں۔ اس پر تم اب اعظم میر کی گرتی صحت تھی۔ وہ اس کے لیے ہمت اور امید کی چٹان تھے اور اب اسی چٹان کو مٹی ہوتے دیکھنا اعصاب شکن تھا۔ وہ پہلی بار اس بھری دنیا میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

اب اکثر اسے منفی سوچوں کا دورہ پڑنے لگا تھا۔ ماں کے بعد یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ سب کچھ ویسا ہی رکھتا جیسے قرۃ العین نے رکھا تھا۔ اس گھر کو سنبھالنا اس کی ذمہ داری تھی جس میں وہ ناکام ثابت ہوا تھا۔ شانو کی پڑھائی سے دوری اور سلمان کی گھر سے دوری اور اعظم میر کے دل کا دورہ اسے سب اپنی ناکامی لگنے لگے تھے۔

دیبا چائے کا خالی کپ لینے واپس آئی تھی۔ اسے یوں بت بنا بیٹھا دیکھ کر رک گئی۔ چائے کا کپ جوں کا توں پڑا تھا۔ پلٹ کر واپس جانے کے بجائے وہ انگلیاں مروڑتی وہیں جمی رہی پھر کچھ ہمت جمع کر کے آگے آئی۔ اس کے کھنچے چہرے کی تھکان اور اداسی نے اسے یوں بے چین کیا تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ گئی تھی مگر اب کیا کہے، کیا کرے، سوجھ نہیں رہا تھا۔

اس کے اتنے پاس آنے پر منیب چونکا۔

"اوہ سوری۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" اس نے گردن گھما کر کپ کو دیکھا۔

"تم گرم کردو میں ادھر ہی آرہا ہوں۔"

وہ بیڈ سے اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے جانے لگا تھا کہ دیبا نے روکنے کے لیے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جتنا وہ حیران ہوا، دیبا اس سے زیادہ حیران تھی۔

" آپ آرام کریں، میں یہیں لے آتی ہوں۔" اس نے اپنے دائمی ہچکچاتے انداز میں کہہ کر ہاتھ چھوڑا اور کپ اٹھا کر جانے لگی تھی کہ اب کے منیب نے بے قراری سے ہاتھ پکڑ کر روکا۔ ذرا دیر پہلے اس لمس میں اسے جو تسلی اور اپنائیت ملی تھی وہ اسے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ دیبا سراسیمہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اس سے خطا تو سرزد ہوئی تھی۔

منیب نے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر

سابقہ جگہ رکھا اور خود بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ منیب نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لیا۔ اب وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بیٹھا تھا۔ دیبا دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ منیب نے کچھ ساعتوں بعد سر اٹھایا تو اس کا چہرہ دیکھ کر خفیف سا مسکرا دیا۔

"ڈر کیوں رہی ہو، کیا میں تمہارا ہاتھ نہیں تھام سکتا؟"

"آپ مجھے بھی تھام سکتے ہیں۔" وہ یہ سوچ ہی سکتی تھی اور سوچ کے ہی رہ گئی۔ منیب کی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دور کر دی تھیں۔

"تم کچن میں برنر پر کچھ چھوڑ آئی ہو؟" دیبا نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔" اس نے خود ہی ایک ہاتھ چھوڑ کر اسے پلنگ پر اپنے بازو میں بٹھا لیا۔

وہ گردن موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ دیبا نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے گال کو چھوتی بالی سے پھسلتی نظر چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ جب وہ بڑی دیر تک خاموش رہا تو دیبا نے جھجکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے؟" ہاتھ پکڑ کر روکنا اس کا بے اختیاری عمل تھا لیکن اس کے بعد جو منیب کا ردعمل تھا، اس نے یہ اختیاری جملہ اس سے بلوایا تھا۔ آج اس سے جس نے یہ پیش قدمی کروائی تھی وہ پریشانی نہیں تنہائی تھی۔

"اگر کر رہی ہے تو تم کیا کرو گی؟" اس نے سر اونچا کر کے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔

"م۔ میں۔ میں آپ کو تسلی دے سکتی ہوں۔" اس کا وہی دھیما اور رکتا ٹھہرتا لہجہ۔

"کیسے؟"

"آپ ناامید نہ ہوں، اللہ پر یقین رکھیں، دعا کرتے رہیں، اس سے ہمت اور رہنمائی مانگیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہتی رک گئی۔

"مجھے سکون سے سر رکھ کر آنکھیں بند کرنے کے لیے کاندھا اور ایک ایسی پیار بھری تھپکی چاہیے جس کے بعد کچھ مشکل نہیں لگتا، سب ٹھیک ہو جاتا ہے، جیسی امی اور پاپا سے ملتی تھی۔" حسرت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی اور اس کی آواز کی ایمان داری اس کے لفظوں سے زیادہ پراثر تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن جب بولی تو اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"یہ دونوں تو کب سے آپ کی دسترس میں ہیں۔" منیب نے پلکیں جھپک کر آنسو روکتی دیبا کو دیکھا۔ کبھی کبھی ناممکن اور پہاڑ سی لگنے والی مشکل ایک پل میں سہل ہو جاتی ہے۔ وہ احساس اور جذبات کی ترجمانی اور اظہار کے معاملے میں صفر تھی، اسے دل کی بات کہنے کا سلیقہ تھا نہ تجربہ لیکن اس وقت بنا کسی جھجک اور تامل کے یہ راست گوئی اس کے جذبات عیاں کر گئی تھی۔ اس کے لیے اس نے کوشش کی تھی نہ ہمت کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کا اظہار جتنا سچا تھا اتنا ہی بے ساختہ تھا۔

"اور میں بے وقوف جواب تک خود کو محروم رکھے ہوئے تھا۔" اس نے دست و بازو کو حرکت دے کر اسی پل اپنی محرومی کا ازالہ کرتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد اس کی پشت تھپکتے ہوئے اسے اعظم میر کی بات یاد آئی تھی۔

"شادی کی اصل خوبصورتی رفاقت ہے بیٹا، یعنی اس میں ربط، دوستی اور مصاحبت ہو تو یہ دنیا کا خوبصورت رشتہ بنتا ہے۔"

"جانے ان میں سے آج ہمارے بیچ کس کی بنیاد پڑی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ منیب میر کے اندر ذرا دیر پہلے ہوئے کوتاہ اندیشی و کوتاہ نگاہی کے احساس کے ساتھ ہی سکون اترا تھا۔ اس کی تھکن زائل ہونے لگی تھی۔ اس نے جانا کہ وہ اتنا تنہا نہیں تھا جتنا وہ خود کو سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

سلمان مٹھائی کے ساتھ انہیں خوش خبری

سنانے آیا تھا۔ فاریہ امید سے تھی۔

''سلمان کی شادی کب ہوئی؟'' قرۃ العین کا پہلا سوال تھا۔ شانو نے انہیں موبائل میں تصویریں دکھائیں جن میں وہ بھی تھیں۔

''تو منیب کی بیوی کہاں ہے؟'' تصویر دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''یہ دیبا بھابھی تو ہیں امی! منیب بھائی کی وائف۔'' شانو نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا، یہ ہے، اچھی ہے۔'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

کچھ دیر بعد باتوں کے درمیان انہوں نے مٹھائی کے ڈبے سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''تمہاری خوش خبری پر تمہارا ابھی منہ میٹھا نہیں کیا۔'' ان کا بڑھا ہاتھ دیکھ کر وہ الجھی تو سہی ساتھ ہی حیا سے سرخ ہوگئی۔ اعظم میر نے اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر ان کے قریب ہوئی۔ انہوں نے اس کے منہ میں مٹھائی ڈالتے ہوئے خیال رکھنے کی ہدایتیں جاری کیں۔

سلمان تو چلا گیا لیکن اس کے بعد وہ سب سے چھپتی پھرنے لگی۔

وہ رات بھی بہت دیر سے کمرے میں آئی جب منیب بھی بتیاں بند کر کے سوگیا تھا۔ کمرے میں اتنا اندھیرا نہیں ہوتا تھا جتنا اس وقت تھا۔ دبے پیر چلتی وہ الماری تک آئی اور اندازے سے ٹٹول کر پٹ کھول کر چادر اور تکیہ نکالا۔ آہٹ پر منیب کی آنکھ کھلی اور گھپ اندھیرا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ بتی جلانے کی نیت سے وہ آگے بڑھا اور ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے صوفے تک پہنچنے کی کوشش کررہی دیبا سے ٹکرا گیا۔

''دیبا؟'' اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''جی۔'' اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

''اتنا اندھیرا کیوں، تم نے نائٹ بلب بند کردیا؟''

''نہیں۔ میں آئی تو ایسے ہی اندھیرا تھا۔''

''دروازے کے پاس ہی سوئچ ہے، لائٹ آن کرلیتیں۔'' وہ چپ رہی۔ وہ تو یہ سوچ کر اندھیرے میں چل رہی تھی کہ وہ اندھیرا کر کے سویا ہے۔

''یہیں رکو۔'' اس نے اندازے سے اسے شانوں سے تھام کر ایک طرف کیا اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ پل بعد کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ وہ نائٹ بلب جلا کر سونے لیٹا تھا۔

''فیوز ہوگیا ہے، آج اندھیرے میں ہی سونا پڑے گا۔'' اس نے بلب کا جائزہ لینے کے بعد اسی جگہ کھڑی دیبا کو دیکھا۔ وہ کوئی بات کہیں کے انداز میں سر ہلاتی صوفے کے پاس آگئی۔ تکیہ سرہانے رکھ کر وہ لیٹ گئی تب منیب نے بتی بجھادی اور اپنی جگہ آگیا۔ کمرے میں پھر گھپ اندھیرا تھا۔

دیبا جو نیند سے بے حال اندر آئی تھی، اب پوری طرح جاگ گئی تھی۔ کروٹ لے کر اس نے ہاتھ یوں صوفے پر رکھا تھا جیسے وہ اب بھی منیب کی گرفت میں ہو۔ وہاں مچل رہے ننھے ننھے جگنو اسے سونے نہیں دے رہے تھے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ پلنگ پر لیٹا منیب بھی کچھ اسی کیفیت سے گزر رہا ہے ورنہ اس کا دل جانے کیسے قابو ہوتا!

☆☆☆

اسے صبح سے چھینکیں آرہی تھیں لیکن اس نے بیان نہیں دیا۔ وہ نزلہ زکام کی دوا لینے سے حتی المقدور پرہیز کرتی تھی۔ وجہ ان کو پھانکنے کے بعد آنے والی بے ہوشی جیسی نیند تھی۔

''تم دوا لو اور آرام کرو۔'' صبح اس کی سرخ ناک اور بدلی آواز پر منیب نے کہا تھا۔

''جی۔'' اس نے سر ہلا کر ہامی بھر لی تھی کہ اسے انکار نہیں کرسکتی تھی۔

''کمرے میں رکھی ہے یا تم پاپا سے لے لینا، ان کے پاس بھی ہوگی۔'' آفس سے دیر ہورہی تھی ورنہ وہ خود ہی اسے تھما جاتا۔

شام تک اس کی حالت مزید خراب ہوگئی۔ اعظم میر اسے کام چھوڑ کر کمرے میں آرام کرنے کا کہہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو وہ ہنوز مصروف تھی۔

''یہ ٹیبلیٹ اور چائے کا کپ لے کر کمرے میں جاؤ اور اس کے بعد کچن میں نظر نہیں آنا۔'' انہوں نے پیار بھرا حکم دیا۔

''میں کھانا تیار کر دوں پھر چلی جاؤں گی۔''

''کھانا باہر سے آسکتا ہے اور باقی کام شانو دیکھ لے گی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے، وہ آرہی ہے۔'' تب ہی شانو بھی آگئی۔

''آپ مجھے آواز دے دیتیں ناں بھابھی۔'' اسے زور سے چھینک آئی۔

''آپ کمرے میں جائیں۔ میں دوائی اور چائے دونوں لاتی ہوں۔'' اس نے باپ کے ہاتھ سے دوا لے کر دیبا سے کہا۔ اسے چار و ناچار کمرے میں جانا پڑا۔

کمرہ اور پلنگ خالی تھا۔ وہ پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد شانو چائے بسکٹ اور دوائی اسے دے گئی۔

''آپ کمرہ بند کر کے آرام کریں۔'' جاتے ہوئے اس نے کہا۔

اس نے چائے کے ساتھ دوالی اور چادر اوڑھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ رات تو ہو ہی گئی تھی۔ اب وہ بے ہوش ہو کر بھی سوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ بے خبر سو رہی تھی۔

رات کے جانے کس پہر اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ نیم تاریکی میں اسے یاد آیا، وہ دوائی لے کر سوئی تھی۔ اب بھی اس پر غنودگی سوار تھی۔ اس نے ٹٹول کر اپنی چادر اوپر کھینچنی چاہی، اس کوشش میں اس نے آنکھیں نیم وا کیں اور تھم گئی۔ وہ پلنگ پر تھی اور سامنے یقیناً منثیب سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔

اس نے چادر بھول کے کم سے کم ہلچل اور آواز کیے بنا پلنگ چھوڑنے کی کوشش کی تا کہ منثیب کی نیند نہ ٹوٹے۔

ابھی پوری طرح اٹھی بھی نہیں تھی کہ منثیب نے ہاتھ بڑھا کے اسے واپس لٹا دیا۔ اس کا سانس رک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ منثیب کا ہاتھ اب بھی اس کے کاندھے پر تھا۔ اس نے دم سادھے تنفس کو بحال کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور اس کے چہرے کو دیکھنے کے بجائے درمیان کے خلا پر نظر ٹکا دی۔ ابھی وہ صوفے سے یہاں آنے کا سفر سوچ ہی رہی تھی کہ منثیب نے اپنے اوپر پڑا لحاف اس تک پھیلا کر خلا کو مدغم کر دیا۔

اگلی صبح گھر میں دو افراد چھینک رہے تھے۔

☆☆☆

منثیب کو اس کے آس پاس منڈلاتے اور دیبا کو شرماتے دیکھ کر اعظم میر سب سے زیادہ خوش تھے۔ وہ پہلے بھی ان کے فاصلوں سے واقف تھے لیکن منثیب پر زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس نے شادی کی ہامی بھر کے ہی بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔ وہ عروبہ کے متعلق جانتے تھے، اس لیے سمجھتے بھی تھے کہ اس کے بعد اسے وقت چاہیے۔ انہیں اتنا تو یقین تھا کہ اس نے دیبا کی ذمہ داری لی ہے تو کوتاہی نہیں کرے گا اور بیٹے نے ان کا یقین قائم رکھا تھا۔

پہلے ایک سال تک گھر کے در و دیوار نے اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی پھر وہ چند جملے کہنے لگی تھی اور اب تقریباً تین سال بعد اس کی ہنسی کی کھنک سے در و دیوار بھی خوش تھے۔

شانو سنجیدگی سے بیکنگ کو اپنا پروفیشن بنانے پر غور کر رہی تھی۔

سلمان کا خاندان بیٹی کی آمد کے بعد مکمل سا تھا۔ وہ ان سے دور ہی ہوتا جا رہا تھا۔ عابدہ ان کے ہی ساتھ رہنے لگی تھیں۔

پھر بڑی خاموشی سے ایک قیامت آئی۔ اعظم میر رات کو سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ جب قرۃ العین کے جگانے پر وہ اٹھے نہیں تو انہوں نے گھبرا کے منثیب کو آواز لگائی۔ باپ کے سرد جسم کو چھوتے

ہی یتیمی کا احساس اسے گھائل کر گیا۔

شانو کو اگر ماں کی فکر نہ ہوتی تو وہ کبھی خود کو سنبھال نہیں پاتی۔ اس نے ان کی خاطر خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ جب سب کے درمیان انہوں نے روتی شانو کے کان میں سرگوشی سے پوچھا۔

"کس کی میت ہے؟" تو وہ ساکت ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو، اپنے گھر کو اس وقت دنیا کے لیے تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ باپ کا آخری سفر عزت اور وقار سے طے ہو اس کی خاطر اس نے غم منانا موخر کر کے خود کو سنبھال لیا اور ایک بار پھر ماں کا سایہ بنی ان کے ساتھ رہی۔

کبھی وہ سب کو روتے دیکھ کر رونے لگتیں تو کبھی سب کو تسلی دیتیں اور جب انہیں اپنے خسارے کا احساس ہوا تو وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور رونے لگیں۔

سلمان کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں بہت وقت ہے، معاملات استوار کرنے، معافی مانگنے، پلٹنے اور سنبھلنے کے لیے لیکن تقدیر کا لکھا ایسے وقت ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے کہ وقت کسی کا نہیں۔ سلمان کے ملال عارضی تھے یا دیرپا، یہ وقت کو طے کرنا تھا اور رہا منیب تو وہ پہلی بار رب سے شکوہ کناں تھا۔ کسی کی تسلی اور دلاسا اسے سکون نہیں دے رہا تھا۔

وہ سوجی سوجی آنکھیں لیے کام میں لگی تھی۔ اس کا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنے دکھتے دل کی وجہ سے اسے ان سب کی تکلیف کا احساس بھی بہت زیادہ تھا۔

اعظم میر اور اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا مگر ان میں اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ اسے اپنے سگے والد کی صورت بھی تصویر والی یاد تھی۔ تین سال کی عمر میں اس نے انہیں کھویا تھا۔ چاچا اور ماموں نے اسے اپنے رشتے والی محبت اور توجہ نہیں دی تو وہ باپ کی کمی کیا پوری کرتے۔ اسے لگ رہا تھا ان تینوں کے ساتھ آج وہ بھی یتیم ہوئی ہے۔

وہ چولھے کے پاس کھڑی تھی جب وہ اسے ڈھونڈتا اندر آیا۔ آہٹ پر اس نے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں اور کپ نکالنے لگی۔ منیب نے ہاتھ سے کپ لے کر رکھا اور اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ وہ نظر جھکائے ضبط سے سرخ تھی۔ وہ اس کے پاپا کو ان سب کی طرح عزیز تھی، صرف یہی وجہ کافی تھی مگر اب تو اس کے پاس اپنی بھی وجہ تھی۔ اس نے کچھ کہے بنا اسے خود سے قریب کیا اور اس کے سارے ضبط ختم ہو گئے۔

عروبہ دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔

"وہ۔ سب وہاں۔ چائے کا پوچھ رہے ہیں۔" اس نے آہٹ پر دروازے کی سمت متوجہ ہوئے منیب سے کہا۔

"تم خود دیکھ لو۔" وہ دیبا کا ہاتھ تھامے اس کے بازو سے گزر گیا۔ عروبہ پلٹ کر انہیں راہداری کے سرے پر منیب کے کمرے میں جانے تک دیکھتی رہی۔ اسے شدت سے اپنی غلطی اور نقصان کا ادراک ہوا تھا۔

"آپ یہاں کیوں لے آئے؟ کام بہت ہیں، وہاں سب پوچھیں گے۔" اس نے پیچھے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ دیبا نے کہا۔ اس کی روئی سی آواز تھکن کے بوجھ سے دبی تھی۔ اس کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن عروبہ کو دیکھ کر بے اختیار ہی وہ اسے کمرے میں لے آیا تھا کہ بھرے گھر میں انہیں خلوت کی ضرورت تھی جو اس وقت یہیں میسر تھی۔

"کیوں کہ مجھے بھی تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"کوئی بھی اس وقت ٹھیک نہیں، آپ بھی نہیں ہیں۔" وہ انجانے میں اسے لاجواب کر گئی۔ اگر وہ اسے تشفی دینا چاہتا تھا، اسے اپنے ساتھ ہونے کا احساس دلانا چاہتا تھا تو وہ بھی وہی کر رہی تھی۔

اس بار اس نے دیبا کے گرد بازو پھیلائے تو صرف اس کے ہی نہیں اپنے آنسوؤں کو بھی راستہ دیا

تھا۔

☆☆☆

قرۃ العین اب ایک دم تنہا ہو گئی تھیں۔ عابدہ ان ہی کے کمرے میں سونے لگی تھیں۔ شانو کا زیادہ وقت بھی ماں کے ہمراہ گزرتا تھا لیکن وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ جانے اعظم میر کیسے قرۃ العین کو سنبھالتے تھے کہ اب وہ تینوں مل کر بھی ویسا نہیں کر پا رہے تھے۔

سلمان اور فاریہ کچھ دن ان کے ساتھ ٹھہرے تھے لیکن اس کے بعد سے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ سب کو ان کی بے رخی اور سرد مہری کا دکھ تھا مگر ان سب کے ساتھ منیب تنہا ہی ایک اور پچ سے نبرد آزما تھا۔

کروٹیں بدل بدل کر بالآخر وہ بستر چھوڑ کے اٹھ گیا۔ اس نے گہری نیند میں ڈوبی دیبا کو دیکھا اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے لان میں چلا آیا۔ ٹہل ٹہل کر بھی جب بے چینی کم نہ ہوئی تو وہ پورچ کے زینے پر بیٹھ گیا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" وہ بازو میں آکر بیٹھی تو وہ چونکا۔

"نیند نہیں آرہی۔ تم کیوں ادھر آگئیں؟"

"آپ کو ڈھونڈتے ہوئے آگئی۔" وہ کبھی ایسے رات کو اٹھ کر کمرے سے باہر نہیں گیا تھا، شادی کے اولین دنوں میں بھی نہیں جب ایک ان چاہی ہستی کی موجودگی اسے ناگوار گزرتی تھی۔

"آپ کو انکل کی یاد آرہی ہے؟" دیبا نے دھیرے سے پوچھا۔

"وہ تو ہمیشہ آتی ہے، تمہیں بھی آتی ہوگی۔"

"ہاں۔ مجھے بھی بہت یاد آتے ہیں انکل۔" وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس کے جملے سے زیادہ وہ اس کے انداز اور چہرے کے تاثر پر ٹھٹکی اور اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی اور اسی پل منیب کا ارادہ بدل گیا۔

"کہیں ناں!" خاموشی کے طویل ہوتے وقفے پر دیبا نے کہا۔

اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی محبت کے اظہار کے لیے انگریزی کے تین لفظوں کا سہارا لیا اور وہ بری طرح شرما گئی۔ منیب نے بازو بڑھا کر ہنستے ہوئے اسے قریب کیا اور پھر دہرایا۔ وہ مزید سرخ ہوتی چہرہ چھپانے لگی۔

"تم سن کر جیسے ری ایکٹ کر رہی ہو، اس کا مطلب ہے، میں تم سے ایسے کنفیشن کی امید نہ ہی رکھوں؟" منیب نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کے چہرہ اونچا کیا۔ اس نے جھکی آنکھوں کے ساتھ یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔

"نہ ہی رکھیں!"

"اوہ دیبا!" اس نے ہنستے ہوئے اسے مزید قریب کر لیا۔

جس نے اس کی نیند اڑا دی تھی، وہ بات وقتی طور پر اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لیکن اس کا اضطراب کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور آخر آج وہ یہ بوجھ ہلکا کرنے کے ارادے پر عمل پیرا ہوا تھا۔

"تم میرے لیے کسی راہ چلتے اجنبی سے زیادہ نہیں تھیں، تمہیں دیکھ کر ہمیشہ ہی میرا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ ڈری سہمی دیبو سی دیبا مجھے اپنے گھر میں بھی کوفت زدہ ہی کرتی تھی لیکن پھر امی کے ساتھ تمھارا برتاؤ اور پاپا کی باتوں کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ تم درد مند اور مخلص ہو لیکن شادی میں نے تم سے مجبوری میں کی تھی، دل پر پتھر رکھ کے، وہ مجھے اپنی زندگی کا سیاہ ترین دن لگا تھا۔ میں تمہیں اپنی لائف پارٹنر کے روپ میں تصور ہی نہیں کر پا رہا تھا، تم میرے لیے ان پڑھ اور گھر میں رہنے والی اعتماد سے خالی لڑکی تھیں اور ایسی لڑکیاں مجھے سخت ناپسند تھیں۔

لیکن تمہیں اس گھر میں رکھنا ضرورت تھی، کوئی اور مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ تھا اور تمھارا نام پاپا

نے لیا تھا۔ جب کہ مجھے عروبہ پسند تھی، مجھے اس سے محبت تھی یا مجھے لگتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے، اس نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تھا، وہ امی کی بیماری کے بعد والی سچویشن میں مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر یہ گزری باتیں ہیں سچ یہ ہے کہ اب میرے دل میں، میری زندگی میں بس تم ہو تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے، جیسے تم نے میرے دل کو چھوا ویسے کبھی کوئی نہیں کر سکا نہ کبھی کر سکے گا۔ تم مجھے عزیز ہو، مجھے تم سے محبت ہے، بے حد، بے انتہا، بے تحاشا۔"

اس نے وہ تلخ وترش جملے کہے تھے کہ اگر وہ دوبارہ انہیں اس کے منہ سے سنے تو اسے دکھ اور صدمہ نہ ہو اور اب وہ جو کہہ رہا وہ حسین یادوں کو وقت میں قید کرنے کی سعی تھی کہ جب کبھی اس کا ذہن دغا دے جائے تو اسے یہ منظر یاد آئے، وہ انہیں دہرائے۔

دیبا سب سمجھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اسے اعظم میر کی باتیں اب مکمل سمجھ میں آئی تھیں۔

"خدانخواستہ کبھی میں بھی کسی وجہ سے ڈمینشیا کا شکار ہو جاؤں، باتیں بھولنے لگوں، ماضی کی آدھی ادھوری بات اور یاد کا ذکر کروں تو میری آج کی باتیں ہمیشہ یاد رکھنا، میرا، ہمارا سچ یہ ہے کہ تم اہم ہو، عزیز ہو اور تم ہی سے مجھے محبت ہے۔" وہ کچھ دیر ٹھہر کر اپنے اور اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔

ذہنی مرض، مہلک، خطرناک اور طویل بیماری، ان میں بظاہر تو گھر کا ایک ہی فرد مبتلا ہوتا ہے لیکن یہ کسی نہ کسی سطح پر گھر کے ہر بندے کو بیمار کر دیتی ہے۔ اسے بھی اندیشوں کا مرض لاحق ہوا تھا۔

"میں یہ کسی سے کہنا نہیں چاہتا لیکن اب مجھ سے بوجھ سنبھل نہیں رہا۔ پاپا کی وفات سے پہلے شام میں، میں نے ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔ امی پھر کسی پچھلے وقت اور منظر میں تھیں۔ وہ پاپا سے راز داری میں کہہ رہی تھیں کہ۔" یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین لمحہ تھا۔

"گھر واپس آتے ہوئے انہیں نوید نے خط دیا، اس نے لکھا تھا کہ وہ انہیں پسند کرتا ہے اور۔ وہ ان سے وہ سب کہہ رہی تھیں جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں اس وقت پاپا کا چہرہ دیکھ نہیں سکا تھا لیکن یہ سوچ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا کہ صبح ان سے بات کروں گا لیکن صبح۔" وہ بھاری ہوتی آواز سنبھالتے رک گیا۔

"آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔" اس نے تیزی اور بے قراری سے کہا۔

"انکل اور پھپھو کا رشتہ ایسا نہیں تھا کہ انکل اس بات کا اس قدر صدمہ لیتے اور سب سے اہم کہ موت کا دن معین ہے، کوئی دکھ، کوئی سانحہ اسے وقت سے پہلے نہیں بلا سکتا۔"

"میں بھی خود کو یہ سب سمجھا رہا ہوں دیبا! لیکن دل نہیں مانتا۔ میرے دل سے یہ خیال جاتا ہی نہیں کہ پاپا کو اس بات سے تکلیف پہنچی ہوگی، یہ ان کے لیے بہت اچانک، غیر متوقع اور شدید تھا۔ اتنا کہ وہ سہہ نہ سکے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، بچپن لڑکپن کی یہ باتیں اتنی اہم نہیں ہوتیں۔" اس نے اس کے موقف کی پرزور مخالفت کی۔

"ایک بار مجھے انکل نے کہا تھا۔ وہ سن کر شاید آپ پھپھو اور ان کے رشتے کی گہرائی اور گیرائی سمجھ سکیں۔ انہوں نے کہا تھا۔" وہ ان کی باتیں دہرانے لگیں جو آج بھی اسے یاد تھیں۔

"محبت احساس اور خلوص جب ایک سطح پر ہو تو پھر اس سے مضبوط رشتہ کوئی نہیں ہوتا، اس کے بعد کوئی بات، کوئی راز، کوئی انہونی، کوئی جھٹکا دو نفوس کو جوڑنے والی کڑی کو کمزور کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا اور تعلق کا حسن یہ ہی رفاقت تو ہے جس میں ماضی اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی، سب کچھ حال ہوتا، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ عینی کا دل بدلا ہے نہ محبتیں کہیں

کھوئی ہیں بس اس کا دماغ دغا دے گیا ہے لیکن میں خوش ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں، کیوں کہ وہ میرے پاس، میرے ساتھ، میرے سامنے ہے، مجھے اس کے ہر احساس کی خبر ہے۔ وہ کہنے سے قاصر ہے لیکن میں سمجھنے سے نہیں، وہ اظہار سے معذور ہے مگر میں پذیرائی سے نہیں۔"

باپ کے الفاظ تھے، اس پر اثر کیسے نہ کرتے۔

"اس لیے آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں نہ انکل اور پھوپھو کے لیے نہ ہمارے لیے۔" اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر مثیب کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لیے۔

"پہلے تو یقین رکھیں، پھپھو جیسا کچھ آپ کے ساتھ نہیں ہوگا اور پھر یہ کہ مجھے بھی آپ کی کسی بات پر ایسا دکھ نہیں ہوسکتا، چاہے وہ بات آپ کے نزدیک کتنی ہی صدمے والی کیوں نہ ہو۔ مجھے وہ سب ملا ہے جس کا گمان نہ میں نے کیا تھا نہ کسی اور نے۔ ساری عمر کے لیے میرے اندر بس ایک احساس ہے اپنے رب کے لیے، آپ کے لیے اور وہ ہے شکر گزاری، اس پر کوئی دوسرا احساس حاوی نہیں ہوسکتا، کوئی بات اسے کمزور نہیں کرسکتی۔"

دبو، ذری سہمی سی لڑکی میں آج اس قدر اعتماد تھا کہ وہ مضبوط لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ اس سے بانٹ لینے کے بعد وہ قدرے ہلکا ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہی بات کسی اور کی زبانی سن کر ہی تسلی ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے اعظم میر کا فون ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی مگر فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے آگے بڑھنا چاہیے یا نہیں۔ بالآخر اس نے کانٹیکٹس کے سرچ بار میں 'نوید' لکھا اور نیچے نتیجے میں ایک ہی نمبر لکھا آیا۔

اس نے ذرا سے تامل کے بعد کال ملائی۔

"ہیلو۔ جی میں دیبا بات کر رہی ہوں، اعظم میر کی بہو۔" پہلی بار اس نے اپنا تعارف کروایا تھا اور یہ حوالہ اسے سب سے پیارا تھا۔

انہیں ان کی وفات کا علم نہیں تھا۔ وہ بھی سن کر حیران اور افسردہ ہوئے۔ انہوں نے باری باری سب کے متعلق پوچھا اور پھر الوداعی کلمات کے بعد فون رکھ دیا۔

فون کے بعد اگلے اتوار ہی وہ اپنی بیگم کے ساتھ ان سے ملنے آگئے۔ وہ دوسرے شہر سے اپنی کار سے آئے تھے۔

قرۃ العین انہیں اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے نوید احمد کو پہچانا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد شانو انہیں واپس کمرے میں لے گئی تھی۔

"کتنا بدل گیا ہے سب!" ان کی آواز میں افسوس تھا۔

"پاپا کے بعد امی زیادہ خاموش ہوگئی ہیں۔" مثیب نے کہا۔

"ہمم۔ ان کی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ کمال کی تھی۔ جب ان کی شادی کی بات چلی تو ہم سب حیران تھے کیوں کہ ہمارا سارا گروپ جانتا تھا کہ ان میں ایک دوسرے کے لیے ایسی کوئی فیلنگز نہیں ہیں۔ ہمیں یقین تھا، وہ انکار کر دیں گے لیکن دونوں نے بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور۔" وہ ہنسنے لگے۔

"شادی کے بعد مجھے اعظم نے کہا 'کیوں بے سالے اس لیے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ منع کر دے'۔ اور میں اتنا شرمندہ ہوا کہ سال بھر اسے اپنی شکل ہی نہیں دکھائی۔" وہ مسکراتے ہوئے چپ ہوگئے مگر ان کی بات کے پیچھے چھپی اہم کہانی کھل گئی تھی۔

"بھائی صاب جب بھی ملتے مجھے ضرور کہتے تھے کہ اس پر نظر رکھا کرو، اسے صنفِ نازک کو پریم پتر لکھنے کی عادت ہے۔" ان کی بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"انہوں نے اسکول میں یہ کام کیا تھا۔" مثیب کے حیرت سے کھلے منہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے شوہر کو مسکرا کے دیکھتے ہوئے وضاحت کی اور چائے کی ٹرے لیے آرہی دیبا کی آنکھیں اپنے اس جوئے کے جیتنے پر نم ہوگئیں۔

☆☆☆

شانو کی 'عینی میر بیکرز' ایک کامیاب بزنس ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھنے والی شانو اپنے کام میں خوش اور مصروف تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر کہتے تھے وہ بنی ہی اس کام کے لیے ہے۔

مُشیب ایک کم پڑھی لکھی اور مقام و رتبے میں اپنے سے کم لڑکی کے ساتھ خوش اور مطمئن تھا۔ اس کی فرم اب بھی اسی شہر تک محدود تھی۔ اس کا دوسرے شہر جانے اور اپنا کام پھیلانے کا خواب اب بھی طاق پر تھا لیکن اہم یہ تھا کہ اسے اس کا افسوس نہیں تھا۔

دیبا اپنی ماں کو آرام دہ زندگی گزارتے دیکھ رہی تھی، جس کی اسے شدید خواہش تھی لیکن اس نے کبھی اس کے پورا ہونے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔

سلمان کی اپنی الگ دنیا تھی۔ اسے کبھی کبھار ماں اور بہن بھائی کی یاد آجاتی تو وہ ملنے آجاتا تھا۔ وہ مکمل طور پر ان سے غافل نہیں تھا مگر اسے ہمہ وقت اس گھر میں، بیمار ماں کے ساتھ رہنا مشکل لگتا تھا۔

قرۃ العین کی یادداشت کے ساتھ اب جسمانی صحت بھی حد درجہ کمزور تھی۔ وہ خود سے چل پھر نہیں پاتی تھیں۔ انہیں ہمہ وقت ایک معاون کی ضرورت تھی۔

ایک بیماری نے کئی زندگیاں بدل دی تھیں۔ اس سے نبرد آزما افراد کی اپنی اچھائیاں، کمزوریاں اور حوصلے تھے جو انہیں اس مقام پر لے آئے تھے لیکن ان سب میں اعظم میر اگر 'اعظم میر' نہ ہوتے تو ان سب کی زندگیوں کا یہ روشن رخ بھی نہ ہوتا۔

وہ وہیل چیئر دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا جہاں سب قرۃ العین کے منتظر تھے۔ شانو کا بنایا خوبصورت کیک مرکزی میز پر سجا تھا۔ میز کے گرد شانو، دیبا، عابدہ اور سلمان کھڑے تھے۔ فاریہ بھی اپنی بیٹی کو گود میں لیے تھی۔ آج قرۃ العین کی سالگرہ تھی۔

ان سب کے چہرے دیکھنے کے بعد قرۃ العین نے کیک کو دیکھا تو مسکرا دیں۔ انہیں کسی کا چہرہ یاد نہ آیا مگر ان کا بیکنگ کا شوق اس وقت آنکھوں سے خوشی بن کر جھلک رہا تھا اور ان سب کے لیے یہ جھلک کافی تھی۔

شانو کو اتنی خوشی اپنے ڈاکٹر بننے کی نہ ہوتی جتنی اس وقت اپنے بنائے کیک کی وجہ سے ماں کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

کیک کاٹنے کے بعد سلمان نے اس سے پلیٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اسے ترکش ڈیزائن والی پلیٹ پکڑا کر ہٹ گیا۔ وہ ماں کو اپنے ہاتھ سے کیک کھلانا چاہتا تھا۔

دیبا سب کے لیے چائے لینے باورچی خانے میں گئی تو وہ بھی چپکے سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ حسب توقع وہ چولھے کے پاس کھڑی آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اعظم میر کی یاد ایسے وقت بڑی شدت سے آئی تھی۔ اس نے کچھ کہے بنا اسے قریب کیا اور وہ رونے لگی۔

''دیبا! پاپا کی بات مجھ سے بہتر تمہیں یاد ہوگی۔ انہوں نے اسی لیے تو کہا تھا کہ سب کچھ حال ہوتا ہے، یہ پل جب ہم ساتھ ہیں، پاس ہیں، یہی تو سب کچھ ہے، یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی حال میں، موجودہ پل میں کسی بھی وجہ سے اداس ہو یا آنسو بہائے۔''

دیبا آنسو صاف کرنے لگی۔ واقعی ان کی بات تو ساری رفاقتوں کے لیے تھی۔ اس نے سر اٹھا کے مُشیب میر کو دیکھا۔

''یہ ہی تو 'ہم' ہیں اور 'ہم' کا ہونا ہی خوشی ہے، زندگی ہے۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

''اُفف یہ چوری چھپے والے رومانس کا چارم!'' پیچھے سے شانو کی آواز آئی۔

دیبا شرما گئی اور وہ ہنس دیا۔

☆☆

جویریہ مریم

اعتراف

شام ڈھل رہی تھی۔
شاہ خاور کی سنہری کرنیں، اس کشادہ مکان کے در و دیوار پہ پڑتی بہت بھلی لگتی تھیں۔ یوں جیسے سونے کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو۔ کونجوں کی ڈار آسمان سے کشادہ صحن کے بیچ و بیچ لگے نیم کے گھنے درخت میں اتر آئی تھی۔

صحن میں بچھی چارپائی پہ اس مکان کے دونوں مکین بیٹھے تھے اور ان کے درمیان خاموشی بولتی تھی۔

ایک کے چہرے اور دل میں تفکر کے سائے اور کوئی خوف رقم تھا۔ کوئی اندیشہ، کسی زندگی سے عزیز کے دور ہو جانے، چھن جانے کا خوف۔

ناقدری کا ڈر اور دوسرے کے چہرے پر افسردگی و مایوسی نظر آتی تھی۔ ارمانوں کی ٹوٹی مالا کے موتی بکھرے دکھتے تھے۔

آنکھوں کی جوت بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ وہ دیو مالائی کہانیوں جیسا حسن رکھنے والا شخص اداسی میں اور بھی ساحر لگتا تھا۔

گیٹ پر کھٹکا ہوا تھا۔ کونجوں کا دوست اٹھا اور دروازہ کھول کر اپنے ننھے منے دوستوں کو دانا پانی ڈالنے لگا تھا۔

ایک بھاری بھرکم خاتون، خورشید بیگم کے پاس چارپائی پر آ بیٹھی تھیں۔

پھر ان دونوں کی دبی دبی سرگوشیوں کو کونجیں اور ان کا دوست کان لگا کر سننے لگا۔

"خورشید، بھولے آ دیکھو تو کیسی بے رونقی ہے۔ ایک دم بہار آ جائے گی تیرے گھر میں۔ تیرا دل نہیں چاہتا پوتے پوتیوں کی قلقاریاں، چہکاریں سننے کو۔"

خاتون کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

خورشید پھیکا سا مسکرا دیں۔

"دل تو چاہتا ہے زبیدہ! مگر کچھ خوف لاحق ہیں۔ دل مطمئن نہیں ہے۔ لڑکی پہ..."

"ارے! کہیں سرمد نے کوئی لڑکی تو پسند نہیں کر لی۔"

"ایسا ہی ہے زبیدہ! مگر یہ بات نئی نہیں ہے۔ سات سال پرانی ہے۔"

"سات سال پرانی۔ کیا لڑکی والوں نے جان بوجھ کر سرمد کے نام پہ بٹھا رکھا ہے۔" زبیدہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"اللہ جانے۔" خورشید کے لہجے میں بےزاری سمٹ آئی تھی۔

"تو، تو کر لے خورشید۔ اسے ہی لے آ۔ بیٹے کے دل کی دنیا آباد کر دے۔ ظالم نہ بن۔"

دبی سرگوشی چمکتے جگنو مٹھیوں کو دان کرنے لگی تھی۔ آس جو پوری ہوتی نظر ہی نہ آتی تھی۔ دل میں ہمکنے لگی تھی۔

کونجیں اور وہ...... دیو مالائی حسن رکھنے والا اداس ساحر۔ دم سادھے ہوئے تھے۔ کئی برس بیت گئے تھے انہیں۔ احترام کی بلند سیڑھیوں پہ کھڑے کھڑے۔ محبت کو پکارتے۔ مناجات کرتے۔

خورشید بیگم نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"تو۔ تو جانتی ہے زبیدہ! کہ شوہر کی وفات کے

بعد میں نے پہاڑ سی زندگی کیسے بغیر کسی کا ہاتھ تھامے سرمد پہ ہی وار دی تھی۔

تین سال کا تھا سرمد۔ اب جوان ہوا ہے تو لگتا ہے مجھے میری محنتوں کا پھل مل گیا ہے۔ کیسے میں اپنے جگر گوشے کو کسی ایسی لڑکی کو سونپ دوں جو آتے ہی دبا لے گی۔ اور مجھ سے دور کردے گی۔ تو خود بتا زبیدہ کیا میں مر نہ جاؤں گی۔ سرمد سے دور ہو کر۔ اس کی بے رخی و ناقدری دیکھ کر۔"



وہ روپڑی تھیں۔
جگنو جو امید کا ہاتھ تھماتے تھے۔ دور دیسوں کو نکل گئے۔
ہاں آج پھر دل کا آسمان تاریک پڑا تھا۔ اور زمین میں گڑے امید و آس کے بیج سڑنے لگے تھے۔
کونجوں نے کھانے پینے سے منہ موڑ لیے تھے۔ دل میں سناٹے بولتے تھے۔
"دیکھ خورشید! برتے بغیر کسی کی بیٹی کے متعلق ایسی باتیں نہ کر۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔" زبیدہ نے نرمی سے سمجھایا تھا۔
خورشید نے گہرا سانس بھرا تھا۔
"میں کوئی دین سمجھنے والی، عالمہ بہو لانا چاہتی ہوں زبیدہ! جو بزرگوں کا ادب احترام جانتی ہو بزرگوں کا رتبہ پہچانتی ہو، خدمت گزاری کا جانتی ہو۔ ایک دنیادار، بے پردہ، مردوں کے ساتھ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکی یہ سب خاک جانتی ہوگی۔"
شام کے منظر میں، سب ساکت تھے اس گھر میں، سوائے خورشید کے۔
"میری ایک بات یاد رکھنا خورشید!" سناٹے کو زبیدہ کی ہلکی کھنکتی آواز نے توڑا تھا۔ "کہ سارے دنیادار برے نہیں ہوتے۔ اور سارے دین دار اچھے نہیں ہوتے۔
ہر انسان کی سوچ اور فطرت و مزاج ہوتا ہے کچھ گھر کی تربیت ہوتی ہے۔ ہر جگہ، ہر شعبے میں، ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی عالم، دین دار کسی غلط کام کا مرتکب ہوتا ہے تو اس میں دین کا مدارس کا، کتابوں کا قصور نہیں ہے۔ انہوں نے اسے غلط کرنے کو نہیں کہا۔ غلط نہیں سکھایا۔ یہ اس کی اپنی سوچ اور ذہنیت ہے۔ شیطان کا بہکاوا ہے۔ اگر کوئی دنیادار غلط کام کرتا ہے تو سارے دنیاداروں کو برا کہا جاتا ہے اور دین دار غلط کام کرتا ہے تو، تو سارے دین داروں کو عالموں کو حافظوں کو، ایک مچھلی سارے دریا کو گندا کر دیتی ہے۔ لیکن غلط صرف وہ ایک انسان ہی ہوتا ہے سارے نہیں۔"
وہ بولتی چلی گئی تھیں۔ ماں بیٹا دم سادھے سنتے رہے تھے۔ کونجوں کے رفیق کو پہلی بار علم ہوا تھا کہ زبیدہ خالہ اتنا اچھا اور درست سوچتی، بولتی ہیں۔
پھر زبیدہ خالہ اپنے گھر چلی گئیں۔ خورشید بیگم اندر کمرے میں، سورج مغرب میں جا گھسا تھا۔ فضائیں تاریک ہونے لگیں، زمین پہ رات کا راج تھا۔
خورشید بیگم کا گلا خراب تھا۔ نزلے زکام کی بھی ہلکی شکایت تھی۔ سو وہ کمرے میں ہی سو گئیں۔
اندھیرے اور سناٹوں میں ڈوبے صحن میں کونجوں کا دوست اکیلا تھا۔
گھنے نیم تلے پڑی کرسی پر، بیٹھا وہ نیم وا آنکھوں سے اماوس کی رات میں اپنی قسمت کے اجالے تلاشتا تھا، کشادہ صحن میں رات کی رانی کی خوشبو کا جادو بولتا تھا۔
"وہ ایسی نہیں ہے۔ دلوں کو توڑنے والی، وہ تو اندھیروں کو بھگا کر، اجالوں کو پکارنے والی ہے۔ امید صبح، ہاں، وہ صبح کی امید ہی تو ہے۔ صبح کی پہلی کرنوں جیسی۔"
وہ اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سن رہے تھے۔
"دعا کرنا۔ وہ مجھے مل جائے۔ ورنہ دل بھی آباد نہ ہو سکے گا۔ اور صحرا دلوں کی زندگی بڑی اذیت ناک ہوتی ہے دوستو!"
اب وہ کھڑا ہو کر افسردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کہہ رہا تھا۔ کئی لمحے خاموشی میں کٹ گئے۔ پھر وہ تھکے قدموں سے صحن میں بچھی چارپائی کی طرف پلٹ گیا۔ کونجیں پورے دل سے اپنے دوست کے لیے مناجاتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

کشادہ مکان سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ برآمدے میں بچھی اکلوتی چارپائی پہ خورشید بیگم لیٹی تھیں۔

ایسے میں دروازے پہ ہونے والی زور دار دستک نے انہیں ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی، دوپٹے کا پلو سر پہ ڈالتی دروازہ کھولنے چل دیں، سامنے ہی اختری بیگم اپنی دو عدد نئی نویلی بہوؤں کے ساتھ کھڑی تھیں، جھپٹ کر بغل گیر ہوئیں۔

دو گلیاں چھوڑ کر گھر تھا ان کا، اچھی سلام دعا تھی خورشید بیگم کی ان سے۔

"آئے ہائے۔ کیسی خاموشی چھائی ہے اتنے بڑے مکان میں۔ خورشید، توڑ دے قسم لے آ بہو۔ دیکھ میرے گھر میں کیسی رونق لگ گئی ہے، تیرا دل نہیں چاہتا ایسی رونق کے لیے؟" اختری نے دہائیاں دیتے پوچھا تو خورشید بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"دعا کرو، کوئی عالمہ فاضلہ مل جائے۔"

"ارے یہ بھی بھلی بات کہی تو نے۔" اختری چہک سی اٹھیں۔ "خیر سے میری دونوں بہوویں عالمہ ہیں۔ کہو تو ان میں سے ہی کسی کی بہن لے آتے ہیں۔" خورشید کے چہرے پہ رونق سی بکھر گئی۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، شام میں سرمد آتا ہے تو اس سے بات کرتی ہوں۔"

نئی نویلی دلہنیں، شرمیلی سی مسکان لبوں پہ سجائے خاموش بیٹھی تھیں۔

خورشید ٹھنڈے ٹھار شربت کے گلاس بنا لائی تھیں۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، خورشید کو دونوں ہی بہت اچھی لگی تھیں، بھلا آج کے زمانے کی لڑکیوں کے ایسے رنگ ڈھنگ کہاں ہوتے ہیں۔ ہیرے ڈھونڈے ہیں اختری نے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچتے اختری کو سراہا تھا۔

"میں ذرا اس پڑوسن سے دو باتیں کر آؤں پھر چلتے ہیں گھر۔" اختری نے بہو سے کہا اور چادر سنبھالتی پڑوسن کی طرف چلی گئیں۔ خورشید کی اس پڑوسن کے پاس وہ کمیٹی ڈالتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اس کے گھر گئی تھیں۔

خورشید گلاس اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ شیشے کے گلاس دھوتے ہوئے وہ سوچوں میں ہی غرق تھیں۔ سرمد پتا نہیں مانے گا یا نہیں۔ خدا جانے اس دفتر والی چڑیل نے کیسا جادو کر دیا ہے میرے بچے پر۔

☆☆☆

"ثمرہ باجی، آپ نے نوٹ کیے ہیں ساسو ماں کے انداز؟" اختری کی چھوٹی بہو کی تیز آواز خورشید کو سوچوں سے باہر کھینچ لائی تھی۔ آواز اتنی تیز نہیں تھی انداز تیز تھا۔

"نہیں تو، کیا ہوا؟"

دھیمی سی، نرم سی آواز۔

"واہ باجی! آپ بھی کتنی بھولی ہیں۔" وہ ہنسی تھی۔ ان کی بلند سرگوشیاں خورشید کے کان کھڑے کر چکی تھیں۔

"ثمرہ باجی! ساسو ماں چاہتی ہے کہ ہم اس کی خدمت گزاری میں جت جائیں اور وہ خود مہارانی بن کر چارپائی پر بیٹھ کے حکم چلائیں اور بیٹھے بیٹھے کھائیں ذرا چار دن گزر جانے دیں۔

میں بتا دوں گی کہ وہ کس کھاتے میں ہم سے خدمت کروانا چاہتی ہیں۔ جب کہ وہ اور ان کا کام، خدمت، ہماری ذمہ داری، فرائض میں شامل ہی نہیں ہیں۔ اسلام میں سسرال کی خدمت و ذمہ داریوں کا حکم ہی نہیں ہے۔

وہ فقط اپنے بیٹے کی ذمہ داری ہیں۔ ہماری ذمہ داری اور فرائض میں ہمارے شوہر شامل ہیں اور بس!

ہونہہ! یہ پاکستانی سسرالی نظام عجیب فرسودہ رسم و رواج بنا رکھے ہیں لوگوں نے۔ بہو کو حکم کا غلام ہی سمجھ لیتے ہیں۔ سارا دن گدھوں کی طرح سسرال کی خدمت میں جتی رہے۔ اور شوہر کے آنے پر، پھر بھی شکایتوں کی پٹاریاں ہی کھلتی ہیں۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس سب پر، میری ذمہ داری صرف میرا شوہر ہے میرے ذمہ صرف اس کے کام ہیں۔

سسرال کے کام بہو کی ذمہ داری نہیں ہیں۔" تو ہم کیوں فضول میں اپنے ہاتھ پیر گھسائیں۔

کچن میں کھڑی خورشید بیگم پتھر ہوئی جارہی تھیں۔ شیشے کا گلاس ان کے ہاتھ سے گرا اور پاش پاش ہوگیا۔

وہ پتھرائی نظروں سے گلاس کی کرچیاں دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا آنٹی؟"

ثمرہ دوڑی آئی تھی۔

"میں واش روم میں ہوں ثمرہ باجی!" چھوٹی کی آواز آئی تھی۔

ثمرہ کچن میں کھڑی خورشید بیگم کو دیکھ کر ایک پل میں سمجھ گئی کہ وہ ساری باتیں سن چکی ہیں۔

وہ جو خدمت گزار، ادب و احترام، بزرگوں کا احساس کرنے والی، عالمہ بہو لانا چاہتی تھیں ایک عالمہ بہو کے خیالات سن کر پتھر ہوئی کھڑی تھیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ خورشید بیگم کی سماعتیں، ساٹھ سال کی عمر میں بھی اچھی خاصی تیز تھیں۔

ثمرہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے آگے بڑھ کر، خورشید بیگم کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"آنٹی! آپ عالماؤں اور اللہ کے دین سے بدگمان مت ہونا۔

یہ اللہ کا حکم ضرور ہے۔ ایسے ہی، جیسے جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان کا حکم ہے۔ بدلہ لینا جائز ہے۔ لیکن معاف کرنا بلند تر، بہت بڑی نیکی ہے۔ یہ انسان کی سوچ کی بات ہے کہ کس حکم کا انتخاب کرتا ہے۔

ایسے ہی آنٹی، اسلام میں بہو کی ذمہ داریوں میں سسرالی رشتے شامل نہیں ہیں۔ ان کے کام، ان کی خدمت فرض نہیں کی گئی۔ لیکن دوسری طرف۔ بزرگوں کی خدمت کا اجر بے پناہ رکھا گیا ہے۔ رشتہ داروں کا خیال رکھنے والوں کو جنت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔

اور سسرال والوں سے بہو کا بہت نزدیکی اور خوب صورت رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے شوہر کے ماں، باپ اور بہن بھائی ہوتے ہیں۔ بہت اہم اور قریبی رشتہ دار، تو ان سے حسن سلوک، صلہ رحمی سے منع تو نہیں کیا گیا۔

بوڑھے ساس، سسر، جن کی خدمت بہو پہ فرض نہیں لیکن انہیں بے یارومددگار، تکلیف میں تنہا چھوڑ دینا، بیماری میں خبر تک نہ لینے کا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ بھی ہمیں سوچنا چاہیے۔

بہت بڑی نیکی اور جڑا ہے بوڑھے بزرگوں کی خدمت، رشتہ داروں سے حسن سلوک کی رشتہ داروں کے حقوق کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

آنٹی! جب پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید ہے اور حقوق ادا نہ کرنے کی اتنی سخت وعید ہے تو اللہ یہ حکم کیسے دے سکتا ہے کہ شوہر کے والدین، لاچار، بیمار گھر میں پڑے رہیں۔ ان کی مزاج پرسی، ان کی مدد نہ کرو، طبیعت نہ پوچھو اور پڑوسیوں کا خیال رکھو۔ جہاں اور جب انہیں ضرورت پڑے ان کے کام آؤ۔"

ثمرہ بول رہی تھی اور خورشید یک ٹک اسے تکے جارہی تھیں۔

"آنٹی! اللہ کے دین کو برا مت سمجھنا۔ بس ہر انسان کی اپنی سوچ اور ظرف کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی شاید اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتی، ہر پہلو پہ غور نہیں کرتی، صرف اسی پہلو پہ غور کیا ہے کہ اسلام میں سسرالی رشتوں کی خدمت فرض نہیں، اسلام میں تو اور بھی بہت سے حکم ہیں۔ دین اسلام کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ میرا اللہ اپنے ہر حکم میں ہر بات میں سچا ہے۔ منصف ہے، عادل ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" خورشید نے تھکی سی آواز میں کہا تھا۔

☆☆☆

ان کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک ثمرہ اور چھوٹی ثانیہ کی باتوں پہ غور کرتی رہیں۔ سوچوں کا موازنہ کرتی رہیں۔

"واقعی اپنے اپنے ذہن کی بات ہوتی ہے۔"

خورشید نے اعتراف کیا تھا اور ان کے دل میں خوف ابھرا تھا کہ اگر ثانیہ جیسی عالمہ بہو ہی ان کے حصے میں آ گئی تو وہ کیا کریں گی۔

"نہیں...... ہر لڑکی ثمرہ جیسے ذہن کی نہیں ہوتی۔ اللہ کے دین کو اپنے مطلب کی نظر سے دیکھنے والی زیادہ ہوتی ہیں۔"

انہوں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ (پھر ایک مچھلی سارے دریا کو گندا کر گئی تھی)

شام میں سرمد آیا تو حسب معمول اداس اور خاموش تھا۔ خورشید نے اپنے بتیس سالہ بیٹے کو غور سے دیکھا تھا۔ کتنا مرجھا گیا تھا وہ۔

"کھانا لاؤں بیٹا؟" انہوں نے جیسے پچکار کر پوچھا تھا۔

"نہیں اماں! میں کھا آیا ہوں باہر ہی۔" سنجیدہ سے لب و لہجے میں جواب آیا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو ناں سرمد! میں تمہارا برا تو نہیں چاہتی۔"

"میں ناراض کب ہوں اماں؟"

سرمد نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"چلو اسی لڑکی سے کر لو شادی۔ میں کون ہوتی ہوں روکنے والی۔"

اماں کی بات سن کر، سرمد ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اور وہ ساری باتیں یاد آئی تھی جو اماں نے امید صبح کے بارے میں کی تھیں۔

"بتاؤ کب لے کر جاؤں رشتہ؟"

وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں وہ ساکت کھڑا زمین کو گھور رہا تھا۔

"اگر آپ ناراض ہیں تو......" وہ سنبھل کر بولا تھا مگر خورشید نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے نہیں ہوں ناراض۔"

اب جیسی بھی ہوگی۔ وہ ہی قبول ہے۔ اگر میں اپنی مرضی کی ڈھونڈ لائی اور وہ بھی ایسی ہی نکلی تو پھر میں کیا کروں گی۔

اگر میری قسمت میں تیری بے رخی سہنا لکھا ہوا ہے تو وہ تو ہر حال میں ہی سہوں گی۔

چاہے کیسی ہی شریف لڑکی ڈھونڈ لاؤں۔ شادی کے بعد تو لڑکیاں، لڑکے کو صرف اپنی ملکیت ہی سمجھتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ جنہوں نے اسے پالا پوسا ہے۔ پڑھایا لکھایا ہے وہ بھی کچھ اس کے لگتے ہیں کمرے سے ہی نکلنے نہیں دیتیں۔

ماں اکیلی پڑی سڑتی رہے، کوئی پروا نہیں۔" وہ مان تو گئی تھیں۔ مگر بدگمانی کی دھول میں اٹی کھڑی تھیں۔

سرمد ششدر سا کھڑا اماں کا منہ تک رہا تھا۔

☆☆☆

خواہشوں کے گلاب، کیسے پتھروں کی برسات کے بیچ و بیچ کھلے تھے۔ مگر وہ خوش تھا۔ بے تحاشا خوش۔ امید صبح کو فوراً شادی کے لیے آمادہ کرنا اب اس کا کام تھا۔ جو بڑی ہونے کے ناتے چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر میں گھلتی، شادی نامی لفظ — بھول ہی گئی تھی۔

باپ کی وفات کے بعد گھر کی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ اٹھائی تو خواب و خواہش، سب ترک کیے چھوٹے بہن بھائیوں کے خواب پورے کرنے کی کوشش میں اپنی آنکھیں بنجر ہی کروا لی تھیں۔

اسے یقین تھا کہ ذرا سی تگ و دو کے بعد وہ مان جائے گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے مان جانے کے بعد وہ ہواؤں میں اڑتا، خوشبوؤں میں پھرتا اسے اپنے سنگ اڑا لایا تھا۔ خورشید اس کے انداز و اطوار دیکھ دیکھ کر ہول رہی تھیں۔

"یہ تو ابھی سے قابو کر لیا ہے اس ڈائن نے، اب میرے بیٹے کو مجھ سے دور کر دے گی دو گھڑی

بیٹھنے بھی نہیں دے گی میرے پاس۔"

☆☆☆

اتوار کا دن تھا خورشید بیگم صحن میں تنہا کھڑی تھیں۔ ہر طرف سنہری دوپہر کا راج تھا۔ سونے میں نہائی کرنیں ہر طرف بکھری پھر کوئی بادل کا آوارہ ٹکڑا سونے کے تھال کو اوٹ میں لے لیتا۔ شاہ خاور چھپ جاتا۔ بادل کا ٹکڑا اٹکھیلیاں آ کے گزر جاتا۔ زمین پھر سنہری ہو جاتی۔

اتنے خوب صورت موسم میں بھی وہ بے کلی واضطراب کی کیفیت میں گھری کھڑی تھیں۔ وجہ تھے سرمد اور امید صبح! جو کب سے کمرے میں گھسے ہوئے تھے۔ خورشید، امید کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینے کی غرض سے ان کے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔ جس نے سرمد پہ جادو کروا کر اسے مکمل طور پر پھانس کر ماں سے دور کر دیا تھا۔

مگر کمرے سے آتی آوازوں نے ان کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"امید! تم اتنی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو؟" سرمد کی فکر میں گھلی آواز خورشید کو بہت بری لگی تھی۔

"سرمد! تم اماں کو زیادہ وقت نہیں دیتے۔ شادی کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ بندہ سب چھوڑ چھاڑ کمرے کا ہو کر رہ جائے۔

تم اکلوتی اولاد ہو ان کی۔ ان کا دل دکھتا ہوگا، ماں کا دل خوش ہو تو زندگی میں سکون ہوتا ہے۔ ورنہ......"

"کیا اول فول بولے جا رہی ہو امید! میں ان کی پروا کیوں نہیں کروں گا بھلا! ساری زندگی میرا وقت میری اماں کے لیے ہی وقف رہا ہے۔ اب میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اس وقت پہ تمہارا حق ہے کہ میں زیادہ وقت تمہیں دوں۔"

وہ امید کی بات کاٹ کر جھنجلائی آواز میں بولا تھا۔

خورشید کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

سرمد! وہ ماں ہیں اور میں بیوی! مرد پہ بیوی سے زیادہ ماں کا حق ہوتا ہے۔ یہ کبھی مت بھولنا۔

ہم اگر یونہی کمرہ بند کر کے بیٹھنے لگے تو وہ اتنے کشادہ گھر میں ہمارے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کی سزا کاٹیں گی۔ تنہائی اور انتظار بہت بری چیز ہوتے ہیں سرمد اور خاص طور پہ بڑھاپے میں بوڑھی آنکھوں میں بستی تنہائی مجھے بہت اذیت دیتی ہے۔"

امید صبح کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

اور ان ہی لمحوں میں خورشید کو لگا تھا کہ جیسے ان کے گالوں پہ بھی نمی پھیل رہی ہے، انہوں نے ہاتھ پھیرا تو وہ واقعی آنسو تھے۔ شرمندگی کے آنسو۔ ندامت کے آنسو۔

"اللہ معاف کرے جو میں اماں کو رلاؤں، انہیں تنہائی کی سزا دوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم بھی امید! بالکل پاگلوں جیسی۔ چلو اماں کے پاس چلتے ہیں۔"

سرمد کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو خورشید الٹے پاؤں، ہانپتی کانپتی اپنے کمرے میں بھاگی تھیں اور چارپائی پہ بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

واقعی! سارے دنیادار بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ تو اپنے اپنے ذہن، ظرف اور سوچ کی بات ہوتی ہے۔ تب ہی سرمد اور امید صبح ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سوری اماں! ہم نے خیال نہیں کیا آپ کب سے اکیلی بیٹھی ہیں۔" سرمد کان پکڑے ان کی گود میں سر رکھ چکا تھا۔ خورشید نے اس کا چہرہ اوپر کر کے چٹاچٹ چوم ڈالا، پھر امید صبح کا بھی۔

"ارے نہیں۔ میں تو سونے لگی تھی۔ جاؤ تم بھی آرام کرو۔"

پیار سے امید کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر دوپٹا تان کر لیٹ گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

☆☆

ماہنامہ کرن

فروری 2024ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "عائزہ خان سے شاہین رشید کی ملاقات"،
- اس ماہ "جویریہ فیصل مقابل ہے آئینہ"،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- "کسوف" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- "اک لمحہ جاوداں" عقیلہ ہاشمی کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "شبِ ہجر" ام اقصیٰ کا ناولٹ،
- عطیہ خالد، قانتہ رابعہ، نازنین فردوس اور عندلیب زہرا کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- "کرن کتاب"

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار ریسپیز کے ساتھ

فروری 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

صوفیہ بٹ

احد

مکمل ناول

باب

وفا ہے کہ جفا ہے

ایڈووکیٹ خولہ بنت زید نے سلاخوں کے پار اس کا چہرہ دیکھا تو اپنے قدم وہیں روک لیے۔

وہ چونا پتکالی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور چہرے پہ رنگ ہی رنگ برس رہے تھے۔ زندگی کے رنگ، فرحت و انبساط کے رنگ، کیف و سرور کے رنگ، کچھ پالینے کے رنگ۔ نہیں۔ بلکہ سب کچھ پالینے کے رنگ۔ لگتا تھا دنیا فتح کر ڈالی۔

خولہ نے اسے بلایا نہیں۔ یہ پل اس کی زندگی میں کم ہی آتے تھے۔ یہ چہرہ دھنک رنگ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ اگر اس وقت وہ بیتے کل کے روح افزاء لمحوں میں جی رہا تھا تو وہ ان لمحوں کے سرور سے اسے نکالنا نہ چاہتی تھی۔ حقیقت کی دنیا کے دہکتے الاؤ میں جھونکنا نہ چاہتی تھی۔

لاک اپ کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا گیا تھا مگر وہ اندر داخل نہ ہوئی۔

اچانک اس کے چہرے پہ ایک اور رنگ ابھرا۔ دکھ اور کرب کا رنگ۔ زرد رنگ۔

آنکھیں اس کی ابھی بھی بند تھیں اور وہ اضطراب سے اپنے سر کو ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ وہ جلدی سے ایک قدم آگے بڑھی۔ اب اس نے اپنے سر کو دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اس زرد چہرے پہ موت کا سا سیاہ رنگ پھیلتا، اس نے جلدی سے سلاخوں کے پاس آ کر اسے پکار لیا۔

"عبدالہادی۔"

اس نے جیسے سنا نہ تھا۔ وہ اتنی ہی اذیت میں رہا۔

"عبدالہادی!"

خولہ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ اسے پکارا تو کہیں جا کر اس کی آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔ وہ ایک پل کے لیے ساکت ہوا اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گردن ابھی بھی نہ موڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سماعت نے اسے دھوکا دیا ہے۔

"عبدالہادی۔" خولہ نے پھر نرمی سے پکارا۔

اب کی بار اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا۔ بے تحاشہ سرخ ہوتی آنکھوں نے ایک پل کے لیے خولہ کو لرزا دیا۔ وہ چند لمحے غائب دماغی کی حالت میں اسے دیکھتا رہا اور جب یہ ادراک ہوا کہ اس کا وہم نہیں بلکہ اس کے سامنے حقیقت کی صورت ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کھڑی ہے تو وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ سر کے اطراف سے ہٹاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سلاخوں کے قریب آ گیا۔ وہ دانستہ ذرا سا مسکرائی۔

"ایڈووکیٹ خولہ بنت زید آپ۔ آپ کب آئیں؟" اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"ابھی ابھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کھولی۔ "کچھ پیپرز پہ سائن لینے تھے۔" اس نے فائل اور پین سلاخوں کے درمیان سے اندر بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں چیزیں تھام کر سائن کرنے لگا۔

"پہلے غور سے ان پیپرز کو پڑھ لیں۔ کسی پر بھی اتنا اعتبار اچھا نہیں ہوتا۔" خولہ نے تنبیہ کی مگر اس

نے سنی ان سی کر کے پین چلا دیا۔
"ایک اچھی خبر ہے۔" خولہ کا لہجہ کچھ پر جوش ہوا، وہ بولا کچھ نہیں بلکہ سر سے چونا جھاڑتے ہوئے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ چونا حوالات کی دیواروں اور چھت کا تحفہ تھا جو بن بادل برستا تھا۔
"مجھے اسد اللہ نامی ایسا شاہد ملا ہے جس کی گواہی کم از کم اتنی مفید ہوگی کہ آپ کی ضمانت ہو جائے گی اور آپ حوالات سے باہر۔"
"ایک منٹ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید! ایک منٹ!" اس نے انگلی اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔
"اچھی خبر میرے لیے یہ نہیں کہ میں یہاں سے باہر

چودہویں قسط



نکلوں۔ اچھی خبر میرے لیے یہ ہے کہ وہ وحشی اپنے انجام کو پہنچے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" خولہ کے منہ سے نکلا۔

"ایک ہی بات نہیں ہے۔ ایک ہی بات نہیں ہے ایڈووکیٹ خولہ بنت زید۔" اس نے سلاخوں پہ مکا مارا۔ "میں تمام عمر یہیں ہنستے ہنستے گزار لوں گا اگر وہ درندہ اپنی سزا پا جاتا ہے۔" اس کی رگیں تن گئیں، لہجہ انگارے کی طرح دہکنے لگا۔

"ٹھیک ہے عبدالہادی! میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں لیکن۔" اس نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پھر اس کی بات کاٹ گیا۔

"وہ گواہ اصل مجرم کی گردن میں پھندا ڈالنے کے لیے مفید ثابت ہوگا کہ نہیں؟"

"نہیں سوری۔ اسداللہ کی گواہی اصل مجرم کو نہ گھیر سکے گی بلکہ۔"

"پھر مجھے اس کی گواہی کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"عبدالہادی! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ایک دفعہ آپ حوالات سے باہر آ جائیں تو دوسرے محاذ پہ لڑنا میرے لیے آسان رہے گا۔ ویسے بھی جب آپ باہر آ جائیں گے ناں عبدالہادی! تو ہماری تو یہ آدھی فتح ہوگی مگر دشمن کو اپنی پوری ہار محسوس ہوگی۔ اور آپ کا دشمن ایسا تو ہے نہیں کہ ہار قبول کر کے منہ چھپا کر کہیں بیٹھ جائے۔ بلکہ وہ اشتعال میں آ کر جوش میں ضرور ایسا قدم اٹھائے گا جو اس کے اپنے لیے ہی جال ثابت ہوگا۔" اب کے اس نے ایسا نکتہ پیش کیا جو اس بندے کو مطمئن کر سکے جسے اپنی پرواہ نہ تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ باہر آپ کی جان کو خطرہ۔"

"میری پرواہ مت کریں آپ۔ موت میرا ڈر نہیں۔ آپ مجھے اسداللہ کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

خولہ ہلکا سا مسکرا دی۔ اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی بات منوالی تھی۔ وہ اسے اسداللہ کے بارے میں بتانے لگی کہ اس نے اس رات کب، کہاں اور کس کے ساتھ عبدالہادی کو دیکھا تھا۔ اور اس گواہی کو وہ کیسے اگلی سماعت میں اپنے کام میں لائے گی۔ وہ سنتا رہا۔ آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

بننا تو وہ چاہتا تھا گیت کار مگر بن گیا گورکن۔

کیا کیجیے کہ گیت لکھ لکھ کر کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ مردے دفنانے لگا۔ ایسا نہ کرتا تو اسے لگتا تھا کہ جلد ہی ماں کو دفنانا پڑ جاتا۔ باپ کو گزرے اتنا وقت نہ ہوا تھا کہ ماں کی جدائی کو سہنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ وقت نے اس کے ہاتھ میں کدال تھما دی۔ وہ مٹی نکالتا، مٹی ڈالتا۔ مشقت تو وہ کر لیتا تھا مگر میت اور اس کے ساتھ آئے لوگ۔ شروع شروع میں یہ منظر دیکھ کر اس کا جسم کانپنے لگتا، ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، کئی وقت کی بھوک مر جاتی۔ پھر وہ عادی ہونے لگا۔ لیکن ایک تدفین کے بعد اپنے کمرے میں آ کر وہ اتنا رویا تھا، اتنا رویا تھا کہ بے جان سا ہو گیا تھا۔

وہ ایک جواں سال کی میت تھی۔

خاموشی سے آنسو بہاتا، پرے لیٹا اس کا باپ جس نے اس لیے پالا پوسا ہوگا کہ اس کا بازو بنے گا۔ بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

پھوٹ پھوٹ کر روتا بھائی جس نے لڑتے ہوئے ہزار بار کہا ہوگا "مر جا۔" آج اپنی زبان کاٹ دینے کو سوچتا ہوگا۔

اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوتے یار دوست جو ہمراز تھے۔ جوانی میں سب سے قریب یہ یار ہی تو ہوتے ہیں جن سے بندہ ہر بات کہتا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر نوجوان کا چہرہ دیکھا تھا اور اب تک بھول نہ پاتا تھا۔ سچ ہے جوان موت آسانی سے بھلائی نہیں جاتی۔

اس کا باپ جب بھی بیٹے کی قبر پر آتا، پہلے سے زیادہ بوڑھا لگتا۔ وہ قبر کو بوسے دیتا، آنکھوں سے بہتے پانی سے آبیار کرتا۔

یہ منظر دیکھ کر وہ سوچتا۔

اچھا ہوا، اس کا باپ اس سے پہلے مر گیا۔

ہاں جوان اولاد کی موت یوں ہی بے حال کر دیتی ہے۔ اس نے اپنی پھوپھی کو دیکھا ہوا تھا جس کا اکیس سال کا جوان بیٹا مر گیا تھا۔ پھوپھی کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس مرے ہوئے بیٹے کے غم میں وہ اپنے حیات بچوں کو بھلا بیٹھی تھی۔ ہاں جوان اولاد کا جانا بڑا غم ہے۔ اس کا بیٹھنا، رینگنا، چلنا، دوڑنا ہر پل دیکھا ہوتا ہے۔ اس کا ''آں آں'' سے لے کر ''امی آپ تتنی پیالی او'' سنا ہوتا ہے۔ پھر یہی بچہ بڑا ہو کر اتنا بولنے لگتا ہے کہ کبھی کبھی ماں باپ کو بھی سنا ڈالتا ہے۔ اس بچے کا کلکاریاں مارنا، ہنسنا، رونا، روٹھنا منانا، پہلی سانس سے لے کر جوانی تک کا ہر لمحہ نگاہ سے گزرا ہوتا ہے۔ مگر ایک نوزائیدہ یا شیر خوار بچے کی موت بھلا کب باپ کا یہ حال کرتی ہے جو وہ اس شخص کی دیکھا کرتا تھا جو اس وقت اس چھوٹی سی قبر پہ سفید پھول بکھیر رہا تھا۔

نوزائیدہ بچہ تو بس اپنا لمس دے جاتا ہے۔ اپنی صورت دکھا جاتا ہے۔ اتنے سے بچے کا باپ شاید جوان ہوتا ہے، غم سہنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پھر یہ تسلی بھی ہوتی ہے کہ نعم البدل مل جائے گا۔ شاید اس کی پہلی پہلی اولاد تھا یہ بچہ۔ شاید اس کو ابھی تک نعم البدل نہ ملا تھا۔ بننا تو وہ چاہتا تھا گیت کار مگر بن گیا گورکن۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی قسمت میں کیا بننا لکھا ہے۔

☆☆☆

رات کے اس پہر جب ہر طرف نیند نے جادو سا کر ڈالا تھا اور سب اس کے زیر اثر تھے۔ گھروں کی بتیاں مدھم تھیں یا گل ہو چکی تھیں۔ اس چھوٹے سے خوبصورت گھر کے نیچے والے ایک کمرے میں روشنی تھی اور اس کمرے میں موجود لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ برسوں سے سوئی نہیں۔ وہ لڑکی سلیپنگ بیوٹی بننا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک دن چلتی ہوئی وہ محل کے دوسری طرف نکل جائے جہاں بوڑھی عورت کے چرخے کی نوک اسے چبھے اور وہ سو سال نہیں۔ ہمیشہ کے لیے سو جائے مگر اسے کوئی بدصورت بوڑھی پری کوئی بددعا دے کر بھی نہ گئی تھی۔ اگر اسے بھی کسی بدصورت بوڑھی کرخت ظالم قسم کی پری نے بددعا نہیں دی تھی تو پھر۔ پھر زندگی بددعا سی کیوں لگنے لگی تھی۔

''فائقہ۔ یہاں بیٹھی ہو۔ میں تمہیں کچن میں ڈھونڈ رہا تھا۔'' مرتضیٰ اسے تلاش کرتا ہوا اس کمرے میں آ پہنچا تھا اور اب نرمی سے کہتے ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر اپنے شوہر کی طرف نہیں دیکھا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جسے کبھی وہ گھنٹوں تکتے ہوئے نہ تھکا کرتی تھی۔

''کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی؟'' شوہر کے استفسار پہ جاگتی ہوئی شہزادی نے اس کی طرف جن نظروں سے دیکھا، وہ نگاہیں چرانے پہ مجبور ہوا۔

''چلو آؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہو۔ برسوں سے جاگی لڑکی خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ نیچے والے کمرے کی بتیاں بھی گل ہو گئیں۔

☆☆☆

چرخے کی نوک اس عورت کو چبھ گئی تھی جو کئی ماہ سے سو رہی تھی اور جاگتی ہی نہ تھی۔ کون کون نہ آتا تھا اس کے پاس۔ کون کون نہ اس کی منتیں کرتا تھا کہ وہ اٹھ جائے۔ مگر اس تک تو جیسے کوئی آواز جاتی ہی نہ تھی۔ اس کو تو جیسے بیدار ہونے کی خواہش ہی نہ تھی۔

اور ایک دن سوئی ہوئی عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ پتا نہیں اتنے لوگوں میں سے کس کی دعا رنگ لے آئی تھی۔ وہ اٹھ گئی تھی۔ معجزہ ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ معجزہ شاید کسی مہلت کے لیے ہوا۔ مہلت پوری تو زندگی پوری۔

☆☆☆

پیسے سے بندے کی زبان سے نکلنے والے الفاظ خرید لیے جاتے ہیں یا طاقت کے بل بوتے پر زبان ہی بند کروا دی جاتی ہے۔ اب دشمن نے کون سا حربہ استعمال کیا تھا، خولہ نہیں جان پائی۔ بس اتنا ہوا تھا کہ جو شاہد گواہ بن کر اتنے عرصے کی بھاگ دوڑ کے بعد منظر عام پر آیا تھا وہ کیس کی سماعت کے روز پس منظر میں غائب ہو گیا۔ سیلف نے بتایا کہ جب

زہ اسے لینے پہنچا، مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ اور پڑوس میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔

پچھلے گیارہ مہینوں کی طرح یہ سماعت بھی بے نتیجہ رہی۔ مجرم آزاد رہا اور بے گناہ پھر حوالات کا مکین بننے جا رہا تھا۔ وہ عبدالہادی سے نگاہ چرا رہی تھی۔ اس کو لگی ہتھکڑیوں سے نگاہ چرا رہی تھی۔

"آئم ساری عبدالہادی!" وہ اس کی طرف آئی۔ کمرہ عدالت آہستہ آہستہ نفوس سے خالی ہو رہا تھا۔ "اسداللہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ گواہی دینے ضرور آئے گا۔ کل رات بھی میری اس سے بات ہوئی تھی لیکن۔" آگے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے اس کے پاس۔

"ایڈووکیٹ خولہ بنت زید! میرا ایک کام کریں گی آپ؟" عبدالہادی نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے سوال کیا۔

"یقیناً۔"

"یہ کام آپ کے فرائض میں شامل نہیں پھر بھی۔" وہ کچھ متامل ہوا۔

"آپ کہیں عبدالہادی! مجھے آپ کے کسی بھی کام آ کر خوشی ہوگی۔" اس کو جھجکتے دیکھ کر وہ ملائمت سے بولی۔ اور جب اس نے کام بتایا تو خولہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ دونوں گارڈ جو ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑے تھے، ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ آخر حیرت سے باہر نکلتے ہوئے خولہ نے مسکرا کر "او کے" کہتے ہوئے سر کو خم کیا۔ وہ ان ہی گارڈز کی معیت میں کمرہ عدالت سے باہر نکل گیا اور خولہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

یہ عبدالہادی۔ اس نے اکثر اسے حیران ہی کیا تھا۔

اس دن بھی جب اس کیس کی پہلی سماعت تھی۔ جب وہ کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جب فاضل جج اسے یہ پڑھ کر بتا رہے تھے کہ اس پہ کیا فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ اس وقت۔ اس وقت بھی خولہ بنت زید اپنی جگہ پہ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ کس بات پر چلا رہا تھا۔

"نہیں تھی وہ ایسی۔ زبان کھینچ لوں گا میں اس کی جس نے اس کے لیے یہ لفظ بولا۔ دس قتل بھی کرنے پڑے تو کر دوں گا۔"

وہ خولہ بنت زید، وکیل استغاثہ جو اپنے کاغذات سیٹ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ان سوالوں کو ترتیب دے رہی تھی جن سے اس نے اس سفاک شخص کے بخیے اُدھیڑنے تھے اور ہوا کیا؟

اس نے ہی خولہ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ ڈالی تھی۔ اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ملزم جس پر قتل کا الزام لگایا جا رہا تھا، اس نے چلا چلا کر یہ نہیں کہا کہ وہ قاتل نہیں وہ خونی نہیں بلکہ وہ مشتعل اس بات پہ ہوا کہ اس لڑکی کو کاری کہا جا رہا تھا۔ اسے خود پہ لگے الزام کی پروا نہ تھی، اسے تکلیف ہوئی تھی تو اس لڑکی کے دامن پہ کیچڑ اچھالنے کی جس لڑکی کے قتل کے الزام میں وہ اس وقت کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جس لڑکی کے لیے "کاری" سننا برداشت نہیں کیا، اس کو کاری قرار دے کر قتل کر سکتا تھا وہ؟

کیا وہ قاتل ہو سکتا تھا؟

ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔

فاضل جج نے خاموشی سے اس شخص کو تھوڑی دیر دیکھا اور پھر سے چارج شیٹ پڑھنے لگے۔ اور جب ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو بطور وکیل استغاثہ سوالات کرنے کی دعوت دی گئی تب تک وہ سوالیہ نشان اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ اطمینان سے اٹھی اور کٹہرے میں کھڑے شخص کی طرف مڑنے کے بجائے فاضل جج کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کیس کی سماعت کو کم از کم ایک ہفتہ تک کے لیے ملتوی کر دیں۔

سماعت تین ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ اور اکیس دن بعد وہ اسی کمرہ عدالت میں کھڑی تھی مگر وکیل استغاثہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبدالہادی کی وکیل صفائی کی حیثیت سے۔ حالانکہ یہ قدم انصاف کے اصولوں کے خلاف تھا اور ایڈووکیٹ خولہ بنت

زید کے اپنے اصولوں کے منافی بھی۔ ایسا وکیل قابل اعتبار نہیں رہتا۔ لوگ اسے اپنا کیس دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ جانے کب دوسری جانب جا کھڑا ہو۔ پھر بھی وہ اپنی ساکھ کو داؤ پر لگا کر عبدالہادی کے لیے لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"یہ تو میں سوچ نہیں سکتا کہ اس نے تمہیں زیادہ پیسہ آفر کیا۔ اس لیے تم اس کی طرف چلی گئیں۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے بہکنے کی۔ کہیں اس کے خوب صورت چہرے پہ تو نہیں مر مٹیں تم؟"

وہ جو "آپ۔ جناب" ہوتا تھا، وہ گیا بھاڑ میں۔ فوراً اصلیت پہ آ گیا تھا وہ۔ جب پہلی بار اس کے آفس آیا تھا، تب کتنا مہذب اور دکھی لگ رہا تھا جو اپنی بہن کے لیے انصاف چاہتا تھا، اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانا چاہتا تھا۔

"وجہ کچھ بھی ہو۔ یہ اطمینان آپ رکھیں کہ آپ اپنی بہن کے لیے انصاف چاہتے ہیں، اس کے قاتل کو پھانسی کے پھندے تک لے جانا چاہتے ہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔" اس نے مسکرا کر اپنے سامنے کھڑے شخص کو جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

"پچھتائیں گی آپ۔ اس کے معصوم چہرے پہ جا کر۔ بڑا اداکار ہے وہ۔" وہ پیچھے سے چلایا تھا۔

اور ایڈووکیٹ خولہ بنت زید رکی نہیں، قدم بڑھاتی رہی۔ آج بھی اس کے قدم نہیں رکے تھے۔ لیکن کیس رک سا گیا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا، وہ پچھلے کئی ماہ سے عبدالہادی کے ساتھ اس کی طاقت بن کر کھڑی تھی جو اسے اکثر حیران کیا کرتا تھا۔ اور آج۔ آج کی اس کی فرمائش۔

وہ ابھی تک اچنبھے میں تھی۔

☆☆☆

پروفیسر زید ابصار نے قلم ہاتھ سے رکھا اور بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ صبح سے وقفے وقفے سے انجانے نمبروں سے آنے والی کالز نے جس کو عجیب سی جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ دشمن سامنے ہو تو جنگ کا مزا بھی ہے۔ یہ چوہے بلی کا کھیل تو اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"تم جس فیلڈ میں ہو، یہ عام سی چیزیں ہیں۔ انہیں حواس پہ سوار مت کرو خولہ۔"

"میں حواس پہ سوار نہیں کر رہی بابا! مگر مجھے غصہ آ رہا ہے۔ آپ ان سب سے کیسے نپٹتے ہیں بابا؟"

"اپنا معاملہ اللہ کے سپرد رکھتا ہوں اور جہاں تک ممکن ہو، احتیاط کرتا ہوں۔"

خولہ ایک بار پھر اس شخص سے متاثر ہوئی جس کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ بغیر کسی شہادت کے سچ جانا جاتا تھا۔ اس نے اس شخص کو ہمیشہ سکون میں دیکھا تھا۔ حالانکہ کیسے کیسے حالات پیش نہ آئے تھے۔

"بابا!" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اسی اثنا میں ثروت لائبریری میں داخل ہوئی تھیں۔

"کس کا فون آ رہا ہے بار بار خولہ؟"

ایک کالم نگار کی بیوی اور ایک وکیل کی ماں ہو کر انہیں بچویشنز سمجھ میں آتی تھیں پھر بھی پہلے انتظار کرتی تھیں کہ کوئی انہیں خود ہی بتا دے۔ یہ اور بات کہ باپ بیٹی کے کچھ سیکرٹس ایسے ہوتے تھے جن سے وہ اکثر بے خبر رہتی تھیں۔

"اقصیٰ کا۔" خولہ نے بیسٹ فرینڈ کا نام لے کر ٹالنا چاہا مگر سامنے وکیل کی ماں تھی۔

"بار بار کیوں کر رہی ہے کال؟" مشکوک انداز میں سوال کرتے کرتے کچھ یاد آیا۔ "اب آئے فون تو میری بات کروانا۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"مجھے پتا ہے کیا ضروری بات کرنی ہے آپ نے۔" خولہ نے ان کا گال چومتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو کیا ساری عمر شادی نہیں کرنی۔ باپ کو تمہارے تو پروا نہیں۔ اقصیٰ ہی شاید تھوڑی عقل دے دے۔"

"جو چیز اس کے پاس نہیں ہے، مجھے کیسے دے گی۔" وہ ہنسی۔

"خولہ! تیس سے اوپر کی ہو گئی ہو۔" ماما کی

فکرمندیاں آج کل اسی حوالے سے تھیں۔

"اور میری عمر میں آپ ایک دس سالہ بچی کی ماں تھیں۔" خولہ نے جلدی سے ان کا متوقع اگلا جملہ بولا تو ماما اسے گھور کر رہ گئیں۔ جبکہ بابا ہنس دیے تھے۔

"عبید اچھا لڑکا ہے۔ اچھا بزنس ہے۔"

"اس اچھے عبید کے بارے میں، میں واپس آ کر بات کروں؟"

"کہاں جارہی ہو۔"

"واپس آ کر بتاؤں؟"

"تب بھی کیوں بتانا ہے۔" ماما نے خفگی بھرے انداز میں کہا تو اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر انہیں پیار کیا۔ ماما مسکرانے پہ مجبور ہوئیں۔

ارادہ اس کا فلاور شاپ پہ جانے کا تھا مگر ایوب چاچا کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کرتے ہوئے جب وہ گاڑی کی طرف بڑھی تو اسے کچھ خیال آیا۔

"چاچا! گیٹ بند ہی رہنے دیں۔" کہتے ہوئے وہ پھر اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں کرسٹل کا ایک جار تھا۔ وہ لان میں دیوار کے ساتھ لگے موتیا کے پودوں کی طرف آ گئی۔ اور شفاف سپید کلیوں کی سوندھی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے انہیں جار میں قید کرنے لگی۔ دو تین پودوں سے ان کی چاندنی چرانے کے بعد جار بھر چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ناک کے پاس لائی۔ تازہ شاداب کلیوں کی خوشبو نے اس کے اندر تک تازگی دوڑا دی۔ اس کے لبوں پہ مسکان بکھر گئی۔ اس نے گنگناتے ہوئے جار کو بند کیا اور پورچ کی طرف آ گئی۔

یہ ایک ٹھنڈی سہ پہر تھی۔ اسے کسی کی انوکھی فرمائش پوری کرنی تھی۔

☆☆☆

ضامن مصطفیٰ نے "آمین" کہہ کر چہرے پہ ہاتھ پھیرنے کے بعد سامنے جو نگاہ کی تو جیسے پلٹنا ہی بھول گئی۔ سامنے کا منظر ہی ایسا تھا۔ نگاہوں اور قدموں کو گرفت میں لے لینے والا۔

وہ لڑکی اس چھوٹی سی قبر پہ موتیا کی کلیاں پھیلا رہی تھی جو پہلے ہی بے دم کلیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کام کے ساتھ ساتھ وہ جیسے اس قبر میں موجود خاکی سے ہمکلام بھی تھی۔ جاتی ہوئی شام کی سرخیاں اور اس لڑکی کے عارض کی گلابیاں مل کر ماحول کو ایک نئے ہی رنگ سے آشنا کر رہی تھیں۔

ضامن نے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ لڑکی مصروف رہی یہاں تک کہ اس جار میں سے تمام کلیاں نکل کر اس قبر کو مہکا گئیں جو غالباً کسی نوزائیدہ بچے کی تھی۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ اپنے سر پہ دوپٹے کو ٹھیک کیا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔

ضامن چونک کر اس منظر کے سحر سے نکلے اور خود کو ملامت کرنے لگے کہ کیسی جگہ کھڑے ہو کر کسی انجان لڑکی کو یوں تک رہے ہیں حالانکہ ایسی ان کی نہ تو فطرت تھی نہ ہی عادت۔

وہ قبرستان سے باہر جانے والے رستے پہ آ گئے۔ اچانک ایک شور سا بلند ہوا۔ انہوں نے اس سمت نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ یہ شور بغیر سائلنسر کی موٹر سائیکلوں اور ان پہ سوار نوجوان لڑکوں کی چیخوں اور سیٹیوں کا تھا۔ وہ قبرستان سے باہر والی کچی سڑک پر مٹی اڑاتے ہوئے آئے اور سڑک پہ آگے پیچھے کھڑی دونوں گاڑیوں کے پاس رک گئے۔ پھر چند لڑکے چھلانگ مار کر اترے۔ سلور گرے سوک پہ بیٹھے اور شور مچاتے ہوئے گاڑی اور موٹر سائیکلوں سمیت یہ جا وہ جا۔

یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ وہ گرد کی چادر میں لپٹے اس غیر واضح منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہ گئے۔ صورت حال سمجھ میں تب آئی جب وہ لڑکی "رکو۔ رکو۔ میری گاڑی۔ رکو۔" کہتے ہوئے بے ربط انداز چلاتی ہوئی ان کے برابر سے گزر کر قبرستان کی چار دیواری پار کر کے باہر نکل گئی۔ صورت حال سمجھتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئے۔

"وہ۔ وہ میری گاڑی لے گئے۔" پریشانی میں ان کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ یکایک اسے جانے کیا خیال آیا کہ ان کے پیچھے لپکی۔

"نہیں۔ آپ رہنے دیں پلیز۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

وہ سات آٹھ لڑکے اور یہ اکیلا اجنبی۔ خدانخواستہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچا دیتے تو۔

وہ ایسا رسک کیونکر لے سکتی تھی۔ اور ضامن مصطفیٰ ایسا رسک تو شاید لے لیتے مگر شام کے اس سمے ایک لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر جا نہ سکے۔ شور اپنے پیچھے دھول مٹی کا دھواں چھوڑتے ہوئے دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے حواس بحال کر چکی تھی اور اب اطمینان سے اس سمت دیکھ رہی تھی۔ اور کسی نتیجے پہ پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آیئے۔ میں آپ کو چھوڑ دوں۔" انہوں نے شائستگی کے ساتھ پیشکش کی۔

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"رات ہونے والی ہے، یہاں سے آپ کو کوئی مناسب سواری نہیں ملے گی۔" انہوں نے مہذب لہجے میں سمجھایا۔ "اور آپ جانتی ہیں کہ یہ جگہ شہر سے کافی دور ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ سورج اپنے مسکن کو لوٹ چکا تھا۔ اس کی باقی ماندہ سرخیوں کو رات کی سیاہیاں نگلنے کے چکروں میں تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

"آپ مجھے ٹیکسی اسٹینڈ تک چھوڑ دیں پلیز۔"

"میں آپ کو کسی ٹیکسی ڈرائیور سے کم قابل اعتبار لگ رہا ہوں کیا؟" ضامن اس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔

اس نے پہلی دفعہ ان کی طرف غور سے دیکھا۔ سفید شرٹ، سیاہ پتلون، سرمئی اور سیاہ دھاریوں والی ٹائی میں وہ بندہ لگ رہا تھا کہ آفس سے نکل کر سیدھا یہیں آ رہا ہے۔ ان کی شان دار پروقار شخصیت بلاشبہ قابل اعتبار لگ رہی تھی۔

وہ کچھ کہے بنا ان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

ضامن نے آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

"مجھے ضامن مصطفیٰ کہتے ہیں۔" تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔ گاڑی پکی سڑک پہ آ چکی تھی۔

"اور میں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید ہوں۔"

"ایڈووکیٹ۔ ہوں۔ فائٹ فار رائٹ (حق)۔ رائٹ (صحیح)؟" انہوں نے اس پہ ایک نظر ڈالی۔

"رائٹ۔ (صحیح)۔" خولہ مسکرائی۔

"گریٹ۔ اچھی لگتی ہے حق کے لیے لڑتی عورت۔" یہ جملہ شاید انہوں نے اپنے آپ سے کہا تھا، اس لیے تو خولہ کے کانوں تک بمشکل پہنچ پایا۔

"حق کے لیے تو ہر کوئی لڑتا ہے۔"

"ہر کوئی نہیں لڑتا۔" انہوں نے خزاں رسیدہ لہجے میں اس کی بات کو مسترد کیا۔ عجیب حزن و ملال کی کیفیت تھی جس میں وہ یکدم گھر گئے تھے۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے سڑک پہ نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتے رہے۔

"آپ کیا کرتے ہیں۔" خولہ کو خاموشی سے وحشت ہونے لگی تو یہی پوچھ لیا۔

"الیکٹرک ہوم اپلائنسز کا بزنس ہے میرا۔ ہماری کمپنی یہ اپلائنسز تیار کرتی ہے۔" انہوں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور پھر طویل خاموشی۔

"کیا میں آپ کا سیل فون استعمال کر سکتی ہوں؟" اور کچھ سمجھ نہ آیا تو سوچا بابا کو ہی اطلاع کر دے کہ ان کی لاڈلی کیا نقصان کروا چکی ہے۔ اپنا موبائل تو گاڑی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اس لیے ڈیش

بورڈ پہ سگریٹ کیس کے ساتھ رکھے ان کے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔
"شیور۔" یک لفظی جواب آیا۔
بابا کو ساری کتھا سنانے کے بعد اپنا نمبر ڈائل کیا۔ حسب توقع بند تھا۔
"گاڑی تو لے کر گئے، موبائل بھی چلا گیا۔ ماما بابا نے گفٹ کیا تھا۔ یا اللہ بیگ بھی تو میرا اسی میں تھا۔ اور میری فائلز۔" اب ایک کے بعد ایک نقصان یاد آ رہا تھا جسے با آواز بلند گنوایا جا رہا تھا۔
"ینگسٹرز اور ان کے ایڈونچرز۔" ضامن نے چند لفظوں میں نئی نسل کی حرکتوں پہ تاسف کا اظہار کیا اور پھر جامد چپ۔
یہ شخص کم گو ضرور ہے مگر مزاج میں اتنی سنجیدگی تو یک دم ہی عود کر آئی تھی۔ وہ اپنے نقصانات بھول کر "ان" کو سوچنے میں محو ہو گئی۔
"کس علاقے میں جانا ہے آپ کو؟" شہر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے پوچھا تو وہ چونکی۔
"ایسا کریں۔ کسی اچھی سی بیکری کے سامنے اتار دیں مجھے۔ میں نے کیک لینا ہے۔"
"گاڑی چھن جانے کے غم میں کیک کھاتے پہلی بار دیکھوں گا کسی کو۔" پہلے تو وہ حیرت میں مبتلا ہوئے پھر اسی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ خولہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
بہت انوکھے مدھم سروں سے ضامن مصطفیٰ کی سماعتیں آشنا ہوئیں۔ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
ہنستے میں وہ اور بھی نکھر گئی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے بالکل پاس وہ سیاہ تل بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی مقناطیسی کھلکھلاہٹ نے ایسا حصار باندھ دیا جس کی جانب ضامن مصطفیٰ کو اپنا آپ کھنچتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

"بتا مولوی! کیا کر ڈالا تو نے؟" واحد نے بازو پہ بیٹھے اپنے خون سے پیاس بجھاتے مچھر کو تاک کر مارا اور پھر اس سے نکلنے والے خون کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
مولوی عبدالرحیم سر جھکا کر بیٹھے رہے۔
"سرکاری زمین پہ غیر قانونی طریقے سے قبضہ کر کے مسجد بنا ڈالی یا مسجد کے چندے میں خرد برد کر ڈالی؟" واحد کا لہجہ استہزائیہ تھا۔
مولوی صاحب ابھی بھی چپ تھے۔ ہاں کچھ دیر بعد ان کی سسکی ضرور ابھری تھی۔ عبدالہادی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دانتوں میں خلال کرتا واحد بھی چونکا۔ اسی اثنا میں عبدالہادی کو بتایا گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے۔
"واہ بے۔ تیری بڑی ملاقاتیں آتی ہیں۔ واحد کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ گھر والی بھی سوچتی ہوگی کہ چل چند دن سکون کے گزار لوں۔ تو بتا مولوی۔ تیری کسی کو پرواہ ہے کہ نہیں۔" جیسے واحد کے لیے شرافت کی زندگی بسر کرنا مشکل تھا، اسی طرح اس کے لیے چپ بیٹھنا بھی ذرا مشکل کام تھا۔
"مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے اور یہ تو ملاقات کا وقت بھی نہیں؟" عبدالہادی اس کی بات پہ دھیان دیے بنا حیران ہوتے ہوئے باہر آیا۔ اور پھر ملاقاتیوں والے کمرے میں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔
رات کے اس وقت۔ اور ایک عام ملاقاتی بن کر۔
"آج میں تم سے تمہاری وکیل نہیں بلکہ تمہاری دوست بن کر ملنے آئی ہوں۔" خولہ نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔
وہ اس لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا جو آج کچھ مختلف لگ رہی تھی۔ شاید ایک وکیل والے سفید لباس اور کالے کوٹ میں نہیں تھی، اس لیے۔
وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی مگر جواب میں اس کی چپ ہی ملی۔ وہ تو کبھی اس سے کچھ شیئر نہ کر پایا تھا جس سے وہ ہر بات کرنا چاہتا تھا۔ اپنے خواب، اپنی آرزو، اپنے جذبات، اپنے احساسات۔ کبھی

کچھ بھی تو کہہ نہیں پایا اس سے۔ اس نے صحیح معنوں میں اسے کھویا تھا۔ اب سانسیں پچھتانے کے لیے باقی رہ گئی تھیں۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ قید برداشت کر رہا تھا، اس نے جسمانی تشدد بھی سہا تھا۔ وہ رویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھ بھیگتی تھی تو صرف اس کے لیے جس نے کبھی اس سے ایک سوال پوچھا تھا اور وہ جواب نہ دے پایا تھا، جس نے کبھی ایک خواہش کی تھی اور وہ پوری نہ کر پایا تھا۔

خولہ آدھا گھنٹہ اس کے پاس بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کا شکریہ ادا نہیں کر پایا۔ یہی تو اس کی کمزوری تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی عزیز ترین متاع کھو دی تھی۔ وہ کبھی کہہ نہیں پاتا تھا جو اس کے دل میں ہوتا تھا۔

☆☆☆

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟"

"اس لڑکی کا دماغ خراب ہے آنٹی۔ لگتا ہے ہم دونوں کو ہی درست کرنا پڑے گا۔" اقصیٰ نے اسے گھورتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا۔

اس نے دھنیے پودینے کی چٹنی میں پکوڑا ڈبویا اور منہ میں رکھتے ہوئے پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جیسے بات اس کے متعلق نہیں کسی چوتھے پانچویں کے بارے میں ہو رہی تھی۔ ثروت کو تاؤ ہی تو آگیا۔

"میں کرنے لگی ہوں عبید کے لیے ہاں۔"

"آنٹی! مجھے تو دکھا دیں پہلے۔ ہے کیسا؟" اقصیٰ نے کپ جلدی سے میز پہ رکھا۔

"ہیں۔ اس نے تمہیں تصویر نہیں دکھائی؟" ثروت کا منہ کھلا۔

"کہاں آنٹی۔"

"خولہ۔"

"جی ماما۔" اتنی تابعداری کے ساتھ کہا گیا جیسے کہ اس سے زیادہ فرماں بردار کوئی بیٹی اس کرہ ارض پہ نہ تھی۔

"تم نے عبید کی تصویر اقصیٰ کو کیوں نہیں بھیجی؟"

"کون عبید؟" یہ ماں کا نقطہ کھولاؤ اعلا درجے پہ پہنچانے کی حقیری کوشش تھی۔

"خولہ۔" ثروت نے غصے سے کپ میز پہ رکھا اور پھر اقصیٰ کی طرف مڑیں۔ "دیکھا دیکھا۔ اقصیٰ! یہی کرتی ہے یہ ہمیشہ اور سب کو لگتا ہے کہ ماں باپ کو اس کی فکر ہی نہیں۔ گھر بٹھایا ہوا ہے۔ شادی کرنا ہی نہیں چاہتے بیٹی کی۔"

"ماما۔ لوگوں کو سیریس نہ لیا کریں۔" اس نے ماما کو جذباتی ہوتے دیکھ کر رسان سے کہا۔

"ہاں تمہاری اور تمہارے باپ کی طرح ڈھیٹ بن جاؤں۔"

"لیں۔ اب بے چارے بابا کو کیوں لے آئیں بیچ میں۔"

"یہ تمہارے بے چارے بابا ہی ہیں جنہوں نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تمہاری عمر کی تھی تو۔ تو دس سال کی بیٹی کی ماں تھی۔" بیچ میں ایک لمحے کے لیے رکیں کہ نالائق اولاد "تو۔" سے آگے کا جملہ خود پورا کر دیتی تھی مگر آج وہ چپ رہی۔ صرف مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

"اور آنٹی! میرا سات سال کا بڑا بیٹا ہے۔" اقصیٰ نے مزے سے کباب کھاتے ہوئے لقمہ دیا۔

"and award goes to..."

اس نے اقصیٰ کو دیکھتے ہوئے چبا چبا کر کہا پھر ماما کے تیور دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اور موبائل بھی ہاتھ سے رکھنا پڑا۔

"میں عبید سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"وجہ؟" ماما نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"وجہ یہ کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔"

"ہیں؟ تم سے کیا جھوٹ بول لیا اس نے؟"

ثروت حیران ہوئیں۔

"اس نے کہا کہ اس کو پڑھی لکھی خواتین پسند ہیں۔ اور اپنی بہن کو بی اے تک کرنے نہیں دیا، اس

کی شادی کر دی۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" اقصیٰ نے پوچھا۔

"میں نے اس کی بہن سے اگلوایا۔"

"ایک تو یہ وکیل۔" اقصیٰ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ہر انسان میں کوئی کمی خامی ہوتی ہے خولہ۔ مجھ میں، تم میں بھی کئی ہوں گی۔" ثروت نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ بولنا کوئی ایک کمی خامی نہیں، یہ ہر کمی خامی کی جڑ ہے ماما۔"

"ایسا بھی کیا جھوٹ بول دیا اس نے۔ خولہ وقت اور حالات کی بات ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت، بہن کی شادی کرنا ہی مناسب فیصلہ ہو۔"

"ہو سکتا ہے ماما۔ مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جس بندے کو پڑھی لکھی بیوی چاہیے، وہی کل مجھے گھر نہیں بٹھائے گا۔"

"ہاں تو بٹھا دے گھر۔ گھر بیٹھی عورت با عزت نہیں کیا۔ میں اور یہ اقصیٰ ہم بھی تو ہاؤس وائف ہیں۔ تو کیا یہ برا ہے؟ نہیں بلکہ مجھے تو لگتا ہے ہم زیادہ سکون میں ہیں۔"

"ہاؤس وائف ہونا آپ کی یا اقصیٰ کی اپنی چوائس ہے ماما۔ اس لیے آپ خوش ہیں۔ لیکن میں اپنا کیریئر شادی کے لیے داؤ پہ نہیں لگا سکتی۔ وکالت میرا شوق ہے، جنون ہے۔"

"جاب، پروفیشن، کیریئر شوق ہی رہے تو اچھا ہوتا ہے خولہ، مجبوری بن جائے تو تکلیف دیتا ہے۔ ان عورتوں سے پوچھو، جو شادی کے بعد نوکری کرنے پہ مجبور ہوتی ہیں، وہ کن حالات سے گزرتی ہیں۔"

"میں کب چاہتی ہوں ماما کہ وکالت میری مجبوری بنے۔ لیکن چھوڑوں تو اپنی مرضی سے چھوڑوں۔ کوئی مرد مجھے مجبور نہ کرے اس کے لیے۔ اور عبید کرے گا ایسا۔"

"ہاں تمہیں تو خواب آیا ہے ناں۔" ماما چڑ ہی تو گئیں۔ جبکہ اقصیٰ خاموشی کے ساتھ سنتے ہوئے خستہ پکوڑے کھا رہی تھی۔ اسے پتا تھا بحث میں وہ خولہ سے جیت نہیں سکتی، اس لیے اب تو بس دعا ہی کرتی تھی کہ اس لڑکی کو کوئی بندہ خدا پسند آ جائے۔

"میں پہچانتی ہوں لوگوں کو ماما۔"

"اتنے بڑے دعوے نہیں کرتے خولہ۔"

خولہ نے سادگی کے ساتھ کندھے اچکائے۔

"اسی طرح مین میخ نکالتی رہیں تو پسند آئے گا تمہیں کوئی بندہ بھلا۔" ثروت کو بیٹی کی حرکتیں پریشان کرنے لگی تھیں۔

"چھوڑیں آنٹی۔ جس دن کوئی بندہ پسند آ گیا ناں اسے، اس دن آنکھوں پہ پٹی بندھ جانی ہے۔ پھر کوئی کمی، خامی، جھوٹ، مکر فریب نظر نہیں آنا اسے۔" اقصیٰ ہنسی۔

"ہاں جیسے تمہیں پسند کرتے ہوئے تیمور بھائی کی آنکھوں پہ پٹی بندھ گئی تھی۔"

"میری جان۔ اسی کو تو کہتے ہیں محبت۔"

وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کو چڑانے لگ گئیں اور ثروت فکرمندی ہو کر اٹھ گئیں۔

☆☆☆

"سوری میڈم! آپ کو کچھ دیر ویٹ کرنا پڑے گا۔ اکچوئلی اتنی بڑی اماؤنٹ کا چیک ہم منیجر صاحب کے اوکے کرنے کے بعد ہی کیش کرتے ہیں اور وہ ابھی ہیڈ آفس گئے ہوئے ہیں۔" گھنگریالے بالوں والی اس لڑکی نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے وجہ بیان کی۔ خولہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اے ٹی ایم سے اتنی بڑی رقم نکلوا نہیں سکتی تھی اس لیے انتظار کرنا مجبوری ٹھہرا۔ لڑکی نے قاصد کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو منیجر صاحب کے کیبن میں بٹھا دے۔ وہ کوفت کے عالم میں کیبن میں داخل ہوئی لیکن منیجر کی میز کے بائیں جانب بڑی کرسی پہ براجمان شخصیت کو دیکھ کر اس کے قدم تھم گئے اور کوفت زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میڈم! آپ پلیز یہاں تشریف رکھیں۔"

قاصد لڑکے نے دیوار کے ساتھ رکھے صوفے کی

اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ اخبار میں گم ضامن مصطفیٰ کی نظر بھی تب تک اس طرف پڑ چکی تھی۔ وہ اس کو یہاں دیکھ کر حیران ہوئے اور پھر جلدی سے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خولہ نے کھڑے کھڑے انہیں خوش دلی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھیے پلیز۔" انہوں نے سلامتی کا جواب دیا اور صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ جب تک وہ بیٹھ نہ گئی، وہ کھڑے ہی رہے۔

"اچھا لگا آپ کو دیکھ کر۔ کیسے ہیں آپ۔"

جس شخص نے اس کے اپنے شہر سے بہت دور، جب دن خدا حافظ کہہ رہا تھا اور رات سلام کرنے والی تھی، جہاں ٹیکسی کے ملنے کے امکانات صفر ہی تھے۔ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس کی مدد کی تھی، اس کے لیے یہ الفاظ نہایت دل سے نکلے، لبوں سے ادا ہوگئے اور سامنے والے کو متبسم کر گئے۔

"الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک آپ اپنی سنائیں۔"

"میں بھی بالکل ٹھیک۔ خوش و خرم۔"

"کیسی جا رہی ہے آپ کی وکالت۔ بلکہ پہلے یہ بتائیں کہ گاڑی تو لاک کر کے آئی ہیں ناں آپ اپنی؟"

خولہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

کیسی گنگناتی ہنسی تھی۔

ضامن مصطفیٰ اس ردھم میں کھو سے گئے۔

"نئی گاڑی ہے؟" کافی دیر بعد وہ کچھ بول پائے۔

"نہیں وہی ہے۔"

"اچھا۔ کب؟ کہاں سے ملی؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ اس ملک کے حالات ایسے تو نہیں کہ چرائی گئی، چھینی گئی، لوٹی گئی چیز واپس مل جائے۔

"اگلی صبح ہمارے گھر کے سامنے سے۔" اس نے مزے سے بتاتے ہوئے انہیں الجھن میں ڈالا۔

"کیا؟ آپ کی گاڑی آپ کی نظروں کے سامنے اڑا لے جانا پھر آپ کے گھر کے سامنے چھوڑ دینا مقصد کیا تھا اس عمل کا۔"

"مقصد ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کو یہ بتانا تھا کہ ابھی تو صرف گاڑی لے کر گئے۔ واپس چھوڑ دی۔ اور اگر وہ اب بھی ان کی مخالف پارٹی کو حق دلوانے کے لیے انہیں کٹہرے سے جیل تک کا سفر کروانے کے لیے سرگرم رہی تو پھر کہیں بھی، کچھ بھی، کسی کو بھی اٹھا سکتے ہیں۔ واپس نہ چھوڑنے کے لیے۔" وہ بڑے آرام سے بتا رہی تھی۔ جیسے اپنی بات نہ کر رہی ہو بلکہ کسی ڈرامے کی کہانی سنا رہی ہو۔

"اتنی بڑی دھمکی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ کیا ابھی بھی آپ وہ کیس لڑ رہی ہیں؟" ضامن کے لہجے اور چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ جانے کیوں اندر ہی اندر وہ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

"بالکل لڑ رہی ہوں یہ کیس۔" اس نے ایک لحہ ٹھہر کر ان کی جانب دیکھا۔ "ضامن مصطفیٰ۔ یہ دھمکیاں تو ہمارے لیے ملٹی وٹامن کا کیپسول ہیں۔ ہمیں انرجائز کرتی ہیں۔ ہماری کمزوریوں کو دور کر کے طاقت بخشتی ہیں۔ ہم میں نئے عزم جگاتی ہیں۔"

وہ بول رہی تھی۔ اور ضامن حیرانگی، الجھن اور پریشانی کے دور سے گزر چکنے کے بعد اب دلچسپی سے اس بہادر لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو موم تھی نازک تھی لیکن درحقیقت آہن تھی، چٹان تھی۔

"اور آپ بتایئے آپ کا بزنس کیسا جا رہا ہے؟" اس نے گفتگو کا رخ ان کی ذات کی طرف موڑا اور پھر کچھ یاد آنے پہ خود ہی بول پڑی۔ "پتا ہے پچھلے ہفتے آپ کی کمپنی کا مائیکرو ویو خریدا ہے ہم نے۔"

"یعنی کہ ہمارے کسٹمرز میں اضافہ۔ ضامن مصطفیٰ آپ کا مستقبل تابناک ہے۔" ان کا لہجہ شگفتہ ہوا تو وہ ہنس دی۔

اس بار انہوں نے اس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کی۔ خوامخواہ نظریں اس کے چہرے پہ ٹھہر جانے کو مچلتیں، بس ساعتوں نے ہی اس کی ہنسی کی

موسیقی سے لطف لیا۔

جو منیجر صاحب تھوڑی دیر میں پہنچنے والے تھے وہ قریباً گھنٹے میں تشریف لائے۔ انتظار دونوں کو برا لگتا تھا مگر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ آج دونوں ہی اس انتظار سے اکتائے نہیں۔ دونوں کو ہی اپنی اپنی بے پناہ مصروفیات یاد نہ آئیں۔ دونوں نے اس ایک گھنٹے میں بات تو کم کی مگر اک دوجے کو محسوس بہت کیا۔

"میری آپ لوگوں سے ایک ریکویسٹ ہے۔" انتظار کے لیے معذرت کرنے کے بعد ان دونوں کے چیک پہ نظر ڈالتے ہوئے منیجر صاحب ذرا خوش آمدانہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے۔ "اگر آپ یہ اماؤنٹ منڈے کو ڈرا کروالیں تو۔"

ایک لمحہ رک کر ان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"ایکچوئلی۔ آج ہفتے کا آخری دن ہے۔ ہماری ویکلی بیلنس شیٹ بنتی ہے۔ اس میں کلوزنگ کریڈٹ جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی برانچ کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے۔ آپ تو بڑے لوگ ہیں، کئی اکاؤنٹ رکھتے ہیں۔ ذرا ہم پہ مہربانی۔" منیجر صاحب چاپلوسی پہ اترنے لگے۔

ضامن نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور اپنا چیک واپس لے لیا جبکہ خولہ کو یہ رقم لازماً پھوپھو کو بھجوانی تھی، ان کی بیٹی کی شادی تھی اور ماما کی ہدایت تھی کہ ان کو آج کے آج یہ رقم پہنچاؤ۔ اس لیے وہ منیجر صاحب پہ مہربانی نہ کر پائی۔ ضامن نے اس کا چیک کیش ہونے تک انتظار کیا پھر دونوں ایک ساتھ بینک سے نکلے۔

"ایڈووکیٹ خولہ۔"

وہ ضامن کو "اللہ حافظ" کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی جب انہوں نے پکار لیا اس نے رک کر ان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بہادری اچھی بات ہے لیکن احتیاط بھی اچھی بات ہے۔ اپنا خیال رکھا کریں۔"

"آپ تو یوں نصیحت کر رہے ہیں جیسے بابا کرتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"نصیحتیں اور ہدایت آپ کو وہی کرتے ہیں جو آپ کی پروا کرتے ہیں۔"

خولہ بنت زید کا دل جانے کس لیے پہ تھرکا۔

"ہوں۔ تو جناب آج مجھے اپنی پرواہ کرنے والوں کی فہرست میں ایک نئے نام کا اندراج کرنا پڑے گا۔" ازلی خوداعتمادی کو فوراً پکار لیا تھا اس نے۔

"ہمیں خوش گمانی تھی کہ آپ یہ کام کر چکیں۔" سامنے والا بھی کم خود اعتماد نہ تھا۔ ساتھ ساتھ غضب کا خودشناس بھی تھا شاید۔

پہلی بار۔ زندگی میں پہلی بار خولہ بنت زید کسی کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا پائی۔ بہادری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی کی پلکیں جھکیں اور آہستگی سے "اللہ حافظ" کہہ کر گاڑی کی طرف مڑ گئی۔ ☆☆☆

"اسلام وہ دین مساوات ہے جو محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کرتا ہے۔ جس میں رنگ، نسل اور ذات پات کا کوئی سلسلہ نہیں۔ یہ۔"

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔" عبدالہادی نے پلیٹ پٹختے ہوئے مولوی عبدالرحیم کی بات کاٹی۔

قیدیوں نے ایک پل کے لیے ہاتھ روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر مولوی عبدالرحیم کی طرف اور پھر دوبارہ اپنے اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جن میں پڑی آلو چھولے کی بریانی اور ساتھ تھوڑا سا زردہ مولوی صاحب کے درس سے زیادہ کشش رکھتے تھے۔ زردے پلاؤ کی یہ دیگیں کسی سیٹھ نے بھجوائی تھیں جسے کبھی کسی وجہ سے حوالات میں دو ہفتے گزارنے پڑے تھے۔ اس عرصہ میں وہ جان گیا تھا کہ سب سے بڑی سزا یہاں کا کھانا ہے۔ تب سے وہ اکثر قیدیوں کے لیے کھانا بھجواتا تھا۔

"کھانا کھاؤ بیٹا!" مولوی عبدالرحیم نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہتے ہوئے سامنے پڑی پلیٹ نزدیک کھسکائی اور با آواز بلند کھانا شروع کرنے کی دعا پڑھنے کے بعد پہلا نوالہ منہ میں ڈالا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ جو بدستور بڑبڑا رہا تھا۔

"جھوٹ۔ سب جھوٹ۔"

مولوی عبدالرحیم کے لیے وہ ایک پہیلی سا تھا۔ اور سچ بات تو یہ کہ کچھ ہی عرصہ میں اس کے ساتھ انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ جس وقت وہ جیل میں قدم رکھ رہے تھے اس وقت شرم سے سر جھکا جاتا تھا اور داڑھی آنسوؤں سے بھیگی جاتی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ عمر بھر کی عزت خاک ہوئی۔ اس پہ واحد کے ٹھٹھے، ہنسی مذاق۔

تب عبدالہادی نے ان کی طرف کیک کا ٹکڑا بڑھایا تھا۔ انہیں لگا، وہ بھی واحد کی طرح ان کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پرے کر دیا تھا۔

"مولوی صاحب کو کیک نہیں حلوا کھلا یار۔"

واحد بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے ہنسا تھا۔

عبدالہادی نے ناگواری کے ساتھ اسے دیکھا اور مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر اصرار نہیں کیا۔

"کھالے مولوی! یہ بیٹ بڑی کمینی شے ہے۔ یہ تو مرتے وقت بھی دو گھونٹ پانی مانگتا ہے۔"

واحد کی ہنسی کا ساتھ صرف اس کی توند دے رہی تھی۔ وہاں بیٹھے باقی دونوں نفوس کو یہ قہقہہ کان میں کسی دھماکے کی طرح لگ رہا تھا۔

"یہ بستر تھوڑا صاف ہے۔ آپ اس پر لیٹ جائیں۔" عبدالہادی نے اٹھ کر اپنا بستر ان کے لیے بچھایا تھا۔

وہ پہلا دن تھا اور اس کے بعد سے انہوں نے جتنا اسے جانا تھا، یہ ہی سمجھے تھے کہ ان کی طرح وہ بھی کسی ایسے جرم میں اندر ہے جو اس نے کیا ہی نہیں۔

وہ بہت سلجھا ہوا جوان تھا۔ نہ وہ گفتگو میں خود سے حصہ لیتا تھا، نہ ہی کسی سوال کا جواب ایک دو لفظ سے زیادہ دیتا تھا۔ اس کا لہجہ مہذب تھا مگر آج ایک دم سے اس کا چلا اٹھنا۔ وہ ابھی تک متعجب تھے۔

☆☆☆

"خالہ! یاد ہے ناں آج کیا دن ہے؟"

پیاری سی ماہا ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ خولہ مسکرا دی۔ اور اسکرین پہ بنے مائیک پہ ہاتھ رکھا۔

"جی میری جان۔ خالہ کو یاد ہے۔" اس نے ماہا کے وڈیو میسج کے جواب میں وائس نوٹ بھیجا اور باقی میسجز دیکھتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگی۔ اسے مارکیٹ جانا تھا۔ ماہا کے لیے گفٹ لینا تھا۔ دو بیٹوں کے بعد آنے والی بیٹی کی سالگرہ اقصیٰ اور تیمور دونوں میاں بیوی بہت دھوم دھام سے مناتے تھے۔ زینب کے ساتھ وہ کورٹ سے نکل آئی۔

"تم گفٹ لو۔ میں جب تک یہاں ہوں۔" مال میں داخل ہوتے ہوئے تو زینب کو "میک اپ ٹی" نظر آ گیا تھا۔ اب بھلا وہ جاتی کہیں اور۔

خولہ نے سر ہلایا اور اس فلور پہ آ گئی جہاں بچوں کی گفٹ شاپ تھی۔ اس نے ماہا کے لیے پنک اور وائٹ کلرز کا ایک ڈول ہاؤس پسند کیا اور گریٹنگ کارڈز والے حصے کی طرف بڑھی۔

فرینڈ شپ، فارگیو می، تھینکس۔

اس نے ہر طرح کے کارڈز پہ نظر دوڑائی اور زیر لب پڑھتے پڑھتے اس طرف بڑھی جہاں اس کے مطلوبہ کارڈز سجے ہوئے تھے۔ اس کا دھیان قطعاً بھی سامنے نہ تھا۔ اس لیے دائیں جانب سامنے سے نکلتے اس بندے کو نہ دیکھ پائی، جو ایک قدم اگر پیچھے نہ ہٹتا تو یقیناً وہ اس سے ٹکرا جاتی۔

"سوری۔" احساس ہونے پہ اس نے معذرت کرتے ہوئے سامنے والے کو دیکھا اور مزید جھینپ گئی۔

''السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟'' ضامن مصطفیٰ نے خوش دلی سے اسے مخاطب کیا۔ اسے دیکھ کر ان کے رگ و پے میں خوش گوار سا احساس سرایت کر گیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔ آپ یہاں کیسے؟''

''میرے فرینڈ کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے۔ اس کے لیے گفٹ لینے آیا تھا اور آپ؟''

''اتفاق سے میری بھی بھانجی کا برتھ ڈے ہے۔ میں بھی اسی سلسلے میں آئی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ اتفاقات ہی تو ہیں جو آپ کی زندگی میں سے کچھ لمحے چرا کر ہمیں دان کر دیتے ہیں۔'' بالکل بے اختیاری کیفیت میں ان کے منہ سے یہ جملہ ادا ہوا اور خولہ بنت زید کو ایک نئے احساس سے روشناس کروا گیا۔

''خیر۔ تو گفٹ پسند کر لیا آپ نے؟'' جلد ہی ضامن نے اس بے ختیاری پہ اختیار پا لیا۔

''جی ہاں۔ پسند بھی کر لیا، خرید بھی لیا اور پیک بھی کروا لیا۔'' دلی کیفیت پہ وہ بھی قابو پا چکی تھی سو بہت اعتماد سے جواب دیا۔

''اچھی بات ہے۔ چلیں اب میری بھی مدد کریں۔ گفٹ پسند کروا دیں میرے ساتھ۔ پھر خرید میں خود ہی لوں گا۔ پیک بھی خود ہی کروا لوں گا۔'' انہوں نے اسی کے انداز کو اپناتے ہوئے درخواست کی تو وہ ہنس دی۔

''ہنستا تو ہر کوئی ہے۔ لیکن ہر کوئی اتنا دلکش کیوں نہیں لگتا۔'' ایک سوال ضامن مصطفیٰ کے اندر جاگا۔

وہ ان کے ساتھ دوسری طرف آ گئی اور جو گفٹ خود لیا تھا اسی کا مشورہ انہیں بھی دیا۔ ایک بچی کے لیے یہ بہت بہترین تحفہ تھا۔ ضامن کو پسند آیا۔ گفٹ پیک ہو رہا تھا جب خولہ نے اجازت چاہی۔

''کیا ہم اکٹھے لنچ کر سکتے ہیں؟؟'' ضامن نے شائستگی سے پوچھا۔

''پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے جانا ہو گا۔ فرینڈ ہے ساتھ۔ اسے جلدی ہے اور مجھے بھی ایک دو کام نپٹانے ہیں۔ پھر فنکشن میں بھی وقت پہ پہنچنا ہے۔ ورنہ اقصیٰ تو مجھے مار ہی ڈالے گی۔'' اس کی معذرت سنتے ہوئے ضامن چونکے۔

''لگتا ہے ایک خوبصورت اتفاق اور ہونے والا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

ضامن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکرا کر جیب سے والٹ نکالا اور کاؤنٹر کی طرف مڑ گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی زینب کی تلاش میں نکلی جو اس کی توقع کے عین مطابق کاسمیٹکس میں ہی گم تھی۔

☆☆☆

شیفون کا سیاہ لباس جس کے گلے اور آستینوں پہ روبی اور فیروزہ کو استعمال کرتے ہوئے بہت منفرد کام کیا گیا تھا، اس پہ سج کر حقیقت میں اور بھی خوبصورت ہو گیا۔ کمر تک آتے گھرے سیاہ اور ملائم بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے اس نے آئینے پہ آخری نظر ڈالی اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر باہر آ گئی۔ بابا تیار کھڑے تھے۔ رات کے وقت وہ اسے اکیلے کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے، خود چھوڑتے اور خود ہی لینے آتے۔

اقصیٰ نے فنکشن کا انتظام اپنے لان میں کر رکھا تھا۔ وہ ہاجرہ کو پیار کر کے اس کی ساس اور باقی فیملی سے مل کر اس میز کی طرف آ گئی جہاں اقصیٰ کے بیٹے معاذ اور مہد بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس وہیں بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ہی ان کے ننھیالی ینگ کزنز کی پارٹی پہنچی تو وہ ان کی طرف چلے گئے۔

کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ یونہی ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اقصیٰ کے بھائی کا میوزیکل بینڈ تھا جو اس وقت کوئی فاسٹ نمبر گا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں یونہی بھٹکتے ہوئے پاس لگے موتیا کے پودے پہ کھلی کلیوں پہ اٹک سی گئیں۔ ان کی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے اس کا دھیان عبدالہادی اور اس قبر کی

طرف چلا گیا۔ پھر تیز میوزک، بچوں کا ہلا گلہ، عورتوں اور مردوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ اس کیس کی پیچیدگی پہ غور کرتے ہوئے اس قدر کھو گئی کہ اس وقت چونکی جب اس کے اور موتیا کے بیچ سیاہ مردانہ چپل میں مقید دو صاف ستھرے سے پاؤں آ کر حائل ہوئے۔ اس نے نگاہ اوپر کی۔

"لگتا ہے ایک اور خوبصورت اتفاق ہونے والا ہے۔" اس کے کانوں میں آج دوپہر کو کہا گیا ضامن مصطفیٰ کا جملہ گونجا اور لبوں پہ بے اختیار تبسم بکھر سا گیا۔

سیاہ کرتا شلوار، کندھوں پہ براؤن شال۔۔۔ ضامن مصطفیٰ اپنی بھرپور جاذبیت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ بلاشبہ وہ لاکھوں میں ممتاز نظر آنے والا شخص تھا۔

یہ اتفاق اسے بھی بہت خوش گوار لگا۔ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے ان کے لباس کا بغور جائزہ لیا اور دل میں ان کی خوش لباسی کو سراہا بھی۔

"ایک اتفاق اور۔" انہوں نے اسے بغور اپنا جائزہ لیتے دیکھ کر اپنے اور اس کے لباس کے ہم رنگ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہنس دی اور ساتھ ہی انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ "شکریہ" کہتے ہوئے میز کے دوسری جانب پڑی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

"کس سوچ میں اتنا محو تھیں آپ؟"

"یونہی ایک کلائنٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"تو آپ کی سوچوں میں آنے کے لیے مجرم بننا پڑتا ہے؟" گہرا لہجہ، گہری نگاہیں۔

ایک پل کے لیے تو وہ گڑبڑا سی گئی۔ دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔

"میرے کلائنٹس مجرم نہیں ہوتے۔" جلد ہی اس نے خود پہ قابو پایا۔

"دوہری فیس لیتی ہیں کیا؟" انہوں نے مہد کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا جو دور سے ان کو دیکھ کر ان کی طرف بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"کیوں! کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھی۔

"عدالت سے باہر بھی ان کی وکالت کرنے کی۔" ٹشو پیپر کے ساتھ مہد کے منہ پہ بنے نقش و نگار صاف کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔ ضامن سر اٹھا کر اس اسے تکنے لگے۔

ہنسی تھی یا کوئی امتحان۔

وہ نگاہیں چرا گئے اور مہد سے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی اپنی توتلی زبان میں ان کے ساتھ لگ گیا۔ خولہ ان کی باتیں سن کر مسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اقصیٰ ان کی جانب آئی۔

"ضامن بھائی! شکر آپ آئے۔ ورنہ آج تو تیمور نے بھی آپ سے خفا ہو جانا تھا۔"

وہ مسکرا دیئے۔

"میرا خیال ہے آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں اس لیے متعارف کروانے کی ضرورت نہیں۔ کہیں آپ کلائنٹ تو نہیں ہماری وکیل صاحبہ کے؟" اس نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

خولہ کا دل۔ اف۔ کیا مصیبت ہے۔ پہلے تو کبھی ایسے نہ دھڑکا تھا۔

اقصیٰ کچھ دیر ان سے باتیں کرنے کے بعد معذرت کر کے چلی گئی کہ اسے دوسرے مہمانوں کو بھی وقت دینا تھا۔

"آپ کو پارٹیز یا فنکشنز میں جانا پسند نہیں کیا؟" خولہ نے پوچھا کیونکہ اقصیٰ کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا۔

"نہیں۔"

"یعنی کہ آپ سوشل نہیں ہیں۔"

"دکھاوے کا ہجوم اپنے اردگرد اکٹھا نہیں کرتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا سے کٹ کر رہتا ہوں۔ اپنے دوستوں کی خوشی میں شریک ہونے کی

کوشش کرتا ہوں۔ جیسا کہ ابھی یہاں موجود ہوں۔"
خولہ نے ہلکا سا سر ہلایا۔
سب مہمانوں کے آجانے کے بعد ننھی سی پری
بنی بابانے کیک کاٹا۔ اس کے بعد ڈنر کا انتظام تھا۔ وہ
اقصیٰ کی بہن کے ساتھ کچھ دیر گفتگو کر کے اپنی پلیٹ
اٹھا کر اسی میز کی طرف آ گئی۔ اس کی نظر بے خود ہو کر
ضامن مصطفیٰ پر جا ٹھہری جن کو تیمور ہاتھ پکڑ کر ایک
طرف لے گئے تھے۔ اور اب جانے ان سے کیا بات
کر رہے تھے کہ ان کے ہونٹوں پہ نرم سا تبسم تھا جبکہ
تیمور کا انداز شرارتی سا لگ رہا تھا۔
"ایسا کیا ہے ضامن مصطفیٰ تم میں کہ سارے
ماحول پہ چھا جاتے ہو۔" بمشکل ان پر سے نظریں
ہٹاتے ہوئے اس نے دل میں ان ہی سے سوال کیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ کر اس کے سامنے والی
کرسی پہ بیٹھ گئے۔ خولہ نے اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی
کوشش کی۔ لیکن اسے دل میں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا
کہ سامنے بیٹھا یہ بندہ ماحول پہ ہی نہیں حواسوں پہ چھا
جانے کی بھر پور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ وہ خود ایک
ساحرہ تھی مگر اس شخص سے ملنے کے بعد اسے محسوس
ہوتا تھا کہ ہر دفعہ وہ اس پہ ایسا سحر پھونک دیتا جس
کے طلسم سے وہ باہر ہی نہ نکل پاتی تھی۔

دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو

بینڈ کا شور ختم ہو چکا تھا اور اب کوئی مقامی غزل
گائک اپنی آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

میں اس سے جھوٹ بھی بولوں وہ مجھ سے سچ
بولے
میرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو
میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو میری پستیوں کا ساتھی ہو

خولہ بنت زید کو سامنے دیکھنا دو بھر لگ رہا
تھا۔ دوسری جانب بیٹھا وہ ساحر وہ جادوگر منتر پہ منتر
پڑھ کر اس پہ پھونکتا جا رہا تھا۔ اور وہ سحر زدہ ہوتی جا
رہی تھی۔

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو میرے تیوروں کا ساتھی ہو
وہ خواب دیکھے تو دیکھے میرے حوالے سے
میرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

ضامن مصطفیٰ کے خیالوں اور خوابوں کو الفاظ کا
پیراہن شاعر نے پہنا دیا تھا۔ اور انہی خوابوں
،خیالوں کی مجسم صورت بن کر خولہ بنت زید بڑی
شان اور تمکنت کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ
فاتح بنتی جا رہی تھی اور ضامن مصطفیٰ جانے کیا کیا
ہارتے جا رہے تھے۔
غزل ختم ہو چکی تھی اور اب کوئی اور گیت فضا
میں بکھر رہا تھا۔ لیکن دونوں کے محسوسات پچھلے لفظوں
کے حصار میں ہی تھے۔
راتیں خنک تھیں، فضا میں ٹھنڈک پھیلتی جا رہی
تھی۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا تو وہ بے اختیار اپنے
بازوؤں میں سمٹنے لگی۔ ضامن کا جی چاہا کہ وہ اپنے
کندھوں سے شال اتار کر اسے اوڑھا دیں۔ مگر ایسا وہ
محض سوچ کر رہ گئے۔ واپسی پہ انہوں نے خولہ کو اس
کے گھر ڈراپ کرنے کی پیشکش کی تھی۔
"بابا لینے آجائیں گے۔" اس نے اپنی بالی
سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ جس میں چھوٹے
چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔
"فارمل نہ ہوں خولہ! میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا
ہوں۔" ان کا لہجہ منوانے والا تھا اور وہ مان بھی گئی۔
اس نے بابا کو ٹیکسٹ کر دیا کہ وہ اسے لینے نہیں
آئیں۔ اقصیٰ اور تیمور سے رخصت لیتے وقت اقصیٰ
نے بڑے شریر انداز میں اسے دیکھتے ہوئے نظروں
ہی نظروں میں کچھ اشارے کیے۔ جنہیں اس نے
قصداً نظر انداز کیا۔ رستے میں وہ کچھ گم صم سی تھی۔
ضامن نے دو چار باتیں کیں اور اس کی چپ کو نوٹ
بھی کیا۔ کھڑکی سے یخ ہوا اندر آئی تھی۔ اس نے
شیفون کا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹتے ہوئے جیسے اس ٹھنڈک
سے بچنے کی کوشش کی۔
"شال لے لیں۔" انہوں نے پچھلی سیٹ کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو انہوں نے بیٹھنے سے پہلے وہاں رکھ دی تھی۔ اس نے منع کر دیا۔ وہ بھی اصرار نہ کر سکے۔

خولہ خود کو دل میں ڈپٹنے لگی کہ کیا ضرورت تھی اس موسم میں ایسا فیشن کرنے کی جس میں دوپہریں ٹھنڈی اور راتیں ٹھنڈی ترین ہوتی ہیں۔ گھر کے سامنے وہ جلدی سے گاڑی سے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل دی۔ ضامن اسے جاتا دیکھتے رہے۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے بیل بجائی جبکہ ضامن پہلے ہی ہارن دے چکے تھے۔ اور اب گیٹ کھلنے اور اس کے اندر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک وہ پلٹی اور ان کی طرف آئی۔ "آپ اندر آئیے ناں۔" وہ تھوڑا جھک کر شرمندہ سے لہجے میں بولی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

"نہیں شکریہ۔ اس وقت آپ خود تھکی ہوں گی، مناسب نہیں۔ پھر ان شاء اللہ۔" انہوں نے شائستگی سے منع کیا۔ گیٹ کھل چکا تھا وہ انہیں "اللہ حافظ" کہہ کر اندر چلی گئی۔ چوکیدار نے ہاتھ کے اشارے سے ضامن کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اپنے گھر تک کے سفر میں وہ خود بھی کسی گہری سوچ میں تھے جیسے کسی فیصلے تک پہنچنا چاہتے ہوں۔

☆☆☆

دکھ بولتے ہیں
جب سینے اندر سانس کے دریا ڈولتے ہیں
جب موسم پیر دھوا میں چپ سی گھولتے ہیں
جب آنسو پلکیں رولتے ہیں
جب سب آوازیں اپنے اپنے بستر پہ سو جاتی ہیں
تب آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہیں
دکھ بولتے ہیں

رات کا پہلا پہر تھا اور عبدالہادی اونچی چھت پہ رینگتے پنکھے پہ نظریں جمائے سوچ کی پرواز کو آوارہ چھوڑے لیٹا تھا۔ یہ پرواز کہیں سے کہیں گھوم کر پھر اسی ایک چہرے تک آ پہنچتی۔

وہ سیاہ نینوں میں آس بھرے ایک سوال کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسی سوال کے جواب پہ اس کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔

عبدالہادی اٹھ بیٹھا۔ اس کی پیشانی پہ ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ اضطرابی حالت میں اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اس کا تنفس تیز تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس کا دل پھٹنے کو تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو کر یہاں سے وہاں چکر کاٹنے لگا۔ وہ پانی کے ننھے قطرے اب آپس میں مل کر لہر کی صورت کنپٹیوں سے بہہ کر نیچے تک آ رہے تھے۔

اچانک اس کا پاؤں زمین پہ پڑے سلور کے گلاس سے ٹکرایا اور خاموش رات کے سمندر میں تلاطم سا برپا کر گیا۔

"ابے کیا ہے یار۔ تیرے کو دن میں سکون ہے نہ راتوں کو۔" واحد اپنے میلے چیکٹ بستر پہ کروٹ بدلتے ہوئے چلایا۔

مولوی عبدالرحیم نے سلام پھیرا اور پھر زرد مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"ابے! کوئی جرم نہیں کیا تو بے سکون کیوں ہے اور اگر کیا ہے تو ڈر کاہے کا۔ میرے کو دیکھ۔ میرے سے بڑا جرم تو نہ ہوگا تیرا۔ سوجا میرے بچے۔" اس نے پچکارتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں پھر سے اس کے خراٹے سناٹے میں گونجنے لگے تھے۔

"تم سے بڑا جرم ہی تو کیا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنی جگہ پہ آ کر فرش پہ لیٹ گیا۔ یہاں کے میل سے بھرے بوسیدہ بستر کے بجائے جگہ جگہ سے اکھڑا فرش اسے زیادہ بہتر لگتا۔

اس کی نظریں غیر مرئی نقطے پہ جم گئیں جہاں ایک مدھر بھرے سیاہ نینوں والا چاندنی سا وجود نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سیاہ نین بھی اسے ہی تک رہے تھے۔

''تم مجھ سے خفا ہو کیا؟'' اس نے پوچھا۔
کالے نینوں اور گلابی پنکھڑیوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
''تم سے بھلا کبھی میں خفا ہو سکتی ہوں؟'' جس ادا سے اس نے جواب دیا عبدالہادی کا بسمل دل کسی اور ہی لے پہ دھڑکنے لگا۔
''تمہیں کچھ خبر ہے۔ تم میرے لیے کیا ہو۔ یہ رنگ، یہ پھول، یہ جھرنے، یہ قوس و قزح سب تمہارے سامنے کتنے پھیکے ہیں۔ تم۔ تم تو۔''
وہ بولتا رہا، وہ مسکراتی رہی۔
رنگوں کی بارش دونوں کے چہرے پہ ہوتی رہی۔

☆☆☆

''تمہارے اور ضامن بھائی کے خیالات، تم دونوں کی پسند ناپسند اس حد تک ایک جیسی ہے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا۔'' اقصیٰ اس سے ملتے ہی شروع ہوئی۔ ''ایک جیسا گفٹ، ایک سی پیکنگ۔''
خولہ جھینپ کر نچلا لب دانتوں تلے دبا گئی۔
''وہاں وہ مسکرا دیتے ہیں، یہاں آپ شرما دیتی ہیں۔ چکر کیا ہے وکیل صاحبہ!''
''کیسا چکر؟''
''یہ تم پہلے ملی کب ملی ہو ضامن بھائی سے؟ اور تم نے مجھے پہلے بتایا کیوں نہیں۔''
''میں تو دن میں دسیوں لوگوں کے ساتھ ملتی ہوں۔ پھر تم کہو گی کہ میں نے ان کے بارے میں نہیں بتایا۔''
''مجھے ان دسیوں لوگوں میں کوئی دلچسپی ہے بھی نہیں۔ مجھے صرف اس ایک بندے کے بارے میں جاننا ہے جس کے ساتھ تمہارے خیالات اتنے ملتے ہیں۔ اب یہ مت کہنا کہ ایسا محض اتفاق ہے کہ تم دونوں نے ایک ہی گفٹ ماما کے لیے پسند کیا۔ خیر ملاقات اتنی پرانی نہیں لگتی۔ کیونکہ ضامن بھائی کا ذکر تو میں نے شاید پہلے بھی تمہارے سامنے کیا ہے، جب تو تم نے نہیں بتایا کہ تم انہیں جانتی ہو۔ اب کہاں مل گئے وہ تمہیں۔'' آج اقصیٰ اسے بخشنے کے موڈ میں نہ تھی۔ قسمت سے تو ہاتھ چڑھتی تھی۔
''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ قبرستان سے باہر کچھ لڑکے میری گاڑی لے گئے اور ایک صاحب نے۔''
''اچھا تو یہ وہ ہیرو ہیں جنہوں نے عین موقع پہ تمہاری مدد کی۔'' کہانی کے سرے کچھ کچھ ملتے نظر آئے اقصیٰ کو۔
''ہیرو ویرو کوئی نہیں۔ البتہ یہ وہی جناب ہیں۔'' اس نے اقصیٰ کو گھورتے ہوئے کہا۔ البتہ دل کی کایا پلٹ اس کے اپنے سامنے تھی۔ کہاں تو وہ اس حوالے سے کسی کے نام سے، کسی کے ذکر سے بھی چڑتی تھی اور کہاں ضامن مصطفیٰ کے حوالے سے اسے کچھ برا نہ لگ رہا تھا۔
''تو ہیرو بنا لو ناں میری سکھی سہیلی۔ کیا زبردست جوڑی لگے گی تمہاری اور ضامن۔''
''چائے کے ساتھ اور کیا لو گی؟'' وہ جلدی سے اٹھنے لگی۔ ابھی تو اپنی قلبی تبدیلیوں کو خود سمجھ نہ پا رہی تھی۔ اس شخص کی ذات سے متعلق ذکر من بھاتا ضرور تھا پر وہ گھبرا بھی رہی تھی۔
''بیٹھو یہاں۔ چائے وائے بھی ہوتی رہے گی۔'' اقصیٰ نے اس کا بازو کھینچ کر پھر بٹھالیا۔ ''جہاں ایسا ذکر چھڑے تم بھاگ کھڑی ہوتی ہو۔ خولہ ایمان سے بوڑھی ہو رہی ہو۔ شرم کرو ذرا۔ میرے تین بچے ہو گئے۔ اب تو شادی کر لو۔''
''میری شادی تمہارے بچوں کی تعداد سے مشروط ہر گز نہیں تھی۔''
''چلو میرے بچوں کی تعداد نہ دیکھو۔ اپنی عمر دیکھ لو۔ بتیس کی ہونے والی ہو۔''
''پیاری دوست! بتیس کی ہونا کوئی ایسی بھی قابل مذمت بات نہیں۔ مگر تم اور ماما تو لگتا ہے میری عمر کا ایک ایک دن انگلیوں پہ گننے لگے ہو۔'' وہ ایج کانشس کبھی نہ رہی تھی اس لیے اثر نہ ہوا۔
''ہاں تو کیا کریں، ہم دونوں کو تمہاری فکر ہے

ناں۔"

"فکر ہے تو زنجیریں پہنانے کی جلدی کیوں پڑی رہتی ہے؟"

"تم شادی کو زنجیر کہہ رہی ہو۔لڑکی شادی کرلو تو جانو۔کسی کا اپنا ہو جانے اور خود کسی کا ہو جانے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔کسی کے نام پہ جینے مرنے کا سرور کیا ہے۔اپنا گھر،اپنا شوہر اپنے بچے۔اس کائنات کا تو حسن ہی نرالا ہے۔بہت خاص ہونے کا احساس،محبت، رنگ،خوشیاں،احساس ملکیت۔کیا کچھ نہیں ہوتا آپ کے پاس۔" وہ شادی شدہ زندگی کی رعنائیاں بیان کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

خولہ ہنستی رہی۔اس موضوع پہ تو اقصیٰ بلا تکان بول سکتی تھی۔

"خولہ!چائے۔" اقصیٰ کی زبان کے آگے بریک صاحبہ نے کمرے میں داخل ہو کر لگائے۔ابھی اس نے چائے کا گھونٹ بھرا ہی تھا کہ تیمور کی کال آگئی۔

"مگر تیمور ابھی تو میں۔پہلے کیوں نہیں بتایا۔اتنی جلدی کیسے۔آپ بھی ناں۔اچھا ٹھیک ہے۔" آخر میں اس نے جھنجلا کر موبائل کان سے ہٹایا۔

"مجھے جلدی جانا ہوگا۔" جلدی جلدی گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔

"ابھی تو آئی ہو۔ماما آنے والی ہیں۔ان سے مل کر جانا۔"

"ان سے اور بابا سے پھر ملنے آؤں گی۔ابھی جانا ہوگا۔تیمور صاحب نے کسی کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے اور اطلاع اب دی، جا رہی ہے۔" موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا اس کا۔

"تو کُک ہے ناں۔"

"کُک کے ساتھ بھی تو خود سر کھپانا پڑے گا۔پھر بچوں کو ابھی ہوم ورک بھی کروانا ہے کوئی نیا ٹیوٹر ہی نہیں مل رہا۔کوئی ایک جھنجھٹ تھوڑی ہے۔شادی کر کے تو گھن چکر ہی بن جاتا ہے بندہ۔گھر،شوہر،بچے،سسرال۔"

خولہ زور سے ہنس پڑی تو وہ اسے گھورنے لگی۔

"ہنس لو۔ہنس لو۔شادی ہوگی تو لگ پتا جائے گا۔اپنی ذات کے لیے تو وقت بچتا ہی نہیں عورت کے پاس۔"

"شوہر،بچے،محبت،جنت۔۔۔کچھ ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں ناں کچھ دیر پہلے آپ۔جب شادی شدہ زندگی کی تعریفوں میں یوں رطب اللسان تھیں محترمہ جیسے اس ٹاپک پہ بولنے کے لیے کسی ٹاک شو میں بیٹھیں ہوں۔" خولہ نے خوب چڑایا۔

"کیا کریں یار!" اقصیٰ نے ٹھنڈی سانس بھری۔"شادی لڈو موتی چور کا،جو کھائے پچھتائے جو نہ کھائے پچھتائے۔"

وہ پھر ہنس دی۔

☆☆☆

خولہ بنت زید کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ضامن مصطفیٰ نے ایک نگاہ اس چھوٹی قبر پر ڈالی جو آج بھی موتیا کی کچھ تازہ اور کچھ مرجھائی ہوئی کلیوں کے ساتھ ڈھکی ہوئی تھی۔ان کی نظر لوٹ کر خولہ کی طرف آئی جو ان کی ماں کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوسری جانب آکر رک گئے۔

خولہ ہاتھ اٹھائے بند آنکھوں کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی۔انہوں نے غور سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھا۔انہیں یقین تھا کہ ان لبوں سے ادا ہونے والا ہر لفظ ان کی ماں،ان کی پیاری ماں کے لیے دعا بن کر عرش تک جا رہا ہے۔

دھند چھٹ گئی۔رستہ واضح ہو گیا۔

فیصلہ۔فیصلہ پل بھر میں ہو گیا۔

انہوں نے اطمینان اور آسودگی کے ساتھ ہاتھ اٹھائے اور اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیے۔

دور اپنے کام میں مگن گورکن نے یہ منظر دیکھا اور پھر اس قبر کی طرف متوجہ ہو گیا جسے کھودنے کا کام اسے آج صبح ہی ملا تھا۔

☆☆☆

سفید اور گلابی پھول ہوا کا جھونکا آتے ہی جھوم جھوم جاتے جن سے اسے بہت پیار تھا۔ اس بیل کا اپنے ٹیرس تک پہنچنے کا اس نے بہت بے تابی کے ساتھ انتظار کیا تھا۔ جس کے پھول رات میں کھلتے تو سفید ہوتے اور صبح سورج کی بے باک نگاہیں انہیں بالکل گلابی کر دیتیں۔

وہ روزانہ کتنی ہی دیر انہیں دیکھتی رہتی۔ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں تھام کر نرمی سے ان پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے ان کی مہک اپنے اندر اتارتی۔

آج بھی وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں ریلنگ پہ کہنیاں ٹکائے انہی پھولوں پہ نگاہیں جمائے کھڑی تھی مگر اس کا دھیان ان کی طرف نہ تھا۔ دھیان کا پنچھی تو شام ضامن مصطفیٰ کے آنے سے لے کر رات ماما کی گفتگو تک کے گرد ہی اڑانیں بھر رہا تھا۔

آج شام ضامن مصطفیٰ، اقصیٰ اور تیمور کے ساتھ آئے تھے اور ماما بابا سے اس کا ہاتھ مانگا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے لیکن ایسا انہوں نے صرف اقصیٰ اور تیمور کا لحاظ کرتے ہوئے کہا ورنہ وہ اسی وقت منع کر دیتے۔

"کیوں؟" ماما نے جب اسے بتایا تو ایک دم اس کے منہ سے نکلا تھا۔

مما نے کتنی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماما حیران کیوں ہوئی تھیں۔ اب تک آئے اپنے ہر رشتے کے لیے اس کے منہ سے یہ نکلتا تھا۔

"ماما! پلیز آپ انہیں منع کر دیں۔"

آج اس بدلاؤ پہ انہیں حیرت تو ہونی تھی ناں۔

"خولہ! رشتہ ایسے مانگا [illegible] ماں ساتھ نہ ہی باپ۔ اور تو۔"

"ان کی والدہ حیات نہیں ہیں ماما۔" اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

"باپ تو حیات ہے ناں۔"

"وہ ان سے شاید کچھ ناراض ہیں۔" ضامن مصطفیٰ اور ان کے والد کے بیچ سرد تعلقات کے بارے میں وہ اندازہ بھی رکھتی تھی پھر کچھ اسے اقصیٰ سے معلوم ہوا تھا۔

"ایسی بھی کیا ناراضگی خولہ! جو اس موقع پر بھی دور نہ ہو سکے۔ جو شخص اتنے اہم معاملے میں اتنے حقیقی اور قریبی رشتوں کے ہونے نہ ہونے کی پرواہ نہیں کر رہا وہ بیوی کو کیا حیثیت کیا مقام دے گا۔ ویسے بھی یہ وڈیرے، یہ جاگیردار۔ بڑے ڈرامے آتے ہیں انہیں۔ میں تمہیں جانتی کیا۔ گاؤں میں ان پڑھ خاندانی بیوی، شہر میں پڑھی لکھی خوبصورت ہمسفر۔"

اس کے بعد ماما نے جاگیرداروں، وڈیروں، رئیس زادوں کی عیاشیوں، ہرجائی پن، گھٹے ماحول، تنگ نظری، ظلم و ستم کے بارے میں جو جو کہانیاں پڑھ سن رکھی تھیں، جو جو ڈرامے فلمیں دیکھ رکھے تھے، جس جس حقیقی کردار سے اپنی زندگی میں بھی مل چکی تھیں، سب کا لب لباب اور تجزیہ اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

"ولیکن ماما! ضامن مصطفیٰ ایسے نہیں ہیں۔" سب کچھ سن لینے کے بعد اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو ماما مشکوک ہوئیں۔

"خولہ! کیا تم ضامن مصطفیٰ کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"انہیں کوئی بھی بندہ ناپسند نہیں کر سکتا ہے ماما۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہنے کی کوشش کی مگر ماما سے نظر چرا کر بات کرنا ان کے اندازے پہ مہر ثابت ہوا۔

"میں کسی بھی بندے کی بات نہیں کر رہی، تم سے پوچھ رہی ہوں، کیا تمہاری ضامن مصطفیٰ کے ساتھ انوالومنٹ ہے؟" ماما نے ڈائریکٹ ہو کر پوچھا۔

"نن۔ نہیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ چاند اس کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس نے

چاند میں چرخے والی نانی اور پریاں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہاں تو کسی اور کی شبیہہ تھی۔

اس نے نظریں ہٹالیں اور سفید و گلابی پھولوں کو دیکھنے لگی۔

اس نے ماما سے کہہ دیا تھا کہ ضامن مصطفیٰ کے لیے اس کے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں۔ کیا واقعی ایسا تھا؟

اس کے دل نے نفی کی۔

کل جب وہ ایک طالبہ تھی اور آج جب وہ ایک کامیاب وکیل ہے۔ اس دوران کتنے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔ کتنے لوگوں نے اس کے ساتھ کی چاہ کی۔ مگر یوں اس طرح دسمبر کی سرد رات کا ایک پہر بظاہر چاند اور پھول تکتے ہوئے مگر دھیانوں اور خیالوں میں کسی اور کو سوچتے ہوئے کبھی نہ بتایا تھا۔

شاید وہ بھی ایسی تھی یا ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اس کا زندگی بھر کا ساتھی ایسا ہو جس کی شخصیت اس سے زیادہ قد آور ہو، مضبوط ہو، حاوی ہو۔ جس کا ساتھ جس کا حصار اسے تحفظ کا احساس دلائے۔ جس کی پناہوں میں وہ ہر فکر بھلا دے۔ جبکہ اس کی طرف بڑھنے والے کچھ ایسے رہے جن کی شخصیت اس مضبوط، منفرد اور کامیاب لڑکی کے سامنے دب سی جاتی۔ اگر کوئی اس کا مقابل آیا یا اس سے بڑھ کر ہوا بھی تو بھی اس کے دل نے کچھ ایسا محسوس نہ کیا جو وہ ضامن مصطفیٰ کے لیے محسوس کر رہی تھی۔

ہاں۔۔۔ ضامن مصطفیٰ ایسا شخص تھا جس کی بارعب، پروقار ذات خولہ بنت زید جیسی لڑکی کے لیے بھی ہیرو ٹنگ تھی۔

ہاں۔ ضامن مصطفیٰ ایسا نقب زن تھا جس نے خولہ بنت زید کے خوابوں، اس کے خیالوں، اس کے دل تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

خولہ بنت زید اقرار کرے نہ کرے۔ دسمبر کی اس سرد رات نے، رات کے اس دوسرے پہر نے، فلک پہ چھب دکھلاتے چاند نے ان سفید اور گلابی پھولوں نے یہ راز پالیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح جو خولہ گھر سے نکلی تو بھول ہی چکی تھی کہ دسمبر چل رہا ہے۔ اور ابھی جب وہ اپنے اور ماما کے چند سوٹ لے کر آؤٹ لیٹ سے باہر آئی تو ٹھٹھر کر رہ گئی۔ موسم نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا اور اب بارش کے قطرے دھرتی کے قدم چومنے تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ سردی شدید ہوگئی تھی۔ اس نے ٹوکن دے کر اپنا کالا کوٹ اٹھایا اور جلدی سے وہی پہن کر کام چلایا۔ پھر فائل اور باقی شاپنگ بیگز اٹھا کر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ایک خالی ٹیکسی نظر آتے ہی اس کی طرف بڑھی۔

"باجی یہ موبائل کور لے لیں۔" ایک نوعمر لڑکا اس کے رستے میں آیا۔ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

"باجی! میرا باپ معذور ہے۔ چھوٹے بھائی کے داخلے کی فیس جمع کروانی ہے" وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ وہ رک گئی اور غور سے اس کی صورت دیکھی۔ اس نے دنیا بھر کی مسکینیت اپنے چہرے پہ سجا لی۔ "اللہ قسم باجی! بھائی کی فیس جمع کروانی ہے، کل آخری تاریخ ہے۔"

اور باجی نے پچاس روپے کا موبائل کور دو سو روپے میں خرید لیا جو دو سو روپے کا بھی نہ تھا۔

"جوتے لگانے چاہئیں ایسے ڈرامے بازوں کو۔"

وہ ٹیکسی تو نکل چکی تھی۔ اس نے دوسری کی تلاش میں دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ چہرے پہ غازہ اور ہونٹوں پہ آتشی گلابی لپ اسٹک کی تہیں جمائے نیلے اور آتشی گلابی پرنٹڈ سوٹ میں ایک خواجہ سرا اس کے سامنے آگیا۔

"صدقے جاؤں۔ کیسی سوہنی صورت دی ہے میرے رب نے۔ بالکل کرینہ کپور جیسی۔ اس صورت کے صدقے کچھ دیتی جا۔"

سامنے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ اب وہ اس کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتی تھی اور خواجہ سرا تھا کہ پیچھا

چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا تو اس نے پرس میں جلدی سے ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"دس روپے۔ بہن میری دس روپے کا کیا آتا ہے آج کل۔" اس نے نہ نوٹ تھاما اور نہ ہی اس کا پیچھا چھوڑا تھا۔ "کاجول کی آنکھوں والی۔ یہ موبائل کو ہی دیتی جا۔ تیرے کس کام کا۔ تیرے ہاتھ میں تو سیٹ ہی ودھرا ہے۔"

اسے لگا تمام بالی وڈ ہیروئنز کا صدقہ آج اسے ہی اتارنا ہے۔ موبائل کو راسے دیا اور جلدی سے ٹیکسی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر بارش نے آج ان کی مانگ خوب بڑھا دی تھی۔ اس کے پہنچنے تک اس میں کوئی اور سوار ہو چکا تھا۔ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے چھجے کے نیچے کھڑی ہو کر کسی اور ٹیکسی کی راہ دیکھنے لگی۔

"خولہ!"

کسی نے اس کے سامنے آتے ہوئے اس کا نام لیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

جس شخص کو پہروں سوچا ہو۔ جس کے لیے پہلی بار اپنی نیندیں حرام کی ہوں، جو خوابوں میں آنے کی جسارت کر چکا ہو۔ اسے اچانک یوں سامنے دیکھ کر دل کن کیفیات سے گزرتا ہے، وہ خوب آشنا ہوئی تھی اس سے۔

"آیئے! میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔" ضامن مصطفیٰ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے تو رسمی انکار کا موقع بھی نہ دیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے آگئی۔

"آج آپ کی گاڑی کس کی مہمان ہے؟" انہوں نے اس کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تو وہ بجھ کر مسکرا دی۔

"ایسی بات نہیں۔ میری پھوپھو کو لینے گئی ہے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"چلیں پھر خیر ہے۔" وہ گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف آئے۔ جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے سات رنگوں کے لباس میں ایک اور خواجہ سرا خولہ کی طرف آ کھڑا ہوا۔

"میڈم! پور پیپل کی ہیلپ کرنا بڑی گریٹ جاب ہے۔ جب سے ونٹر سیزن اسٹارٹ ہوا ہے مجھے کف اینڈ فلو ہے اور میڈیسن۔" اس کی کہانی سنتے ہوئے خولہ نے کلچ میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جھوٹ بولتے تھے یا سچ، یہ سوچے بغیر وہ انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیا کرتی تھی۔

"میڈم پلیز۔ سر پلیز ہیلپ می۔ گاڈ آپ کا مون اینڈ سن جیسا کپل قار ایور ہیپی رکھے۔"

خولہ نے جھینپ کر والٹ وہیں رکھا اور ہاتھ پرس سے باہر نکال لیا۔ اس کے چہرے پہ سرخی دوڑی جیسے کسی نے مٹھی بھر گلال لگا دیا ہو۔ ضامن نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر دعا گو کی طرف بڑھایا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

بارش کے چند قطرے اس کے بالوں میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور چند بوندیں اس کے صبیح چہرے پہ آ ٹھہری تھیں۔ جس میں اب سرخیاں بھی گھل گئی تھیں۔ ضامن مصطفیٰ کے لیے اس گل و شبنم چہرے سے نگاہیں ہٹانا امتحان بن گیا۔

"پور پیپل کی ہیلپ کر کے آپ نے بڑی گریٹ جاب پرفارم کی ہے۔" اس شخص کی نگاہوں کی تاب لانا کوئی آسان بات کہاں تھی۔ اور ایسی خاموشیاں جو اپنے اندر ہزار ہا معانی رکھتی ہوں، ان سے باہر نکلنے کے لیے اسے باقاعدہ ایک جملہ ڈھونڈنا پڑا۔

ضامن ہلکا سا ہنستے ہوئے سیدھے ہوئے اور گاڑی بہادر آباد کی سڑکوں پہ دوڑانے لگے۔

خواجہ سرا کی وہ دعا خولہ کے ذہن سے نکل نہ رہی تھی۔ مسکراہٹ تھی کہ لبوں پہ بکھر بکھر جا رہی تھی۔ دل تھا کہ دھک دھک کی آواز ایسی کہ اسے لگ رہا تھا ضامن مصطفیٰ کو بھی سنائی دے رہی ہو گی۔ اس دل اس مسکراہٹ نے اسے پہلے تو یوں خوار نہ کیا تھا کبھی۔

"میرا ایک کیس چل رہا تھا آپ کی عدالت میں۔ پوچھ سکتا ہوں، فیصلہ کیا ہوا۔" کچھ دیر بعد ضامن اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وہ جوانی کیفیات عیاں ہونے کے ڈر سے مسلسل کھڑکی کی طرف چہرہ کیے بیٹھی تھی، سیدھی ہوئی۔

"کون سا کیس؟"

"وہی۔ جس میں آپ کو پروموشن دے دی گئی ہے۔ وکیل آپ ہیں، جیوری آپ ہیں، جج بھی آپ ہیں۔" ان کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"اوہ۔" وہ سمجھ گئی اور چپ ہو کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھنے لگی۔

"خولہ! آپ نے جواب نہیں دیا۔" ضامن نے اس پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"اس کیس کی جج میں نہیں، ماما اور بابا ہیں۔" حقیقت تو یہ تھی کہ ضامن مصطفیٰ کی موجودگی میں ماما اور بابا کے خیالات اور ارادے تو اسے یاد ہی نہ تھے۔ اب جو یاد آئے تو نامعلوم سی اداسی نے اس کی ذات کا گھیراؤ کیا۔

"اچھا تو ان کا فیصلہ کیا ہے؟"

"وہ مطمئن نہیں ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"وجہ جان سکتا ہوں؟"

"ان کا خیال ہے کہ آپ کو اپنے والد اور فیملی کو اس سلسلہ میں شامل رکھنا چاہیے۔"

"اور آپ۔ کیا آپ کے لیے میری ذات کافی نہیں۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔" ان کا ہاتھ ڈیش بورڈ پہ رکھے سگریٹ کیس کی طرف گیا لیکن پھر انہوں نے اسے اٹھا کر واپس وہیں رکھ دیا۔

"ماما، بابا، صرف آپ کو دیکھ کر تو کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے ناں۔"

"خولہ! کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں؟" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ والدین کے لیے۔"

"خولہ! کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں؟" گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ انہوں نے دایاں بازو اسٹیئرنگ پہ ٹکاتے ہوئے اس کی طرف رخ کیا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک دفعہ پھر وہی سوال کیا۔

"مجھے آپ پر یقین ہے مگر بابا۔"

"بس۔ مجھے یہ ہی جاننا تھا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے آگے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ اور سیدھے ہو کر گاڑی چلا دی۔

باقی تمام رستہ وہ بالکل خاموش رہے۔ نچلا لب کچلتے ہوئے خولہ کی نظر بار بار ان کے چہرے پہ جا ٹھہرتی۔ اسے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ تب بھی تو وہ یونہی ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اسے عجیب گھبراہٹ سی ہونے لگی تو موبائل اٹھا کر بے مقصد کبھی فیس بک کھولی، کبھی واٹس ایپ تو کبھی گیلری۔ ضامن کا موبائل دو دفعہ بج بج کر چپ ہو گیا۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی تو اس نے موبائل کی اسکرین آف کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"تھینکس۔ ویسے آپ سے اتنی بار لفٹ لی ہے کہ اب تو یہ گاڑی مجھے اپنی ہی لگنے لگی ہے۔" اتنے گھمبیر اور سنجیدہ ماحول میں وہ اس ملاقات کا خاتمہ نہ چاہتی تھی اس لیے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"گاڑی کیا۔ گاڑی کے مالک کے مالکانہ حقوق بھی آپ کے نام کرنے کو تیار ہیں۔ حکم تو ہو۔" لہجے اور چہرے پہ سنجیدگی ویسی کی ویسی تھی مگر آنکھوں میں نرمی ایک طائر کی طرح اڑتی ہوئی آئی اور پر کھول کر بیٹھ گئی۔

خولہ کے لیے کچھ بھی کہنا، اس شخص کی طرف مزید دیکھنا محال ہوا۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر آئی۔

یہ شخص ضامن مصطفیٰ۔ واقعی جادوگر ہے۔ جب چاہے منتر پڑھ کر سامنے والے کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئے اور جب چاہے لبوں پہ چپ کا قفل یوں لگا دے کہ لفظ زبان پہ مچل مچل کر دم دے دیں۔ جب چاہے دل دھڑکنے کی رفتار گھٹا دے جب چاہے

پھونک مار کر بڑھا دے۔

خولہ بنت زید کو اپنا آپ ہارتا محسوس ہو رہا تھا مگر یہ شکست کیسی شکست تھی کہ جیت کا سا سرور تھا۔

☆☆☆

اور پھر یہ چند دن بعد ہی کی بات تھی۔

خولہ کورٹ میں تھی جب ماما کا فون آیا۔ انہوں نے ضامن مصطفیٰ کے والدین کے آنے کی اطلاع دے کر اسے جلدی گھر پہنچنے کی تاکید کی۔

ماما سے بات کرتے ہوئے، گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ڈرائیونگ کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ ایک یہ دل تھا جس نے کسی شرارتی بچے کی طرح اچھل کود مچا رکھی تھی۔ اتنی بوکھلاہٹ میں بھی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے بھی اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

ضامن مصطفیٰ نے اسے پل پل نئے اور انوکھے احساسات سے متعارف کروایا تھا۔ اس وقت بھی جب ضامن مصطفیٰ کی اپنے والد اور خاندان سے متعلق چپ اور ان کے آپس کے تناؤ نے اسے عجیب خدشات میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ خود اعتمادی جو اس کی ذات کا حصہ تھی، اس میں یہ سوچ کر کمی سی آتی جا رہی تھی کہ کوئی اس کے لیے ہر بازی کھیل سکتا ہے۔ کوئی اس کے لیے اپنی انا کو پس پشت ڈال کر جن رشتوں سے خفا ہے، ان کے پاس جا سکتا ہے۔ آج وہ ڈر ختم ہو گیا۔ اس کو اہم ہونے کا احساس دلا کر اس کی خود اعتمادی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ سجائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول ہرگز بھی اتنا خوش گوار نہیں تھا جتنا اس کے گمان میں تھا۔ بابا کے ماتھے پہ سلوٹیں تھیں۔ ماما بوکھلائی ہوئی سی تھیں۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پہ براجمان خاتون کی زبان کے آگے فل اسٹاپ آیا اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لے ڈالا۔ ان کے علاوہ ایک عدد خاتون اور ایک لڑکی بھی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خاتون ضامن مصطفیٰ کے والد کی منجھلی بیگم اور لڑکی ان کی بیٹی ہے۔ بابا کے ساتھ بیٹھے سوبر سی شخصیت کے مالک مصطفیٰ امین تھے جو کہ ضامن مصطفیٰ کے والد تھے اور ان سے خاصی مشابہت رکھتے تھے۔

"اچھا تو تم وہ لڑکی ہو جس کے لیے بیٹے نے باپ کو اتنے سالوں بعد منہ لگایا۔ ورنہ تو سوچ لیا تھا ہم نے کہ کندھا دینے بھی نہیں آئے گا۔" سونے چاندی کے زیورات میں لپٹی جاہلیت بول رہی تھی۔

خولہ نے گڑبڑا کر بابا کی طرف دیکھا جن کے ماتھے کے بلوں میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

"یہ تو آپ لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور بہترین اطوار ہیں کہ آپ نے ایک فرد سے رشتہ قائم کرنے کے بجائے اس سے جڑے باقی رشتوں کو بھی اہمیت دی۔" مصطفیٰ امین نے اپنی چھوٹی بیگم صاحبہ کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔ اور پھر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے زوجہ عالیہ کے ادا کیے گئے شیریں کلمات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

مصطفیٰ امین کی منجھلی بیگم نہایت سادہ سی خاتون تھیں۔ کچھ وہ ان کی زبان بھی صحیح طرح سے نہیں سمجھ پا رہی تھیں اس لیے زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔ جبکہ بیٹی مرک جو کہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی، خاصی خوش اخلاق اور سلجھی طبیعت کی مالک تھی۔

ان تینوں کو سامنے رکھتے ہوئے چھوٹی بیگم صاحبہ کی حرکات و سکنات اور الفاظ کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ایسے دو ایک نادر نمونے اس کے اپنے خاندان میں بھی موجود تھے جنہیں اپنے سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ مصطفیٰ امین اگر ایک سے زیادہ بیگمات رکھتے بھی تھے تو انہیں تمغے کی طرح یہاں سجا کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی اس غلطی کا احساس انہیں خود بھی خوب ہو رہا تھا۔

جب ہی تو انہوں نے بھڑکیلے لباس میں سجی اپنی اس خوبصورت اور کم عمر بیگم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں

یوں تنبیہہ کی تھی کہ وہ پہلو پہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ پھر بھی رخصت ہونے تک وہ ایک اور گڑ بڑیہ جتا کر کر چکی تھیں کہ ضامن مصطفیٰ کے خاندان سے باہر شادی کرنے کی صورت میں اس کی ایک دو بہنیں کنواری بیٹھی رہ جائیں گی۔ کیونکہ ان کے ہاں بیٹیوں کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوتی اور خاندان میں ادلے بدلے کی شادی کا رواج ہے۔ وہ خود بھی مصطفیٰ امین کی ایک بیٹی کے بدلے میں آئی ہیں۔

بابا نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت مختصر سا جواب دیا تھا کہ "ہم سوچ کر جواب دیں گے۔"

خولہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

ضامن مصطفیٰ کے والدین کا نہ آنا ان کے آنے سے زیادہ بہتر تھا۔ چھوٹی بیگم تو بابا کے سارے خدشات کو ہوا دے کر جا رہی تھی۔

مصطفیٰ امین نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تم میرے لیے بخت آور ہو کہ ابھی میرے بیٹے کی زندگی میں آئی ہو اور تمہارے لیے میرا بیٹا اٹھائیس برس بعد اپنے گھر میں داخل تو ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے بات تو کی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم اس کی زندگی میں باقاعدہ شامل ہو جاؤ گی تو باپ بیٹے کے بیچ کی ہر دوری مٹا دو گی۔"

اس مان پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دل نے چپکے سے "ان شاء اللہ" کہا۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی بابا پلٹے اور اندر چلے گئے۔ وہ ان کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ماما کی طرف دیکھا۔

"خولہ! یہ کس شخص کو چنا ہے تم نے بیٹا۔" ماما جیسے بہت بے بس سا ہو کر بولیں۔

"اگر چنتی تو سوچتی ماما۔ پر میں نے چنا نہیں پسند کیا ہے۔ اور پسند کرنے کا عمل سوچ سمجھ کر نہیں ہوتا۔ جہاں تک بات چننے اور نہ چننے کی ہے، اس کا حق آپ کو اور بابا کو ہے۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول ہوگا۔"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ بات محض پسندیدگی تک نہیں رہی۔ اس کا دل بہت آگے کی راہ پہ قدم رکھ چکا تھا۔ جب ہی تو اس نے بے اختیار دعا مانگی تھی۔

"اے میرے رب! میرے ماما بابا وہ فیصلہ کریں جو واقعی مجھے دل و جان سے قبول ہو۔"

☆☆☆

پروفیسر زید الصار کے چھوٹے سے پیارے سے گھر پہ بھی رات اتر چکی تھی۔ ٹی وی بند ہو گیا تھا، بتیاں بجھ چکی تھیں سوائے چند ایک کے۔ خولہ اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پہ ایک فائل کھولے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاحب کچن کاؤنٹر چیئر پہ بیٹھے زوجہ کے متفکر چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی ہر فکر آج کل بیٹی کی شادی تھی۔ پہلے بیٹی مانتی نہیں تھی اور ضامن مصطفیٰ کا رشتہ آنے کے بعد جو رضامند نظر آتی تھی تو باپ راضی نہ لگتا تھا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں ثروت! جو عورتیں اسی گھٹن زدہ ماحول میں پیدا ہو کر، اسی میں پل کر، بیاہ کر، اسی میں زندگی گزار دیتی ہیں، ان کے لیے اس سے باہر تو کوئی دنیا ہوتی نہیں۔ اس لیے ان کے گزارے ہو جاتے ہیں۔ مگر خولہ جس روشن ماحول میں پلی بڑھی ہے وہ تو۔"

"مگر اسے وہاں تھوڑی رہنا ہے۔" ثروت نے چائے کا مگ تیار کر کے پروفیسر زید الصار کی طرف بڑھاتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

خدشات ان کے بھی کم نہ تھے مگر بیٹی کے دل کی تمنا انہیں آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

عنبرین ابدال



"تم نے سنا سمیرا کی بہو کتنا سامان لے کر آئی ہے۔ ارے گھر بھر گیا ان کا تو سامان رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ بڑی ہی منتیں کر کے مجھ سے ایک کمرہ خالی کروایا ہے۔ کچھ سامان رکھنے کے لیے اور ساتھ ہی — راحیلہ کی منتیں کر کے ایک کمرہ لیا۔ ارے اب مہمانوں کو سونے اور رکھنے کی جگہ کا انتظام کیا جائے یا پھر سامان کا انتظام کیا جائے۔

لیکن ایک بات تو ہے سمیرا کی بہو جہیز بہت لائی ہے۔" سمیہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔ یا آہ۔ پاس بیٹھی ان کی دونوں بہویں کہاں سمجھ پائی تھیں۔ وہ دونوں تو بس ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر نظریں چرا کر اپنے اپنے کاموں کو نپٹانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔

"حق ہا۔ یہ اعزاز بھی کسی کسی کے حصے میں آتا ہے۔ ہماری تو دونوں بہورانیاں بس ایک کمرے کا سامان اٹھائے وارد ہوئی تھیں۔ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ چار لوگ، چار دن بھی ہمیں حسرت سے دیکھ لیتے۔"

سمیہ بیگم نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سر کو جھٹک کر ٹی وی پہ چلتے اپنے پسندیدہ ڈرامے کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

سحر بیاہ کر سمیرا بیگم کے گھر آئی تو کتنے ہی دن محلے کے ہر گھر میں، اس کے جہیز کے سامان کی دھوم مچی رہی تھی۔ لیکن پھر فقط دو ماہ کے بعد ہی سمیرا بیگم اور ان کے گھر والے سحر کے جہیز کے سامان سے تنگ آ چکے تھے۔ سامان رکھنے کی جگہ کم تھی، محلے کے دو گھروں میں جو سامان رکھوایا گیا تھا۔ وہ انہوں نے واپس کر دیا تھا۔

کل شام سے آسمان پہ — بادلوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ سحر کی تو جیسے جان پہ بن آئی تھی۔ اس کے جہیز کا صوفہ اور ٹیبل باہر صحن میں رکھے ہوئے تھے۔

"عامر! کچھ کرو۔ میرا سامان خراب ہو جائے گا۔" سحر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"اچھا تم روؤ نہیں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" عامر اپنی نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں آنسو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

"اچھا میں ایسا کرتا ہوں برآمدے میں پڑے امی کے صوفوں کو سائیڈ پہ کرتا ہوں۔ اور ان چیزوں کو ان کی جگہ پہ رکھ دیتا ہوں۔"

عامر نے کہہ کر سحر کے ساتھ مل کر اپنی ماں کے صوفے کو ہٹایا ہی تھا کہ کمرے سے نکلتی سمیرا بیگم کو جیسے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"یہ تم دونوں کیا کر رہے ہو؟"

کمر پہ ایک ہاتھ ٹکائے سمیرا بیگم نے قدرے غصے بھری نظروں سے بیٹے اور بہو کو دیکھا تھا۔

"امی! بارش ہونے والی ہے نا تو سحر پریشان ہو رہی تھی۔"

ابھی عامر کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ سمیرا بیگم اکڑے ہوئے انداز میں آگے بڑھیں۔

"ہاں تو بارش ہونے والی ہے تو کیا تم میرے لتاں ابا کی دی ہوئی چیزوں کو باہر صحن میں رکھ دو گے۔ اور اپنی چہیتی کا سامان یہاں رکھو گے۔"

سمیرا بیگم غصے سے کہتے ہوئے اب بہو کو گھور رہی تھیں۔

"ہاں تو میرا سامان بھی تو میرے لئاں ابا نے ہی دیا ہے، اسے برباد کروالوں۔ آپ کا سامان تو پھر برسوں پرانا ہے۔ میرا سامان تو۔"

"دیکھو بی بی! یہ اپنے سامان کا رعب کم سے کم مجھ پر تو جھاڑو نہیں۔ میں تمہاری کسی بات میں نہیں آنے والی۔ چلو عامر! میرے صوفوں کو واپس ان کی جگہ پہ رکھو۔"

سمیرا بیگم نے تحکم بھرے لہجے میں کہا۔ جواب میں سحر اونچی آواز میں بولنے لگی۔ اندر اپنے کمرے میں پڑھتی صوفیہ، جلدی سے کتاب بند کرکے باہر کی سمت بھاگی اور مشکل سے ماں اور بھابھی کو چپ کروایا۔

"لڑائی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ کچھ حل نکالنے کے بجائے آپ دونوں ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔" "امی! ایسا کرتے ہیں یہ والے صوفے ہم اپنے کمرے میں رکھ لیتے ہیں۔ بیڈ کو دیوار کی سمت کھسکا دیں گے تو جگہ بن ہی جائے گی۔ بھابی کی ٹیبل کو یہاں رکھتے ہیں اور صوفوں کی بھابھی کے کمرے میں ہی جگہ بناتے ہیں۔" صوفیہ نے دماغ چلاتے ہوئے مسئلے کو حل کیا تھا۔

"لیکن۔" سمیرا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

"امی! ہر لڑکی کو اپنے ماں باپ کی دی ہوئی چیزیں ایسے ہی پیاری ہوتی ہیں جیسے برسوں کے بعد آپ کو اور دو ماہ پرانی بھابھی کو۔ صحیح تو کرتا ہے نا۔" صوفیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو جہاں سمیرا بیگم کا غصہ ٹھنڈا ہوا وہیں سحر کے چہرے پہ بھی شرمندگی کے تاثرات ابھرے تھے۔

"جلدی سے یہ کام نپٹا لیتے ہیں عامر بھائی! اس کے بعد ہمیں بھابھی کے ہاتھ کی ایک کپ چائے ملے گی۔ کیوں بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" صوفیہ نے سحر سے اپنی بات کی تائید چاہی۔ سحر نے جلدی سے اپنے سر کو اثبات میں ہلایا پھر صوفیہ عامر کے ساتھ مل کر سمیرا بیگم کے صوفوں کو ان کے کمرے میں منتقل کروانے لگی۔

اور یوں تھوڑی دیر کے بعد جیسے ہی بارش شروع ہوئی ان تینوں نے مل کر جیسے تیسے سامان کو سیٹ کرلیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی سحر چائے بنا کر سمیرا بیگم کے کمرے میں لے آئی تھی۔

سحر کی بہت ساری اچھی عادتوں میں ایک اچھی عادت یہ بھی کہ وہ کسی کی بات کو زیادہ دیر تک دل میں نہیں رکھا کرتی تھی۔ بلکہ شرمندہ ہوکر معذرت کرلیا کرتی تھی، اس وقت بھی یہی ہوا۔ اس نے شرمندہ ہوکر سمیرا بیگم سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ سمیرا بیگم نے بھی دل بڑا کرتے ہوئے اسے معاف کر

دیا۔ جب رہنا ایک ہی جگہ تھا تو منہ بنا کر کیوں رہا جائے۔ سمیرا بیگم نے اپنے دل میں سوچا اور چائے کا کپ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگالیا۔

☆☆☆

سمیرا بیگم نے گھر میں قرآن خوانی رکھی تھی۔ اور محلے میں موجودگی آپابی کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ آپابی سے محلے کے سب ہی بچے قرآن پاک پڑھے تھے۔ اب تو ان بچوں کے بچے بھی آپابی سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پورے محلے میں آپابی کو نہایت عزت و تکریم سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ان کا سمیرا بیگم کے گھر قرآن خوانی کے لیے آ جانا ہی ان کے لیے بڑی بات تھی۔

قرآن خوانی کے بعد کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خواتین کھانے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ چکی تھیں۔ آپابی نے بھی جانے کی اجازت طلب کی تو سمیرا بیگم کی بڑی بہو، ندا ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ "ارے بیٹا! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" آپابی نے محبت بھرے لہجے میں ندا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپا! آپ تو کبھی کبھار ہمارے گھر آتی ہیں۔ چائے پی کر بتائیں میں نے کیسی چائے بنائی ہے۔" ندا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آپابی نے جواباً مسکرا کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

اسی دوران ندا کے دونوں بچے صحن میں کرکٹ کھیلنے لگے۔ برآمدے میں موجود سحر کے جہیز کی ڈائننگ ٹیبل جیسے سحر کی جان مٹھی میں لیے تھی۔

وہ بار بار اٹھ کر کمرے سے باہر جاتی اور بچوں کو صحن میں کھیلنے سے منع کرتی۔ بچے چچی کے منع کرنے پر تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور پھر جیسے ہی سحر واپس کمرے میں آ کر بیٹھتی، وہ دونوں پھر سے کھیلنے لگتے۔ اس سے پہلے کہ ندا غصے میں اٹھ کر کمرے سے باہر جاتی اور بچوں کو کھیلنے سے منع کرتی۔ چائے پیتی آپابی بول اٹھی تھیں۔

"کھیلنا تو بچوں کی فطرت ہے۔ بچوں کو کھیل سے کیسے منع کر سکتی ہو۔" آپابی نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن آپابی! میرے جہیز کی اتنی مہنگی ٹیبل باہر رکھی ہے اور دیکھیں تو سہی۔ ٹیبل شیشے کی ہے ذرا سی بال لگی تو ٹیبل ٹوٹ جائے گی۔"

سحر روہانسی ہو کر بولی۔ ندا خاموشی سے اٹھی اور بچوں کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔

"دیکھو بیٹا!" اس سے پہلے کہ آپابی سحر سے کچھ کہتیں سمیرا بیگم درمیان میں بول پڑی تھیں۔

"ایک تو جب سے میری چھوٹی بہو کا سامان آیا ہے، گھر میں چلنا پھرنا عذاب ہو گیا ہے۔ اتنی بار سمجھایا ہے کہ بیٹا، ایسے نہیں ہوتا۔ یہ گھر صرف تمہارا ہی تو نہیں۔ ندا اور اس کے بچوں کا بھی حق ہے۔ لیکن اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آپ کو کیا پتا، میرے جہیز کا سامان کتنا مہنگا ہے اگر آپ لوگوں کے گھر رکھنے کے لیے جگہ نہیں تھی تو آپ میرے ماں باپ کو منع کر دیتے۔ میں تو خود ہر وقت اس سامان کی حفاظت سے تنگ آ گئی ہوں۔ آپابی آپ خود بتائیں، میں کیسے اپنے سامان سے غفلت برتوں۔ میرے ماں باپ نے اتنی محبت اور پیار سے مجھے یہ سامان دیا ہے۔ اب۔ یہ تو آپ لوگوں کی غلطی ہے نا کہ جب گھر میں جگہ نہیں تھی اور ٹرک بھر کے سامان لا رہے تھے اس وقت میرے ماں باپ کو منع کر دیتے۔ کہہ دیتے، بیٹی کو ضرورت کا سامان دیں بس وہی کافی ہے۔ لیکن تب تو سسرال والوں کو اپنے خاندان میں اپنی عزت کی پڑی ہوتی ہے۔ آپابی! یہ سامان نہیں میرے بابا کی خون پسینے کی کمائی ہے۔"

سحر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

سمیرا بیگم تو شرمندہ ہو کر چپکی ہو بیٹھی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا، لیکن یہاں تھوڑی سی غلطی تمہارے ماں باپ کی بھی ہے۔ انہوں نے جب گھر

یار دیکھ لیا تھا تو انہیں اتنا جہیز دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ضرورت کا سامان دینے کے بعد جو پیسے بچتے، وہ ان پیسوں سے کسی غریب بچی کی شادی کروا سکتے تھے۔لیکن بیٹا !بات وہی آجاتی ہے اگر سسرال والوں کو اپنی عزت اور نام کی فکر ہوتی ہے۔تو یہی غلطی ماں باپ بھی کرتے ہیں۔

انہیں بھی بیٹی کے سسرال میں اپنی عزت اور ناک اونچی رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔

سامان استعمال کے لیے ہوتا ہے اور خوشی کے لیے بھی۔میں جب سے آئی ہوں بس یہی دیکھے جا رہی ہوں۔تمہیں بھی اپنی ایک چیز کی فکر ہے تو بھی دوسری چیز کی۔تم نے تو شاید سکون سے بیٹھ کر قرآن پاک بھی نہیں پڑھا کہ کہیں محلے کی خواتین کے ساتھ آئے ہوئے بچے تمہاری کسی چیز کو توڑ نہ دیں۔

لیکن بیٹا! میں تمہیں ایک مشورہ دوں۔چیزوں کو حواس پہ مت سوار کرو۔شوہر اور اپنے باپ سے پوچھ کر استعمال کی چیزیں رکھنے کے بعد تمہارے پاس جو بھی زیادہ سامان بچتا ہے۔تم اس میں سے کسی غریب بچی کے جہیز کے لیے دے دو۔

دیکھو بیٹا، رشتے چیزوں سے نہیں بنتے، رشتے محبت احترام اور پیار سے بنتے ہیں۔جب سے آئی ہوں دیکھ رہی ہوں۔اپنی چیزوں کی حفاظت کی جھنجھلاہٹ میں تم نے ایک بھی کام ٹھیک اور توجہ سے نہیں کیا۔یہ چیزیں تمہیں سکون نہیں دے رہیں بلکہ بے سکون کر رہی ہیں تو بہتر ہے کسی کی مدد کر کے ان سے سکون حاصل کرو۔"

آپابی نے مسکرا کر کہا اور چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھ کر کھڑی ہوئیں۔

سمیرا بیگم آپابی کو چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئیں۔اپنے کمرے سے نکلتی ندا بھابھی بھی دروازے پر آکر کھڑی ہو گئیں۔

کمرے میں بیٹھی سحر نے ندا بھابھی کی پشت کو دیکھا۔جو اب آپابی کے جانے کے بعد کمرے سے نکلتے علی کو، واپس کمرے میں جانے کا کہہ رہی تھیں۔ علی کھیلنے کی ضد کر رہا تھا۔

ندا بھابھی کو دیکھتے ہوئے ایک خیال سحر کے ذہن میں آیا۔رات جب وہ پانی لینے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تھی تو سمیرا بیگم جو رشتے میں ندا کی خالہ بھی لگتی تھیں۔صحن میں موجود چارپائی پہ بیٹھی باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

فطری تجسس کی وجہ سے سحر دروازے کے پیچھے ہوئی وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی ساس اور جیٹھانی اس کی برائی کر رہی ہیں۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا خالہ! شزا کی شادی کی تاریخ تو دے دی ہے لیکن تیاریاں تو ابھی۔" ندا خاموش ہوئی تھی۔

"فکر نہیں کرو، اللہ سب بہتر کرے گا۔" سمیرا بیگم نے بھانجی کو تسلی دی۔

"پتا نہیں خالہ! کیا سب بہتر ہوگا۔ابو کی جب سے نوکری ختم ہوئی ہے تب سے حالات قابو میں ہی نہیں آرہے۔پھر یہ کرونا کے دنوں میں ساری جمع پونجی بھی ختم ہو گئی۔امی ابو اب دونوں ہی پریشان ہیں۔شادی کی تاریخ تو دے دی لیکن جہیز کا سامان ممکن نہیں لگ رہا۔" ندا کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔اللہ بڑا کارساز ہے۔ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" سمیرا بیگم نے تسلی دی تھی۔

رات کی بات سحر کے ذہن میں گونجی۔لمحے بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ذہن میں اپنے ایکسٹرا سامان کی لسٹ بنائی اور اٹھ کر اپنے بابا کو فون کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آگئی۔آخر سامان کے ساتھ ساتھ بیٹی کو عزت سے اپنے گھر کا کرنے کے لیے اور بھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے یقین تھا۔اس کے بابا ندا کی بہن کی شادی میں کچھ نا کچھ حصہ تو ضرور ڈالیں گے۔

سحر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کندھوں سے ان دیکھا بوجھ کم ہو گیا ہو۔

اللہ کارساز تھا۔کیسے سحر کی مشکل کو ندا کی بہن کی زندگی میں، آسانی کے روپ میں داخل کر دیا تھا۔فون اٹھا لیا گیا تھا۔

اور سحر شزا کے بارے میں بات کرنے مصروف ہو چکی تھی۔

☆☆

نمرہ احمد



مکمل ناول

اس نے وہ نوٹ جیب میں رکھ لیا اور ایک نیا نوٹ اس کی جگہ پر رکھ کے اوپر گملا رکھ دیا۔ پھر پلٹا تو دیکھا۔ پیٹریشیا اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹراؤزرز اور ہڈی میں ملبوس تھا۔ بیک پیک کندھوں پر پہن رکھا تھا۔ ہلکی بڑھی شیو اور ماتھے پر بکھرے بال۔ مسکراتے ہوئے اس نے ایک تہہ شدہ نوٹ پیٹریشیا کی طرف بڑھایا اور بنا آواز کے ہونٹ ہلائے۔

(مالا؟)

پیٹریشیا نے مسکرا کے نوٹ پکڑا اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ماہر نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا اور اس کے بتائے راستے پر چل دیا۔

مال کی رونق ہر روز کے جیسی تھی۔ خوشبوئیں۔ باتوں کی آوازیں۔ روشنیاں۔ اسے چند منٹ لگے تھے مالا کو تلاش کرنے میں۔

اور جب اسے دیکھا تو قدم ایک دم زنجیر ہو گئے۔

دائیں ہاتھ ایک راہداری اندر جا رہی تھی۔ وہ اس کے کونے میں بیٹھی تھی۔ زمین پر۔ سر گھٹنوں پر رکھے وہ رو رہی تھی۔

وہ وہیں رک گیا۔ ساکت۔

اس نے مالا کو ایسے روتے ہوئے کب دیکھا تھا؟ شاید کبھی نہیں۔ وہ ایسے بے بسی سے کبھی اس کے سامنے نہیں روئی تھی۔ وہ سر جھکائے بار بار آنسو صاف کرتی۔ وہ پھر سے ابل پڑتے۔

ایک صفائی والی خاتون اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جھک کے اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ ٹھیک ہے؟

وہ دھیرے سے پیچھے ہٹ گیا۔ قدم مخالف سمت میں اٹھنے لگے۔

"مالا نے جے پی کے پیسے دینے ہیں۔ صبح جے پی اس سے تقاضا کر رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اَپ سیٹ ہے۔" وہ اب کافی کاؤنٹر پہ کھڑا تھا اور پیٹریشیا ساتھ کھڑی دھیرے سے بتا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتے ہوئے دور فون پہ لگی جے پی کو کاٹ دار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

"کتنے پیسے ہیں؟"

پیٹریشیا نے آہستہ سے رقم بتائی۔ وہ چونکا۔

"بس؟"

پیٹریشیا کے تاثرات بدلے۔ ماتھے پر بل آئے۔

وہ جلدی سے سنبھلا۔

"میرا مطلب ہے... یہ تمام رقم ہے یا صرف ایک قسط؟"

لیکن وہ پیٹریشیا کی گڈ بکس سے نکل چکا تھا۔ وہ ناک سکوڑ کے پلٹ گئی۔ وہ مالا کے فرینڈ سے صرف ایک privileged انسان رہ گیا تھا۔ تنخواہ سے تنخواہ تک گزارا کرنے والے دوسرے انسانوں کی طرح پیٹریشیا کو بھی دنیا کے سب سے برے انسان یہ پریویلیجڈ لوگ لگتے تھے۔

وہ کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ماہر فرید کی مدد کبھی قبول نہیں کرے گی۔ ماہی کے پاس شاید یہ رقم نہ ہو۔ شاید مالا کی اَنا اس سے مانگنا گوارا نہ کرتی ہو۔ ایسے میں وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟

صرف ایک انسان تھا جس کے پاس وہ اس وقت جاتا تھا جب وہ کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔

وہ فون پہ ایک نمبر ملاتے ہوئے کافی شاپ سے دور ہٹ آیا۔

''بولو۔'' مالک فرید کی مصروف سی آواز سنائی دی۔ ''تم نے آخری دفعہ مالا کا حال کب پوچھا تھا؟'' ایک لمحے کے لیے دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''اس کے حال کو کیا ہوا؟'' وہ اسی سپاٹ انداز میں گویا ہوئے۔

''تم بتاؤ، مالک! تم اس سے رابطے میں رہتے ہو۔ میرے آفس میں بنا مجھ سے پوچھے اس سے ملتے بھی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیسی ہے۔ اسے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' مالک فرید نے ہنکارا بھرا۔

''ہوں کیا؟''

''اسے کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اور اس نے تمہاری مدد لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے مجھے فون کر رہے ہو۔'' وہ جیسے محظوظ ہوئے تھے۔

''بتاؤ، ماہر... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

وہ چند لمحے کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔ اسے مالک سے درخواست کرنی تھی۔ اور یہ سب سے مشکل کام تھا۔

''تم اس کو کال کر کے اس سے پوچھ سکتے ہو کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں۔''

ماہر فرید کے سر پہ لگی، تلووں پہ بجھی۔

''کیوں؟''

''میں بنا مانگے کسی کی مدد نہیں کرتا۔''

اس نے فون کان سے ہٹا کے بے بسی بھرے غصے سے اسے گھورا۔

''تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے کہ اس کو ایک

ستائیسویں سال



کال کرلو؟"

"نہیں۔اسے میری مدد چاہیے ہوگی تو وہ مجھے خود کال کرلے گی۔" پھر انہوں نے قدرے توقف کیا۔

"طلاق مشکل ہوتی ہے۔اس نے اپنی مشکل خود چنی ہے۔اسے اس میں سے خود نکلنے دو مجھے یا تمہیں اس کا مسیحا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم دنیا کے سب سے بے حس انسان ہو، عبدالمالک فرید۔"

"میں بے حس کے ساتھ خودغرض بھی ہوں۔ کچھ اور کہنا ہے یا میں فون رکھوں؟"

ماہر نے بیزاری سے کال خود ہی کاٹ دی۔اس انسان کو وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔

وہ واپس کافی شاپ کے کاؤنٹر کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا جب مالا اس طرف آتی دکھائی دی۔اس کا چہرہ دھلا دھلایا اور سپاٹ تھا۔ایک نظر ماہر پہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

"تمہیں کافی چاہیے؟" وہ سر جھکائے اپنی چیزیں درست کرنے لگی۔ کارڈ مشین۔ کیلکولیٹر۔ کیش کی دراز۔اس کی ناک ابھی تک سرخ تھی۔

"نو تھینکس۔میں اس کافی چین کی کافی نہیں پیتا۔"

مالا نے نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"میں بھول گئی تھی کہ تم ماہر ہو۔" آواز میں ناپسندیدگی اور طنز تھا۔

"اگر تم لوگ اصرار کرتے ہو تو پی لوں گا۔" وہ کہنیاں کاؤنٹر پر جمائے ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"میں بالکل اصرار نہیں کر رہی۔"

"جے پی سے کہو۔وہ پلائے گی تمہیں کافی۔"

پیٹریشیا اپنی سیاہ فام قوم کی طرح اونچی آواز میں بولی تھی۔مالا نے چونک کر اسے دیکھا۔وہ ناک پھلائے ایک کپ پر مارکر سے کچھ لکھ رہی تھی۔وہ مسکرا دی۔ماہر فرید اس کے ناپسندیدہ افراد کی لسٹ میں شامل ہو چکا تھا۔بہت اچھا ہوا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" مسکراہٹ دبائے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔اب وہ قدرے بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہیں کہیں لے کر چلنا ہے۔"

"میں نے چھٹی مانگی تو جے پی مجھے فائر کر کے کسی اور کو ہائر کرلے گی۔" اس کی آواز میں طنز تھا۔

"میں اس سے چھٹی مانگ چکا ہوں۔چلو۔" ابرو سے اشارہ کیا۔وہ چند لمحے بے بسی بھرے افسوس سے اسے دیکھے گئی۔وہ ایسا ہی تھا۔جب کیف جمال بن کے اس کی نوکری کرتا تھا، تب بھی اس کی بات نہیں مانتا تھا۔اپنی منواتا تھا۔

"میں نہیں جانا چاہتی۔"

لیکن ماہر نے مال کی ایگزٹ کو جاتی راہداری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

مالا نے ایپرن کی گرہ نوچنے والے انداز میں کھینچی۔یہ طے تھا کہ وہ وہاں سے نہیں ہٹے گا۔وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"بائے کشمالہ۔" وہ دونوں ایگزٹ کی طرف جانے لگے تھے جب آواز پہ ماہر چونکا۔

کافی بار کی آخری میز پہ ایک لڑکا بیٹھا تھا۔لیپ ٹاپ سامنے رکھے، کچھ ٹائپ کرتے ہوئے اس نے مسکرا کے کشمالہ کو ہاتھ ہلایا تھا۔اس کی میز پر رکھے کپ کا رخ یوں مڑا ہوا تھا کہ صرف نام کا پہلا حرف بی دکھائی دیتا تھا۔

"بائے۔"

ماہر نے بے اختیار مالا کو دیکھا۔وہ ہلکا سا مسکرا کے اس کو جواباً ہاتھ ہلا رہی تھی۔اس کی مسکراہٹ کچھ مختلف تھی۔کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کر گیا۔

"یہ کون تھا؟"

وہ راہداری میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم سے مطلب؟"

"صرف پوچھ رہا ہوں۔ مال میں بیٹھ کے کون کام کرتا ہے۔"

وہ وسط راہداری کے رکی اور سنجیدگی سے اس کی طرف پلٹی۔

"اگر تم میری زندگی میں مداخلت کرو گے تو میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا رہی۔"

"تمام... تمام۔" اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "میں یونہی پوچھ رہا تھا۔"

وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ البتہ وہ دیکھ سکتا تھا کہ کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدلا تھا۔ جیسے وہ احتراز برت رہی ہو۔ نگاہ چرا رہی ہو۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ لڑکا اب وہاں نہیں بیٹھا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" پارکنگ میں پہنچتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"اس لڑکی سے ملنے جس کے بارے میں تم ہر ایک سے پوچھتی آئی تھیں۔ سوائے میرے۔"

وہ کار کے دروازے کے ساتھ رک کے ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ سن گلاسز لگاتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"سبرینہ۔"

☆☆☆

وہ ایک وسیع و عریض سبزہ زار پر بنی دو منزلہ عمارت تھی۔ لان میں رنگ برنگی سلائیڈز اور دوسرے جھولے نصب تھے۔ اس وقت ان پر مختلف رنگ و نسل کے بچے موجود تھے۔ کوئی سلائیڈ لے رہا تھا۔ کوئی گروہ بنا کے گول گول گھوم رہا تھا۔

عمارت کے عقب میں سرمئی پہاڑوں کی سفید چوٹیاں اور ان پہ اتری شام کی آخری روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے عمارت کے چھوٹے سے لکڑی کے گیٹ تک آئے۔ باڑ کے پار سے وہ جھولوں پر کھیلتے بچوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھنے نہیں آئے تھے۔

"تم نے وہی کیا جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔"

وہ ماتھے پر گلاسز اٹکائے، خفگی سے کہتی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی اور اس نے کوٹ پہن لیا تھا۔ کھلے بال ہوا سے پیچھے کو اڑ رہے تھے اور چہرہ شام کی روشنی میں مزید زرد لگ رہا تھا۔

"تم مجھے سبرینہ کے بارے میں بتا سکتے تھے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا۔"

"تم نے مالک سے پوچھا تھا۔"

"اس سے پہلے میں تم سے بھی پوچھنے آئی تھی۔" وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔ لاہور کے ہوٹل کا منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے تازہ تھا۔ جب وہ بیریل کی مداخلت کے باعث اس سے ملنے آئی تھی۔ جب اس کی ٹانگ زخمی تھی۔

"تم سبرینہ کے بارے میں پوچھنے نہیں آئی تھیں۔ مجھے لاہور سے جانے کے لیے کہنے آئی تھیں تاکہ تم سکون سے زیاد سے شادی کر سکو۔"

وہ عمارت کے دروازے پہ رک گئی۔ پلٹ کے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر اب کیوں بتا رہے ہو کہ وہ زندہ ہے؟"

ماہر فرید نے ہلکے سے کندھے اچکا دیے۔

"کیونکہ میں تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔"

مالا چند لمحے پتلیاں سکوڑے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ سر جھٹک کے پیچھے چلنے لگا۔

وہ کسی اسکول کی عمارت تھی۔ یا شاید ڈے کیئر تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ دماغ اس وقت درست طور پہ کام نہیں کر رہا تھا۔

چند قدم کے بعد وہ نامحسوس طریقے سے آگے آ گیا۔ اب وہ اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سبرینہ انہیں کہاں ملے گی۔

وہ ایک کلاس روم کے قریب رک گئے۔ اس کی ایک دیوار شیشے کی بنی تھی۔ وہ اس کے پار سے اسے دیکھ سکتی تھی۔

وہ بچوں کے ایک گروہ کے وسط میں چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر جھکائے۔ اونچی پونی ٹیل اور سیاہ آنکھوں والی لڑکی مسکرا کے ایک کتاب پر کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر اس نے رک کے سر اٹھایا۔ ان سے کچھ پوچھا۔ وہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ اور تب ہی اس کی نگاہ ان پہ پڑی۔

شیشے کی دیوار کے پار کھڑا ماہر۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سنجیدہ سا دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے ساتھ سبز آنکھوں اور گہرے بھورے بالوں والی دراز قد لڑکی جو اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکائے۔ اس نے لمبے کوٹ پر کراس باڈی بیگ پہن رکھا تھا۔ چہرہ زرد تھا اور آنکھیں... ان میں بہت کچھ تھا۔

وہ مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔

"کشمالہ۔" وہ کلاس روم سے نکل کے ان کے سامنے آئی اور ہاتھ بڑھایا۔

مالا نے ہاتھ کوٹ کی جیب سے نہیں نکالا۔ بس پتلیاں سکوڑے اسے دیکھے گئی۔

سبرینہ کی مسکراہٹ پھیکی ہوئی۔ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"مالا کو تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ میں چاہتا تھا وہ براہ راست پوچھ لے۔" وہ اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا تھا۔ سبرینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ کشمالہ کچھ کہے بنا اسی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"ماہر کو وہ البم میں نے دیا تھا۔"

وہ باہر رہ گیا۔ اندر نہیں آیا۔ وہ یہاں سے اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ صرف سبرینہ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا تھیں۔ یہ بچوں کا کامن روم تھا۔ ایک طرف دیوار گیر شیشے کی کھڑکی تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ سبرینہ نے جوتے ایک طرف اتار دیے تھے۔ اور آلتی پالتی کر کے کھڑکی کی طرف پشت کیے بیٹھ گئی تھی۔ جیسے یوگا کرنے لگی ہو۔

وہ البتہ نہیں بیٹھی۔ سبرینہ کے مقابل دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے کھڑی ہو گئی۔ لانگ بوٹس قالین پر دھرے تھے اور نگاہیں اس لڑکی پہ جمی تھیں۔

وہ چند منٹ بولتی رہی تھی۔ اس کی کہانی۔ وہ وہاں کیسے پہنچی۔ اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والا شخص کون تھا۔ اور وہ کیسے اس ملک میں سیٹل ہوئی۔

"میں نے ماہر سے کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ وہ نہ ہونے دے جو البم میں موجود دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے۔"

"کوئی کسی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔" وہ تلخ ہوئی۔

سبرینہ نے گہری سانس لی۔ پھر پہلو بدلا۔

"میں کسی زیاد سلطان کو نہیں جانتی۔ نہ وہ کبھی میرا منگیتر رہا ہے۔ لیکن ہاں، جس شخص نے مجھے مارنے کی کوشش کی، پولیس کے پروفائلرز کے مطابق وہ میرے ساتھ آبسیسڈ تھا۔ جیسے وہ ہر اس لڑکی کے ساتھ آبسیسڈ رہا تھا جس کو اس نے قتل کیا تھا۔"

وہ سینے پر بازو لپیٹے، چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

"میں نے تمہیں کین کلر Cain Killer کا نشان دکھایا ہے۔" سبرینہ نے اپنے بجھے ہوئے ٹیب کی طرف اشارہ کیا جو قالین پر دھرا تھا جس پہ اس نے چند منٹ پہلے مالا کو وہ تمام تصاویر دکھائی تھیں جو اس کے کرائم سین پہ لی گئی تھیں۔ اس نے ٹیب کو چھوئے بنا بس گردن کو خفیف سا ترچھا کر کے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا تم نے یہ نشان اپنے شوہر کے آس پاس دیکھا ہے کبھی؟" سبرینہ اب اس کو بغور دیکھتی پوچھ

رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے شانے اچکا دیے۔

"یاد کرو، مالا۔ شاید تم نے..."

"کشمالہ۔ میرا نام کشمالہ ہے۔"

"سوری۔ کشمالہ۔" وہ جھینپ گئی۔ چہرہ سرخ ہوا۔

"میں اس نشان کو نہیں پہچانتی۔" وہ اسی بے نیازی سے کہہ کے دیوار گیر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

باہر لان میں شام ابھی روشن تھی۔ ایک بچی گھاس پر بیٹھی، جھک کے جوگرز کے تسمے بند کر رہی تھی۔

"وہ ایک جادوگر کے لیے قتل کرتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ یہ نشان اس جادوگر سے تعلق..."

سبرینہ کی آواز پس منظر میں جانے لگی۔ وہ اس قاتل کی پروفائلنگ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی عادات۔ اس کے خواص۔ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں اس بچی پہ جمی تھیں۔

(کیا جو اس نے کیا وہ درست تھا؟ کیا وہ اپنے عمل کا بوجھ اٹھا سکے گی؟)

سبرینہ اب بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن اسے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ قدم قدم چلتی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ بچی اب جھک کے دوسرا جوگر پہن رہی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال نیچے گرتے گھاس کو چھو رہے تھے۔

مالا کو گالوں پر گرم پانی گرتا محسوس ہوا۔ اسے سبرینہ کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھوں کو کھڑکی کی سلائیڈ کھولتے دیکھا۔ کمرے میں گھٹن تھی۔ اسے تازہ ہوا چاہیے تھی۔

"ماہر سے کہو میں اس کا باہر انتظار کر رہی ہوں۔"

بچی تسمہ کس کے سیدھی ہوئی اور دوسرے بچوں کی طرف بھاگ گئی۔ وہ وہیں گھاس پر اکیلی کھڑی رہ گئی۔

سبرینہ کامن روم سے باہر نکلی تو دیکھا۔ وہ راہداری میں دیوار کے ساتھ کھڑا، موبائل پر بٹن دبا رہا تھا۔

"وہ باہر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

ماہر نے سر کو خم دیا اور موبائل جیب میں ڈالا۔ وہ آگے بڑھنے لگا تھا جب وہ پکار اٹھی۔

"ماہر..."

ماہر نے مڑ کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔"

"ظاہر ہے وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ تم ایک عرصے تک اس کے لیے ربیکا ڈی ونٹر (ناول کا کردار) تھیں۔"

سادگی سے کہہ کے وہ آگے بڑھنے لگا جب وہ بولی۔

"اس پہ اعتبار مت کرو۔ وہ تم سے کچھ چھپا رہی ہے۔"

وہ چونکا۔ پلٹ کے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"میں نہیں جانتی۔ بس مجھے ایک... ایک وائب سی آئی ہے۔" وہ جیسے ٹھیک سے بیان نہیں کر پا رہی تھی۔ "وہ کچھ جانتی ہے۔ لیکن بتا نہیں رہی۔"

"وہ کچھ نہیں چھپا رہی۔" وہ جیسے برا مان گیا۔

سبرینہ نے گہری سانس کھینچی۔

"تم اس کو روز کلرڈ گلاسز (رنگین چشمے) سے دیکھتے ہو۔ اس لیے میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ سوائے اس کے کہ..." وہ اس کا راستہ چھوڑ کے ایک طرف ہٹ گئی۔ "کہ اس پہ اعتبار مت کرو۔"

ماہر فرید نے ایک نظر کامن روم کے کھلے دروازے کو دیکھا۔ وہ شیشے کی کھڑکی کے پار لان میں

کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ ہوا سے بال پیچھے کو اڑ رہے تھے۔ اور نگاہیں ایک درخت پہ جمی تھیں۔
"میں اس پہ خود سے زیادہ بھروسہ کرتا ہوں۔" اس کا انداز قطعی تھا۔ پھر وہ رکا نہیں۔ باہر نکل گیا۔
"میں جانتا ہوں تم اس کو پسند نہیں کرتیں۔" وہ گیٹ عبور کر کے باہر جا رہی تھی جب وہ اس کے برابر آن پہنچا۔ وہ قدرے غائب دماغ لگ رہی تھی۔ جیسے ذہن الجھا ہوا سا ہو۔ اس کی آواز پہ چونکی۔ پھر سر جھٹک دیا۔
"جانتے ہو تو مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟" وہ تلخی سے کہتی گزرگاہ پر قدم اٹھانے لگی۔ وہاں دو رویہ درختوں سے گھرا ایک طویل راستہ بنا تھا۔ ایک طرف عمارتیں تھیں۔ اور دوسری طرف سڑک۔ وقفے وقفے سے کوئی کار زن سے ساتھ سے گزرتی۔
"کیونکہ میں تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔"
مالا نے جواب نہیں دیا۔ سینے پر بازو لپیٹے آگے بڑھتی گئی۔
"ایک بات پوچھوں؟" کچھ تھا جو اس کے ذہن کے پچھلے خانے میں کھٹکنے لگا۔ سبرینہ کی بات جیسے وہاں اٹک گئی تھی۔
"کیا تم مجھ پہ اعتبار کرتی ہو؟"
"نہیں۔"
ماہر فرید نے گہری سانس لی۔ اسے کشمالہ مبین سے اس سے زیادہ کی توقع کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔
"او کے۔ دوسرا سوال۔ کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"
وہ درختوں کی قطار کے ساتھ رک گئی۔ اور پھر اس کی طرف گھومی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔ کیا وہ بیزار تھی؟
"میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اعتبار کا نہیں۔ اس لیے میں تمہیں ہر بات بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔"
"اور تم میرا اعتبار کب کرو گی؟" وہ ٹھنڈے پرسکون انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"جس دن تم مجھے خود پہ اعتبار کرنے کی وجہ فراہم کرو گے۔ کیونکہ ابھی تک تم نے مجھے صرف بے اعتباری کی وجوہات تھمائی ہیں۔" جتا کے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ پارکنگ میں کھڑی کار کی جانب تھا۔
"ہمیں کبیرہ کے بیٹے عالیان کو ڈھونڈنا ہے۔"
"کیوں؟" وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹھہری۔
"کیونکہ وہی ہے جو ہلال کے ساتھ قید ہوا تھا۔ اور وہی ہے جو اس کی مدد کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے کسی وجہ سے اپنا نام بدل لیا ہو۔" وہ اپنا دروازہ کھول رہا تھا۔ کشمالہ کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔
"بدر۔" اس نے بنا آواز کے دہرایا۔
"تم نے عالیان کی بچپن کی تصاویر دیکھی ہوں گی۔ کیا اتنے برس بعد اسے دیکھ کے پہچان لو گی؟"
مالا نے بہت سا تھوک نگلا۔
"شاید۔" نگاہیں جھکا کے وہ کار میں بیٹھی۔ سیٹ بیلٹ پہنتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔
"آر یو او کے؟" وہ اپنی بیلٹ پہنتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
"ہاں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ بہت کام ہیں۔" وہ رکھائی سے کہہ کے چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ گئی۔ وہ سائیڈ مرر میں اس کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ کچھ تھا جو وہاں بدلا تھا۔ وہ تاثر جو مال میں اس لڑکے کو بائے کہتے ہوئے اس نے مالا کے چہرے پہ دیکھا تھا۔ کچھ ایسا جو اس نے پہلے کبھی وہاں نہیں دیکھا تھا۔
(وہ لڑکا کون تھا؟) ذہن نے سوال اٹھایا۔ لیکن ہاتھ خاموشی سے کار اسٹارٹ کرنے لگے۔
(اس پہ اعتبار مت کرو۔ وہ تم سے کچھ چھپا رہی

ہے۔) وہ لب بھینچے ڈرائیو کرتے ہوئے گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پہ ڈال لیتا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ انسانوں کو بہت اچھے سے کتاب کی طرح پڑھ لیا کرتا تھا۔ لیکن کشمالہ مبین نے سرورق پر جیسے کوئی کاغذ چڑھا لیا تھا۔

کچھ تھا جو ماہر کو کھٹکنے لگا۔

(وہ لڑکا کون تھا؟)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نگینہ بیگم نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں کوئی ان دیکھی سی دھند پھیلی تھی۔

جیسے سفید سا دھواں ہو۔

یا شاید ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ تھا۔

نیند۔ دواؤں کا خمار۔ تھکان۔

انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔

سامنے کاؤچ پر کوئی بیٹھا تھا۔

ایک ہیولہ سا۔

"کون ہے؟" ان کے ہونٹ ہلے۔ شاید عینک نہ پہننے کے باعث منظر نامہ دھندلا تھا۔

وہ کاؤچ پر ایک ہیولے کو دیکھ سکتی تھیں۔ کھلی خاکی شرٹ اور ہم رنگ ٹراؤزر۔ گردن میں لپیٹا اسکارف جس کے دونوں سرے سامنے کو گر رہے تھے۔ اور کھلے بال جو کیچر میں آدھے بندھے تھے۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہاں بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی دھیرے دھیرے پیر جھلا رہی تھی۔ وہ اس دھند میں بھی کشمالہ مبین کی سبز آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کشمالہ..." ان کے سینے سے ہوک سی نکلی۔

کیا کچھ نہ تھا اس ہوک میں؟

درد۔ ملال۔ ایسا غم جو کبھی مٹ نہیں سکے گا۔

"کیوں کیا آپ نے ایسے بیٹے؟ اپنے بچے کی جان کون لیتا ہے۔"

"میں دو دن سے سوچ رہی ہوں کہ کیا آپ جانتی تھیں؟"

نگینہ بیگم نے تکلیف سے کروٹ بدلنی چاہی۔ ان کے چہرے کا جلا ہوا حصہ اب پھیل کے گردن اور کان کو لپیٹ میں لے چکا تھا۔ زخم کچے تھے اور ان سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایسی بیماری لگی تھی جو اب تک ڈائیگنوز نہیں ہو پا رہی تھی۔

"وہ بچی بہت قیمتی تھی۔" آنسو ان کی آنکھوں سے پھسلنے لگے۔

"آپ جانتی ہیں۔ ہے نا؟" وہ سوچتی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پیچھے کو ٹیک لگائے۔ ایک انگلی پر بال لپیٹتی۔ کیا وہ واقعی وہاں تھی یا وہ تصور کر رہی تھیں؟

"کیا؟"

"سبرینہ۔"

نگینہ بیگم نے دھیرے سے آنکھیں بند کیں۔ راستہ ختم ہو چکا تھا۔ آگے بند گلی تھی۔

"وہ ہمیشہ میرے اندر اس کی پرچھائی تلاش کرتا تھا۔" وہ ان کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کے بلائنڈز پہ جمی تھیں جو آدھے کھلے تھے۔ ان کی درزوں میں سے روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔

"وہ مجھے اونچی پونی باندھنے کو کہتا تھا۔ جب میں آنکھوں میں گہرا کاجل لگاتی تو اسے اچھا لگتا۔ ایک دفعہ اس نے کہا کہ میں سیاہ لینز استعمال کروں تو زیادہ اچھی لگوں گی۔ وہ میرے اندر اسے ڈھونڈتا تھا۔"

نگینہ بیگم کی آنکھیں بند تھیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ صرف مشینوں کی بپ بپ سنائی دے رہی تھی یا اس لڑکی کی آواز۔

"وہ اس سے اتنا آبسیسڈ تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نہ جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

وہ خاموش اندھیرے میں لیٹی رہیں۔

"وہ پیپر ورک تبدیل کروا سکتی ہے۔ زیاد کی نگاہ سے چھپ سکتی ہے۔ مسلسل دعائیں اور اذکار پڑھنے سے آپ کے موکلوں کی نگاہوں سے بھی چھپ سکتی ہے۔ لیکن کسی دن تو وہ اذکار بھول لی ہوگی۔ اتنے برس

میں کسی ایک دن تو اس نے ناغہ کیا ہوگا۔ اور آپ کے موکلوں نے اسے ڈھونڈ نکالا ہوگا۔"

"ہم اسی دن سے جانتے ہیں جب وہ اس شہر میں شفٹ ہوئی تھی۔" انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ اب منظر پہلے سے واضح تھا۔ انہیں کشمالہ کے چہرے کو دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت نہ تھی۔

"زیاد جانتا ہے؟" ان پہ جمی اس کی آنکھوں میں بے بسی بھرا غصہ تھا۔ نفرت تھی۔ افسوس تھا۔

"وہ جانتا ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتا؟"

کشمالہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور ہتھیلیوں کو دائیں بائیں رکھے کاؤچ پر آگے کو ہوئی۔

"جب وہ اس کے عشق میں گرفتار تھا تو اس پہ سحر عشق کیوں نہیں کیا؟ میری زندگی کیوں برباد کی؟"

وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ آنسو گالوں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

"کیونکہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔"

وہ ٹھہر کے انہیں دیکھنے لگی۔ پلکیں وہیں ساکت ہو گئیں۔

"واٹ؟"

"ہمارے مددگار... ہمارے دوست... وہ کہتے تھے کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اور ہمیں زیاد کی اولاد چاہیے تھی۔" بستر پر لیٹی نحیف اور لاغری بوڑھی عورت دھیمی آواز اور دوٹوک لہجے میں بتا رہی تھی۔

"وہ ایک اسائنمنٹ تھی۔ فہرست میں لکھے لوگوں میں سے ایک نام۔ اس کا زیاد کے لیے مرجانا بہتر تھا۔"

"وہ اس کی محبت میں گرفتار تھا۔"

"اگر اسے سبرینہ سے محبت ہوتی تو اس کو نہ مارتا۔ لیکن سبرینہ کی یاد سبرینہ کے اصل سے بڑی ہوگئی۔ وہ اس کا گلٹ تھی۔ اس کا ضمیر۔"

"اور میں؟" آنسو پھر سے گرنے لگے۔

انہوں نے تکیے پر رکھا بوڑھا چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اب ان کی آنکھوں میں صرف ایک ترحم بھرا افسوس تھا۔

"آپ اس کو اولاد دے سکتی تھیں۔ وہ اولاد جسے آپ نے مار دیا، بے وقوف لڑکی۔"

"اور میری ماں؟" وہ بستر کے سرہانے تک آئی۔ بے رونق بال چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے۔ اور آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

"میری ماں اس کھیل میں کیا تھی؟"

"وہ ماں... جس کو آپ... چھوڑ کے چلی گئی تھیں؟" وہ کھانسنے لگی تھیں۔ تنفس تیز ہو رہا تھا۔

مالا نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑے۔

"مجھے خود کو آپ کے سامنے جسٹفائی نہیں کرنا۔ میں کچھ اور پوچھنے آئی ہوں۔"

ان کی کھانسی دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگی۔ البتہ وہ اب بھی منہ کھول کے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

"کبیرہ کا بیٹا عالیان کہاں ہے؟"

"آہ۔ عالیان۔" ان کے کریلے کے خول جیسے جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ اڈ آئی۔

"اس کا نام اب عالیان نہیں ہے۔"

"آپ نے اس کا نام بدل دیا ہے؟ کیوں؟" وہ پتلیاں سکوڑے ان کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس خول تلے چلتی سوچوں کو پڑھنا چاہ رہی ہو۔

"کبھی نہ کبھی آپ جان جاؤ گی۔ لیکن ابھی نہیں۔"

انہوں نے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔ اب وہ اپنے مانیٹرز کو دیکھ رہی تھیں یا شاید آنکھیں بند کر چکی تھیں۔

"اور ہلال؟" وہ بے چین ہوئی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"آپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔"

وہ چند لمحے جیسے بے بسی سے انہیں دیکھے گئی۔

"وہ ایک چھوٹی بچی ہے جس کو آپ نے اس کے بھائیوں سے الگ کر دیا ہے۔ آپ کو اس پہ ذرا

ترس نہیں آتا؟"

"تمہیں آیا تھا ترس میری پوتی پہ؟" وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔

کشمالہ مبین نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی انہیں دیکھتی رہی۔ ان کے سر کے نیچے دو تکیے تھے۔ اس نے اوپری تکیے کو دیکھا۔ پھر ان کے چہرے کو۔ پھر سے تکیے کو۔

اسے ایک چہرہ یاد آیا۔ سبز آنکھوں والا وہ خوبصورت شفاف چہرہ۔ وہ اس کے ساتھ سوئی تھیں۔ اسی کے تکیے پر۔ کروٹ لے کر۔ وہ صبح اٹھی تو وہ نہیں تھیں۔ وہ جا چکی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ بہت کچھ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ ان کی وہیل چیئر دھکیل رہی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ پر دوا رکھ رہی تھی۔ وہ آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔

اس نے پھر سے تکیے کو دیکھا۔ اور ان کے چہرے کو جو دوسری طرف ڈھلکا تھا۔

"کاش میں آپ سے اپنی ماں کا بدلہ لے سکتی۔"

"لے لو۔ مجھے مرنے سے خوف نہیں آتا۔"

"لیکن مجھے مارنے سے آتا ہے۔" وہ اپنا بیگ اٹھا رہی تھی۔

"اور میں آپ سے کیا بدلہ لوں گی؟ آپ کے حصے کی آگ بہت قریب پہنچ چکی ہے۔"

اب شاید وہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ نگینہ بیگم کی پلکیں ایک دوسرے سے جڑی رہیں۔

جب وہ چلی گئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ لیکن وہ کمرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

مالا بیگ کندھے سے لگائے، آنسو صاف کرتی باہر کاریڈور میں آگے بڑھ رہی تھی جب قدم ٹھہر گئے۔ وہ سامنے تھا۔ زیاد سلطان۔

وہ قطار میں لگی لوہے کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہال میں بنا ویٹنگ ایریا تھا۔ بہت سے پودے۔ درمیان میں فوارا۔ چھت شیشے کی تھی اور کئی منزلہ اونچی تھی۔ بالائی منزلوں کی گیلریز یہاں سے دکھائی دیتی تھیں۔

"کشمالہ۔" اسے دور سے آتے دیکھ کے وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ کچھ تھا جو اس میں بدل گیا تھا۔ وہ کمزور لگ رہا تھا۔ شکستہ سا۔

"کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

وہ دونوں اب آمنے سامنے کھڑے تھے۔ زیاد کا چہرہ اس سے زیادہ پیلا تھا۔ جیسے روح کو یرقان لگا ہو۔

"کیا بات کرو گے اب؟ اپنی ماں کے جادوؤں کا قصہ سناؤ گے؟ یا اپنے کیے قتلوں کا اعتراف کرو گے؟"

"میری ماں..." زیاد نے تکلیف سے سانس اندر کھینچی۔ "صرف دم کرتی ہے۔ وہ جادو نہیں ہوتا۔"

"کیا تم خود کو ایسے تسلی دیتے ہو؟" مالا کے چہرے پر افسوس بھری مسکراہٹ اتری۔

پھر وہ دھیرے سے ایک کرسی پر بیٹھی۔ بیگ گود میں رکھ لیا۔ وہ دو کرسیاں چھوڑ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمحے وہ دونوں سامنے چلتے فوارے کو دیکھتے رہے۔ اوپر شیشے کی چھت سے آتی سورج کی روشنی پانی کے قطروں پہ قوس قزح بکھیرے ہوئے تھی۔

"کیا تم کچھ دیر کے لیے میری بات سن سکتی ہو؟"

"اب میں تم سے نہیں ڈرتی، زیاد۔ جو کہنا ہے کہو۔"

اس کی آنکھیں پانی کی دھار پہ جمی تھیں۔ وہ ہوا میں اوپر اٹھتی۔ پھر یک دم سے نیچے حوض میں جا گرتی۔ اوپر۔ نیچے۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ فوارے کے قدموں میں جمع ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ کم ہوتا

تھا نہ زیادہ۔

"تم کیا کرتے؟ مجھے روکتے؟" حوض کا پانی اس کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔

"مجھے بچے نہیں چاہیے تھے۔" زیاد نے سر جھٹکا۔

"تمہاری ماں کو چاہیے تھے۔ وہ کیا کرتی ہے بچوں کے ساتھ؟" مالا نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

وہ نگاہیں جھکائے فوارے کے حوض کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا، یہ طے تھا۔

"میں نے اپنے بچے کو اس لیے مار دیا کیونکہ تمہاری ماں اس کو مجھ سے چھیننا چاہتی تھی۔ اس کا خون تمہاری ماں کے ہاتھ پہ ہے۔" آواز بھیگ گئی اور آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے۔

زیاد نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

"مجھے کسی بھی قیمت پہ بچہ نہیں چاہیے تھا، کشمالہ۔ تمہیں خود سے باندھنے کے لیے بھی نہیں۔"

اسے اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی لگی۔ وہ افسوس سے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی۔

"اور اگر تم اسے رکھنے کا فیصلہ کرتیں، تب بھی میں اس بچے کی زندگی کا حصہ نہ بنتا۔ لیکن..." اس نے گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی اور چہرہ اٹھایا تو وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اسے مارنے کا غم بھی اتنا بڑا ہوگا۔" وہ اب گردن اونچی کیے چھت سے آتی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس کے چہرے کو۔

"ہلال کہاں ہے؟"

زیاد سلطان نے دھیرے سے چہرہ اس کی طرف واپس موڑا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

اس کی آنکھوں کی نمی اب اندر اتر چکی تھی۔ اور پرسکون سا ماسک چہرے پہ چڑھ چکا تھا۔

"کاش تم میری اتنی عزت کرتے کہ مجھ سے سچ بولتے۔" اس نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ اگر میری ماں جانتی ہو تو وہ الگ بات ہے۔" وہ ٹھہرا۔

"جس تکلیف سے تم خود نہیں گزرنا چاہتے، اس سے ہلال کے بھائیوں کو کیوں گزار رہے ہو؟"

زیاد کی نگاہوں میں عجیب سا زخمی پن ابھرا۔

"تم اس کے لیے مجھے چھوڑ رہی ہو۔"

مالا نے گہری سانس لی۔ اس سانس میں افسوس بھی تھا اور ترس بھی۔

"تم کبھی نہیں بدلو گے، زیاد!" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اور پھر جب اس کی طرف دیکھا تو چہرہ سنجیدہ تھا۔ "میں تمہیں تمہارے لیے چھوڑ رہی ہوں۔ کیونکہ تم اچھے شوہر نہیں تھے۔ تم نے مجھے ابیوز کیا۔ جسمانی، اور ذہنی طور پہ۔ تم نے میری ذات کو ایسے مسخ کیا کہ اب میں ٹوٹ ہو چکی ہوں۔ تم مجھے عزت اور محبت سے ٹریٹ نہیں کر سکے، زیاد۔ کسی تیسرے کو درمیان میں مت لاؤ۔ اپنے عمل کی ذمہ داری لو۔" وہ بیگ کا اسٹریپ کندھے پر ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جگہ سے نہیں اٹھا۔ گردن اٹھا کے یاسیت سے اسے دیکھا۔

"کیا تم طلاق لینے کے بعد اس سے شادی کر لو گی؟"

مالا چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ پہلی دفعہ اسے زیاد سلطان سے نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس پہ ترس آیا تھا۔

"تم نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں کسی بھی دوسرے مرد پہ بھروسہ کر سکوں، زیاد!"

وہ تیزی سے اٹھا۔ اس کے چہرے پہ بہت کچھ ایک ساتھ ابھرا۔ امید۔ بے چارگی۔ خوف۔

"میں کروں گا۔ تم جو کہو گی میں کروں گا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی۔

"اب دیر ہو چکی ہے۔"

"کیا تم مجھے اس حالت میں چھوڑ دو گی جب میری ماں مر رہی ہے؟"

"میری ماں یاد ہے؟ وہ بھی مر گئی تھی۔"

زیاد سلطان نے سر جھکا دیا۔ چند لمحے وہ لب کا شتا رہا۔ اور وہ اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی۔ فوارے کا پانی ایسے ہی اوپر سے نیچے گرتا رہا۔

"میں خود کو بدل لوں گا۔" بہت دیر بعد اس نے چہرہ اٹھایا۔ اس پہ امید تھی۔ "میں ہر وہ کام کروں گا جو تم کہو گی۔"

وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی۔

"تم میرے لیے سب کچھ کرو گے؟"

"سب کچھ۔"

بے بسی۔ بے چینی۔ منت۔ اس کی آواز میں سب تھا۔

"پھر ہلال کو اس کے بھائی کے حوالے کر دو۔"

زیاد سلطان کے کندھے ڈھلک گئے۔ چہرہ تاریک ہوتا گیا۔

"تم اب بھی اس کے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

"اگر تم چاہتے ہو کہ ہم دوبارہ سے ساتھ زندگی گزاریں تو..." مالا بیگ کو ایک کیدھے سے گزارتے ہوئے دوسرے پر پہن رہی تھی۔ "ہلال کو چھوڑ دو۔ میں واپس آجاؤں گی۔"

"تم اب بھی اس کا سوچ رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

"کشمالہ۔" اس نے پکارا لیکن وہ نہیں رکی۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

"ہلال کو چھوڑ دو۔ میں واپس آجاؤں گی۔"

اور یہ اسی وقت تھا جب کیف جمال کا میسج اس کے فون پہ موصول ہوا۔ زیاد نے جھنجھلا کے فون دیکھا۔

"مجھے اس ہفتے کی پے منٹ ابھی تک نہیں ملی، زیاد بھائی۔ اس سے بہتر تھا میں ماہر فریدے کے ساتھ ڈیل کر لیتا۔" کیف نے آڈیو میں بہت تلخی سے کہا تھا۔

زیاد سلطان نے جواب نہیں دیا۔ اس نے فون جیب میں ڈال دیا۔

☆☆☆

مالا کے جانے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ لیکن وہ کمرے کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔

جانے سے پہلے وہ انہیں کس آگ کا ڈراوا دے رہی تھی؟ وہ کس اچھائی اور برائی کی بات کر رہی تھی؟

یہ دنیا نگینہ سلطان کے لیے ہمیشہ سے آگ تھی۔

دھندلے کمرے میں قوس قزح کے سارے رنگ بکھرنے لگے۔ ہر روشن ذرے میں ایک تصویری کہانی پنہاں تھی۔ وہ کمرے میں دائیں بائیں گھومنے لگیں۔ ایک کے بعد ایک منظر۔

وہ ایک زرد سا باورچی خانہ تھا۔ ایک طرف سے کھلا۔ چھوٹی چوکی پر بیٹھی روٹی لگاتی عورت اور چولہے سے نکلتا دھواں۔ وہ وقفے وقفے سے بھوری لکڑیوں کو پنکھے سے ہوا دیتی۔ آتش تیز ہو جاتی۔

قریب میں ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ گیارہ بارہ برس کی۔ وہ انگاروں کو چولہے کے نیچے سے اڑ کے فضا میں غائب ہوتے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً روٹی پکاتی عورت اس کی طرف پلٹی۔

"نگینہ... مجھے وہ پرات اٹھا دے۔"

"جی امی..." وہ اٹھ کے باورچی خانے کے اندرونی حصے میں آئی۔ یہاں کھلے دروازے سے برآمدہ دکھائی دیتا تھا۔ طویل برآمدہ جس کے سامنے کوئی جالی نہ تھی۔ ذرا ذرا سے فاصلے پر چارپائیاں اور ان پر دھرے جامنی گاؤ تکیے۔ لڑکی کی نگاہ ان چارپائیوں تک جا پھسلی۔ وہاں تکیے سے ٹیک لگائے، کلف لگے سفید شلوار قمیض میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا جس کے سیاہ جوتے چمک رہے تھے۔ وہ ساتھ

بیٹھی گلابی پھول دار لباس والی عورت سے بات کررہا تھا جس کی کلائی میں سونے کے کنگن تھے۔

دبلی پتلی لڑکی کی آنکھیں اس آدمی کے ہاتھوں پہ ٹھہر گئیں۔ چہرے پہ ہراساں سا تاثر ابھرا۔ ہاتھ میں پکڑی سلور کی پرات اٹھائی تو اپنا عکس نمایاں ہوا۔ گردن کے نیچے نیل کے نشان۔ اور ایسے کئی زخم جو دن کی روشنی میں نہیں لگائے جاتے۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔ وہ سر جھکائے پرات لیے پلٹ گئی۔

قوس قزح کے رنگ بدلنے لگے۔ ذرات اڑ اڑ کے ایک دوسری شکل بنانے لگے۔

وہ ایک گدلے پانی کی کچی نہر تھی اور اس پر بنا میلا سا پل۔ وہ پل سے ہٹ کے ایک درخت تلے بیٹھی تھی۔ اس کی چوٹی اب قدرے کبی اور رنگت سانولی تھی۔ دھوپ سے چہرہ جھلس سا گیا تھا۔ دور سامنے ایک مزار دکھائی دے رہا تھا جس کے ساتھ بنے درخت پر مختلف کپڑوں کی کترنیں بندھی تھیں۔ وہاں ایک کمرے کے باہر قطار لگی تھی۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس کی ماں وہاں بیٹھی، آنے والوں کو قطار میں لگا رہی تھی۔

''پیر صاحب سب کا مسئلہ سنیں گے۔ تم اندر جاؤ۔ تم یہیں ٹھہرو۔ نہیں پہلے تم ادھر آؤ...''

وہ باری باری کسی کو اندر بھیجتی۔ کسی سے پیسے لے کر ایک ڈبے میں ڈالتی۔

دبلی پتلی لڑکی سوچتی آنکھوں سے عورتوں کے اس غول کو دیکھ رہی تھی۔

قوس و قزح کے رنگ سرمئی ہونے لگے۔ ایسے جیسے ایک روشن دن پہ سیاہ بادل چھا گئے ہوں۔

وہ ایک کچا مکان تھا جس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ لالٹین کی روشنی دیوار پر اونچے سائے گرا رہی تھی۔ وہ چت لیٹی کھلی آنکھوں سے چھت کے لینٹر دیکھ رہی تھی۔

ساتھ لیٹی ماں نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کے ابرو برہمی سے اکٹھے ہوئے۔

''سو جا نگینہ! کیا سوچ رہی ہے؟''

''پیر صاحب کیا کرتے ہیں، امی؟''

''پیر صاحب نہیں کہتے۔ سرکار کہتے ہیں۔'' ماں نے گھر کا۔ آواز میں عقیدت در آئی تھی۔

''سرکار کیا کرتے ہیں؟''

''علاج۔ دم۔ تعویذ۔''

''اور تم جو لوگوں کے گھر جاتی ہو، تم کیا کرتی ہو؟''

''مجھے علم آتا ہے۔ لیکن بس اتنا کہ کسی کا مسئلہ حل ہو جائے، چوری کا سراغ مل جائے۔''

''اور سرکار؟''

''ان کے پاس بڑے جنات ہیں۔ وہ سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں۔''

''وہ میرا کوئی بھی مسئلہ حل کر دیں گے؟''

''اتنا نہ سوچا کر۔ دماغ کو جنات چڑھ جائیں گے۔ چل سو جا۔'' اس نے کروٹ بدل کے آنکھوں پر بازو رکھ لیا لیکن نگینہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔

(سرکار کے قبضے میں جنات ہیں۔ وہ جو دکھائی نہیں دیتے۔ وہ جو سب کر سکتے ہیں۔) اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

(وہ جو سمندروں کی تہوں میں چھپے خزانے لا سکتے ہیں۔ وہ جو آسمانوں سے تارے توڑ کے لا سکتے ہیں۔ وہ جو کسی کا دل کسی کے لیے مائل کر سکتے ہیں۔ وہ جو انتقام لے سکتے ہیں۔ وہ جو چوہدریوں کے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں۔)

''مجھے بھی جنات چاہئیں، امی!'' وہ بڑبڑائی لیکن ماں نے نہیں سنا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور خراٹے گونج رہے تھے۔ اس کے خراٹوں میں مشین کی بپ بپ گڈمڈ ہونے لگی۔

نگینہ بیگم نے آنکھیں کھولیں۔ قوس و قزح راکھ بن کے ان کے بالوں میں اتر آئی تھی۔ وہ دبلی پتلی لڑکی جانے کب جھریوں زدہ چہرے اور سفید بالوں والی یہ نحیف اور لاغر عورت بن گئی تھی، انہیں

معلوم ہی نہ ہوسکا۔
زندگی جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئی تھی۔
انہوں نے بدقت کروٹ لینا چاہی۔ تکلیف سے کراہ نکلی۔
انہوں نے پلکیں بند کیں۔ وہ سونا چاہتی تھیں لیکن نیند کسی الوژن کی طرح تھی۔ وہ تھی اور وہ نہیں تھی۔ کیا وہ سو رہی تھیں؟ کیا وہ جاگ رہی تھیں؟
پلکیں کھولیں تو منظر بدل چکا تھا۔ وہ ہسپتال کا کمرہ نہ تھا۔
وہ ایک دھول اڑاتی لمبی کار تھی جو اونچے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک سنہرا دن۔ دھول کا بادل۔ اور وہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبائے لڑکی جو دالان میں لگے درخت کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔
دھول کا بادل چھٹا۔ کار کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ گورا چٹا۔ لمبا اونچا۔ سن گلاسز لگائے۔
کسی ملازم نے پیچھے سے کسی سے سرگوشی کی۔
"یہ بڑے صاحب کا بھتیجا ہے۔ سلطان۔ دبئی سے آیا ہے۔"
وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری دنیا بس اس کے سن گلاسز کے شیشے میں قید ہو چکی تھی۔
دھول چھٹنے لگی۔ ہسپتال کے کمرے کی سفیدی واپس آنے لگی۔ اسٹاف اور نرس ان کے اردگرد کھڑے تھے۔ زیاد ان کو سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ وہیل چیئر سامنے تھی۔ اندرانی ان کو جوتے پہنا رہی تھی۔ وہ انہیں کسی ٹیسٹ کے لیے لے جا رہے تھے۔
بھوری دھول ایک دفعہ پھر چھانے لگی۔
قوس وقزح کے سارے رنگ مزار کے سامنے لگے درخت پر بندھی کترنوں میں اترتے گئے۔ وہ دم توڑتی شام کی ہوا میں جھول رہی تھیں۔ مغرب چھا رہی تھی۔ رش اب چھٹ چکا تھا۔ آج اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ اسی لیے وہ ادھر موجود تھی۔
اندر ہال کمرے میں سرکار اپنے منبر پر براجمان تھے۔ ساتھ ایک مرید بیٹھا بےزار سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دو زانو ہوئے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ سیاہ دوپٹہ سر پر لپیٹے، وہ چہرے پہ امید اور بےبسی لیے کہہ رہی تھی۔
"مجھے ایک انسان چاہیے، سرکار۔"
مرید نے خفگی سے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے انگوٹھیوں والا ہاتھ اٹھا کے روکا۔ وہ سیاہ لمبے بالوں اور سرمہ لگی آنکھوں والا ہٹا کٹا انسان تھا۔ سر پر نارنجی رومال باندھے، ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھماتا، وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"انسان کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، لڑکی۔"
"جو آپ مانگیں، میں دوں گی۔" اس نے بے اختیار ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اوپر بیٹھے تھے اور وہ نیچے۔
وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ پھر حقے کا گھونٹ بھرا۔ گڑگڑ کی آواز آئی۔ پھر لب کھولے تو بہت سا دھواں ہونٹوں سے نکلا۔
"سحر عشق بہت بھاری جادو ہے۔ کچھ عرصے بعد اترنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی قیمت سنگین ہوتی ہے۔"
"میں ادا کروں گی۔"
"ہم سے اپنی روح کا سودا کرو گی؟" ان کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ نگینہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔
"جی سرکار۔"
انہوں نے پھر سے ایک کش بھرا۔ حقے کا دھواں بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ سارے منظر پہ چھا گیا۔
جب وہ چھٹا تو انہوں نے خود کو وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھا۔ اندرانی اسے دھکیل رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بول رہی تھی اور ان کے آگے زیاد چل رہا تھا۔ وہ ہسپتال کا کاریڈور تھا۔ زیاد کے ہاتھ میں چند رپورٹس تھیں۔

انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ گردن ایک طرف غنودہ سی ڈھلک گئی۔

یہ وہی باورچی خانہ تھا۔ وہ اس کی چوکھٹ میں کھڑی سینے پر بازو لپیٹے برآمدے اور صحن میں اکٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ وسط میں چارپائی پر کفن میں لپٹی لاش رکھی تھی اور وہ سونے کے کنگن والی عورت اس کے سرہانے بیٹھی اونچی آواز میں بین کررہی تھی۔ لاش کے چہرے کا ایک حصہ کفن سے اچھی طرح لپیٹا گیا تھا۔

"بے چارے ملک صاحب۔ باتھ روم میں گیزر پھٹنے سے ہلاک ہوگئے۔"

"آدھا چہرہ جل گیا ان کا۔" دو عورتیں قریب میں کھڑی سرگوشیاں کررہی تھیں۔

"اسی لیے میرا گھر والا گیزر لگوانے کے خلاف ہے۔"

"تم نے سنا نہیں؟ مولوی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھی کہ یہ جنات کا کام لگتا ہے۔ ایسے کیسے اچانک سے گیزر...."

سیاہ دوپٹے والی لڑکی مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی، اس منظرنامے کو دیکھے گئی۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف پلٹ گئی۔ دوپٹے کی گرہ سے ایک پڑیا نکالی۔ پسی ہوئی چینی۔ اور ٹرے میں رکھی چائے کی پیالیوں میں سے ایک میں گھول دی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹرے لیے مردوں کے ایک گروہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ گورا لمبا سا سلطان وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے وہ کپ نکال کے اس کے سامنے کیا۔ سلطان نے کپ تھام لیا اور اسے دیکھے بنا ساتھ والے کزن سے سلسلہ کلام جاری رکھے رہا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

ان کو نیند میں جیسے جھٹکا سا لگا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ اب ہسپتال کے بستر پر لیٹی تھیں۔ سفید کمرہ اب بھی دھندلا تھا۔ اور چہرہ۔ اس کی جلن بڑھ گئی تھی۔ یوں جیسے جسم کے ایک طرف کھولتا ہوا لاوا گرادیا گیا ہو۔

یوں جیسے اس پر گرم پانی کا گیزر پھٹ گیا ہو۔

منظر بدل چکا تھا۔

وہ ایک نیم تاریک کمرہ تھا۔ کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ اس پر نحیف سا بوڑھا آدمی لیٹا تھا۔ لمبے بال جھڑ گئے تھے۔ اور نارنجی رومال ایک طرف رکھا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور آدھا چہرہ مسخ ہوچکا تھا۔ جیسے اسے کوڑھ کھا گیا ہو۔

نگینہ پانی کا ٹھنڈا گلاس ان کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔

"اٹھیں سرکار۔ پانی پئیں۔"

"تیری ماں خوش نہیں ہوتی تیرے یہاں آنے سے۔" بوڑھے مرد نے کپکپاتا ہوا ہاتھ بڑھایا۔ پھر گلاس تھام کے لبوں سے لگایا۔ کچھ اندر گیا۔ کچھ چھلک گیا۔ حلق میں ایسی آگ لگی تھی کہ ٹھنڈا پانی اندر جاتے ہی کھولنے لگتا تھا۔ پیاس تھی کہ بجھتی نہ تھی۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب وہاں نہ رش تھا نہ مرید۔ وہ ایک ویران مزار تھا جہاں اب کوئی نہیں آتا تھا۔ سب کو معلوم ہوگیا تھا کہ سرکار کو کوڑھ ہوگیا ہے۔ لیکن وہ کوڑھ نہیں تھا۔ وہ کچھ اور تھا۔

"امی اس لیے خوش نہیں ہوتی کہ تمہارا کاروبار بند ہوگیا۔ اب وہ خود پیرنی بنی بیٹھی گاؤں کی عورتوں کا علاج کررہی ہے۔"

اس نے ہونہہ میں سر جھٹکا۔ سرکار نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تیرا سحر عشق کام کررہا ہے، نگینہ۔ پھر تو ادھر روز کیوں آتی ہے؟"

"سرکار...." وہ مسکرا کے ان کی طرف پلٹی۔

"مجھے وہ سکھا دو جو میری ماں کو نہیں سکھایا۔ جو کسی کو نہیں سکھایا۔"

کوڑھی مرد نے غور سے اس کی آنکھوں میں

دیکھا۔اس کے گلے سڑے چہرے سے بدبو اٹھ رہی تھی لیکن وہ پرواہ کیے بناوہیں کھڑی تھی۔

"وہ سیکھ کے تو کیا کرے گی؟ میرا انجام نہیں دیکھ رہی؟" اس نے آنکھیں بند کیں۔آنسو پنسل کے مسخ شدہ چہرے میں جذب ہو گیا۔

"میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔تو اس چیز سے دور رہ۔جا کے اپنی زندگی بنا۔"

"میں اپنا انجام اپنی مرضی سے لکھوں گی ،سرکار۔مجھے بس وہ سب دے دو جو تمہارے پاس ہے۔"اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

کمرے کی بتیاں مدھم ہونے لگیں۔انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔جسم میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔حلق میں انگارے سلگ رہے تھے۔کسی کروٹ سکون نہ تھا۔

قوس وقزح اب کسی منجدار کی طرح گول گول گھوم رہی تھی۔اور وہ اس کے درمیان کہیں پھنس کے رہ گئی تھیں۔یادوں کا سمندر تھا جو ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر سمت سے حملہ آور ہوا تھا۔

وہ اونچا لمبا خوبصورت مرد...وہ کسی پروانے کی طرح اس دبلی پتلی سی لڑکی کے گرد پھر رہا تھا۔وہ اس کی کار میں بیٹھی تھی۔اور وہ کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر دور کہیں جا رہے تھے۔

منجدار کے درمیان سے ایک اور منظر ابھرا۔وہ اپنے ماں باپ کے سامنے ڈٹ کے کھڑا،بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔گھر چھوڑنے کی دھمکی۔خودکشی کی دھمکی۔اس کی ماں سر پکڑے ہوئے تھی۔باپ زور زور سے "نوکرانی کی بیٹی ہے وہ" چلا رہا تھا۔پھر اس منظر پہ سرخ گلابوں کا چھاتا تن گیا۔اور اس سے ایک کمرہ ابھرتا دکھائی دیا۔

وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھی۔مسکرا کے آئینے میں دیکھتی بالوں میں برش چلا رہی تھی۔اور اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا محبت سے کچھ کہہ رہا تھا۔

نگینہ بیگم نے گیلے منجدار میں بدقت آنکھیں کھولیں۔مناظر کسی البم کے صفحات کی طرح پلٹتے جا رہے تھے۔

اب وہ دونوں کسی پہاڑی سڑک پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ہاتھوں میں ہاتھ تھے۔اونچی ہنسی۔کلائی میں گجرا۔

البم نے ایک اور ورق الٹایا۔

وہ رات کو تنہا کمرے میں بیٹھی،آنکھیں بند کیے تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھی۔پھر آنکھیں کھولیں اور پہلو میں کروٹ لیے بے خبر سوتے سلطان پر پھونک ماری۔چہرے پر مسکراہٹ تھی۔آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے قوس قزح سیاہ سفید سی ہو گئی۔

سارے رنگ ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے۔

بہار میں خزاں کی زردی گھل گئی۔

وہ خوب صورت مرد لاؤنج میں سیدھا چلتا جا رہا تھا۔وہ کچن میں اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔وہ مسکرا کے اس کو آواز دینے لگا۔

نگینہ نے بھی مسکرا کے چہرہ موڑا۔لیکن...وہ ایک دم ساکت رہ گیا۔

اس کا چہرہ...اس کی بیوی کا حسین چہرہ...کسی خونخوار کتے کے چہرے جیسا تھا۔

وہ ایک دم زور سے چلایا۔اس چیخ نے ان کی زندگی میں صور پھونک دیا تھا۔قیامت آچکی تھی۔

جسم کے دائیں حصے میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔زبیدہ ان کے اوپر لحاف برابر کر رہا تھا۔وہ کروٹ بدلنا چاہتی تھیں۔لیکن کسی کروٹ آرام نہ تھا۔جسم میں درد تھا۔روح میں درد تھا۔

وہ ایک بیڈروم تھا جس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔سلطان ایک ایک چیز الماری سے نکال کے پھینک رہا تھا۔ساتھ ہی وہ اونچا اونچا چلا رہا تھا۔بستر پر لیٹا ایک ننھا بچہ رو رہا تھا۔

وہ خاموش سی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ بالکل خاموش۔ اور بے تاثر۔ جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔

وہ کپڑوں اور کتابوں کے اندر سے چیزیں نکال نکال اس کے قدموں میں پھینک رہا تھا۔ گڑیا۔ سوئیاں۔ پتلے۔ الو کی کھوپڑی۔ کتے کے دانت۔ سوکھے گوشت کے ٹکڑے۔

سلطان زور سے چلایا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچے اور زمین پر بیٹھتا گیا۔ اب وہ رو رہا تھا۔ کسی بچے کی طرح۔

وہ اسی طرح خاموش کھڑی تھی۔

درد کی ایک لہر گردن میں اٹھی۔

آہ۔ ان کے لبوں سے کراہ نکلی۔ ایک کروٹ بدلی۔ جسم تپ رہا تھا۔

کیا وقت قریب تھا؟ کیا مہلت ختم ہونے کو تھی؟

وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے دروازے پہ لمبی کار کھڑی تھی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ اور سلطان اس لڑکی کو بازو سے کھینچ کے باہر نکال رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لحاف میں لپٹا بچہ تھا جو مسلسل رو رہا تھا۔

"جادوگرنی ماں کی جادوگرنی بیٹی۔" وہ اسے چوکھٹ تک لایا اور وہیں پٹخ دیا۔ وہ گری نہیں۔ بس دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روک دیا۔

"میرے ماں باپ ٹھیک کہتے تھے۔ تم اور تمہاری ماں کے تعویذوں نے یہ سب کیا ہے۔" وہ اڑے اڑے بالوں اور کھلے گریبان کے ساتھ چلا رہا تھا۔

وہ بالکل خاموش اور بے تاثر تھی۔ برف کی ہو جیسے۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور اس کی پریشان سی ماں باہر نکلی۔ وہ ابھی تک چلا رہا تھا۔ ماں نے ہاتھ جوڑے۔ لیکن وہ بلکتا جھکتا آگے بڑھ گیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ کیا۔

"اونہوں۔" اس نے ماں کے جڑے ہاتھوں پر ایک ہاتھ رکھ دیا۔ سلطان کی کار دھول اڑاتی دور جا رہی تھی۔

"وہ واپس آئے گا۔ ہم اس کو کھینچ کے واپس لائیں گے۔"

ماں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہم؟ ہم کون؟"

نگینہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچے کو لیے آگے بڑھ گئی۔

بستر میں جیسے لوہے کے نشتر نکل آئے تھے۔ جس طرف کروٹ لو، وہ جسم میں اترتے جاتے تھے۔

کیا موت کا فرشتہ آن پہنچا تھا؟ یا ابھی کچھ مہلت باقی تھی؟

یاد ماضی نے ایک نیا ورق الٹا۔

وہ نیا کلف لگا لباس پہنے، دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ اس کی ماں پریشان سی ساتھ کھڑی تھی۔ وہ کار واپس آگئی تھی۔ سلطان چپ چاپ باہر نکلا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور چہرہ گم صم۔

"کہا تھا نا وہ آئے گا۔" اس نے بس مسکرا کے ماں کو دیکھا۔

"تو نے یہ کیسے کیا نگینہ؟" ماں کی آنکھوں میں خوف بھر آیا۔

"سحر عشق اتر جاتا ہے۔ لیکن زبان بندی کا جادو برسوں چلتا ہے ماں۔ کاش تو سرکار سے یہ سیکھ سکتی۔" وہ سرگوشی میں کہہ کے مسکرائی اور آگے بڑھ گئی۔ سلطان کسی معمول کی طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھا کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔

وہ بالکل خاموش تھا۔

پھر خاموشی ٹوٹی۔

"میں ساری عمر تم سے نفرت کروں گا۔" کار

سڑک پر ڈالتے ہی وہ بول اٹھا۔
"کرتے رہو۔" وہ مسکرا کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سلطان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نمی میں غصہ تھا۔ نفرت تھی۔ اور مجبوری تھی۔ اسے آنکھیں بند کرنے سے خوف آتا تھا۔ پلک جھپکتا تو وہ آجاتے تھے۔ اس کو ڈرانے۔ اس کو جان سے مارنے۔ وہ اس پہ بوجھ ڈالتے تھے۔ اسے ثمینہ کو واپس لانا تھا اپنی زندگی میں۔ وہ بے بس تھا۔

منظر تبدیل ہوتا گیا۔ بچہ اب بڑا ہو چکا تھا۔ وہ ایک میز پر کاپی رکھے ہوم ورک کر رہا تھا۔ ساتھ بیٹھا سلطان ہاتھ میں چھڑی لیے اسے گھور رہا تھا۔ گزرتے وقت نے اس کو بوڑھا کر کے وقت سے پہلے بڈھا دیا تھا۔ رنگت کملا گئی۔ شخصیت ماند پڑ گئی۔ ایک ایک کر کے وہ ہر رشتے سے کٹتا گیا۔ وہ اپنی بیوی کا غلام تھا۔ ایسا غلام جو اس سے نفرت کے باوجود اس کے چنگل سے دور نہیں جا سکتا تھا۔

"تیز لکھو۔ تیز۔" سلطان اس بچے کو دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

بچے نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا۔ وہ چھڑی بہت قریب تھی۔ اس کا حلق سوکھنے لگا۔ وہ جلدی جلدی کاپی پر پنسل گھسیٹنے لگا۔ کچن سے نکلتی ثمینہ بیگم نے خاموشی سے یہ منظر دیکھا اور آگے بڑھ گئیں۔ یہ ان کی پڑھائی کا وقت تھا۔ سرکار کو مرے برسوں گزر چکے تھے اور انہوں نے خود کو سرکار بنا لیا تھا۔ ان کا رخ سیڑھیوں کی جانب تھا۔ نیچے بیسمنٹ میں ان کا کام ان کا منتظر تھا۔

سارے مناظر بجھتے کوئلوں کی طرح ٹھنڈے پڑتے گئے۔ لیکن جسم کے اندر سلگتی آگ بڑھتی جا رہی تھی۔

کیا وقت قریب تھا؟ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کیا مہلت ختم ہو چکی تھی؟

نہیں۔ انہیں کچھ وقت مزید چاہیے تھا۔
انہیں ایک آخری کام ابھی کرنا تھا۔

☆☆☆

رات سیاہ چادر کی مانند سارے پہ چھائی تھی۔ طویل دو رویہ سڑک کے کنارے بنا وہ ایک گیس اسٹیشن تھا۔ اس شہر میں ڈاؤن ٹاؤن سے دور ہوتے جاؤ تو کمرشل عمارتیں دور دور واقع دکھائی دیتیں۔ ایک منزلہ مخروطی چھت والی شاپس۔ اور ہر شاپ کئی کئی کینال پہ پھیلی ہوتی۔ ہر عمارت کھلی کھلی سی بنی تھی جیسے شمالی امریکہ میں جگہ بہت اور لوگ کم ہوں۔

ایسے میں اس گیس اسٹیشن کے عقبی طرف دو ہیولے سے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"مجھے میرے پیسے وقت پہ نہیں مل رہے، زیاد بھائی۔"

ناخوش سا کیف سامنے کھڑے زیاد سلطان سے کہہ رہا تھا۔

"میرے اکاؤنٹ کا تھوڑا مسئلہ چل رہا ہے۔ میں خود ایک مفرور کی زندگی گزار رہا ہوں۔ ذرا وقت لگے گا لیکن تین دن تک میں تمہاری تمام اجرت کلیئر کر دوں گا۔"

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے نیاز سا کھڑا تھا۔

"اس سے بہتر تھا میں ماہر فرید کے ساتھ ڈیل کر لیتا۔" کیف نے نخوت سے ناک سکوڑی۔ وہ جیسے بے زار تھا۔ زیاد نے بہت ضبط سے سانس اندر کھینچی۔

"کیف۔" وہ دانت پہ دانت جما کے کہنے لگا۔ "تم نے مجھے ماہر فرید کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیوں؟"

"جب پیسے پورے دیں گے تو معلومات بھی پوری ملے گی۔" وہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ زیاد کے جیبوں میں چھپے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"اگر تم ایک آخری کام کر دو، تو میں طے شدہ رقم سے دوگنا ادا کروں گا۔"

کیف جمال چونکا۔ زمین کو مسلتا اس کا جوگر رکا۔ آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ سڑک پر تیز بھاگتا ایک ٹرک زن سے ان کے پاس سے گزرا۔ ایک لمحے کے شور اور روشنی کے بعد واپس اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔

"اس آخری کام کے بعد تم آزاد ہو۔ چاہے ماہر فرید سے ڈیل کرو۔ چاہے شیطان سے۔"

کیف جمال بڑھی ہوئی شیو کو مسلتے ہوئے بغور سننے لگا۔

زیاد کے ہونٹوں سے نکلنے والے اگلے الفاظ پہ اس کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"لیکن کیوں؟" پھر اس نے خود ہی شانے اچکا دیے۔

"خیر... مجھے وجہ نہیں جاننی۔ میں تیار ہوں۔"

کہتے ہوئے اس نے موبائل نکالا۔

رات اب تاریک اور بوجھل تھی۔
بارش سے پہلے کے بادلوں کی طرح۔
ٹوٹے دل کی طرح۔

☆☆☆

اگلا سورج طلوع ہوا تو اپنے ساتھ ایک نیا دن لایا۔ وہ بظاہر ایک عام سا دن تھا۔

اسی عام سے دن کی طرح جو ایک سال پہلے کشمالہ مبین کی زندگی میں آیا تھا۔

وہ دن جس کی صبح ماہر فرید کے کیف جمال بن کے اس کی زندگی میں داخل ہونے سے ہوئی تھی۔ وہ دن جس کی دوپہر اس کا کیریئر ختم ہونے سے ہوئی تھی۔ اور وہ دن جس کی شام زیاد سلطان کی لائی گئی سحر زدہ براؤنیز سے ہوئی تھی۔

ایسے عام سے دن کسی کی بھی زندگی میں بنا چاپ کے داخل ہو جاتے ہیں۔ بھیس بدل کے۔ خود کو چھپا کے۔ اور پھر ایک دم سے ساری زندگی پلٹ دیتے ہیں۔

اس صبح شاپنگ مال کی رونق معمول کے مطابق

اپنے عروج پہ تھی۔ مالا کی کافی شاپ پہ البتہ رش کم تھا۔ وہ سیاہ ایپرن پہنے، سر پر پی کیپ جمائے، سر جھکائے سنک میں گلاس دھو رہی تھی۔ پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کے ایپرن کو بھگو رہے تھے۔ ذہن کسی نقطے پہ پھنسا تھا۔ آج کیف بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا میسج میں صرف ایک میسج موصول ہوا تھا کہ وہ کچھ دن کام پہ نہیں آسکے گا کیا زیاد نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا؟ مگر کیوں؟

اس کے ارتکاز کو توڑنے والی آواز میسج ٹون کی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور ایپرن کی جیب سے موبائل نکالا۔

وہاں ماہر فرید کا میسج جگمگا رہا تھا۔

''تم سبرینہ سے مل کے خوش نہیں ہوئیں، میں جانتا ہوں۔ حالانکہ اس کا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

کشمالہ کا چہرہ بے تاثر رہا البتہ انگلیاں تیزی سے ٹائپ کرنے لگیں۔

''میری زندگی میں سبرینہ سے بڑے مسائل ہیں، ماہر بے۔''

چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ پھر ٹون بجی۔

''مجھے کبیرہ کے بیٹے عالیان کو ڈھونڈنا ہے۔''

مالا کے چہرے پہ غیر آرام دہ سا تاثر ابھرا۔

''میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔'' اس نے پی کیپ سے نکلتی لٹ کو بے چینی سے کان کے پیچھے اڑسا۔

''تمہیں لگتا ہے وہ اپنا نام بدل چکا ہوگا؟''

(عالیان کا نام اب عالیان نہیں ہے، کشمالہ۔)

''مجھے نہیں معلوم۔''

''وہی ہے جو ہلال کے ساتھ قید ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑا ہوا ہوگا۔ مجھے ہلال نے اس کا نام بدر بتایا تھا۔''

''شاید۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اسکرین دھندلی ہونے لگی۔ وہ اس کو بتا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جسے وہ تلاش کر رہا ہے، وہ کہاں تھا۔ وہ چند فقروں میں ماہر فرید کی زندگی کی سب سے بڑی مسٹری کھول سکتی تھی۔ سرکار۔ ہلال۔ بدر۔ لیکن نہیں۔

''میں کبیرہ تائی سے بات کروں گی۔'' جلدی جلدی ٹائپ کر کے بھیجا اور سیدھی ہوئی۔ ایک لڑکی اندر داخل ہوتی دکھائی دی تھی۔ مالا تیزی سے کیش کاؤنٹر کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اور چہرے پر کینیڈین مسکراہٹ سجائی۔

''گڈ مارننگ۔ آپ کیا لیں گی؟''

''کشمالہ مبین؟'' اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونکی۔ وہ لڑکی کافی فربہ تھی۔ ایک ہاتھ میں چند شاپنگ بیگز تھے۔ دوسرے سے بار بار بال درست کر رہی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ کہاں؟

''جی۔ آپ کون؟'' اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور ابرو اکٹھے ہو گئے۔

''میں روبی ہوں۔ ہیلو۔'' اس نے بدقت مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا۔ مالا نے اس کا ہاتھ ملایا۔ وہ موٹا اور بے حد نرم سا ہاتھ تھا۔ کسی بچے کے جیسا۔ اس نے غور سے لڑکی کو دیکھا۔ بھرے بھرے گالوں والا چہرہ، بے حد گھنی مڑی ہوئی پلکیں جو غالباً مصنوعی تھیں۔ نیلا آئی لائنر۔ اور لمبے لمبے مصنوعی ناخن۔

''میں کیف کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ میری کال نہیں اٹھا رہا۔''

اور ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کی شادی کا شوٹ کیف جمال نے کرنا تھا۔ اس روز اس نے اسے کیف کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیف نے بتایا تھا کہ یہ اس کی کلائنٹ تھی۔

''میں نہیں جانتی کیف کہاں ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ وہ چند دن تک کام پہ نہیں آئے گا۔'' وہ سر جھکا کے فون کھولنے لگی۔ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ جب اس نے چہرہ اٹھایا تو دیکھا، روبی کی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔

"کیف بھاگ گیا ہے نا؟" آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔
"میں نہیں جانتی۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے فون ایک طرف رکھ دیا۔ "تم کسی اور کو ہائر کر سکتی ہو؟"
روبی نے جواب نہیں دیا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی قریب رکھی ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ سر ہاتھوں میں گرا لیا اور ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
"سب خراب ہو گیا۔ سب کچھ۔ میری شادی۔ میرا اہم دن۔" وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔
وہ چند لمحے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی اسے دیکھے گئی۔ وہ شادی کے دن کے خراب ہونے پہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا شوہر ایک اذیت دینے والا مرد نکلے گا، اور ایک دن اسے ایک بیگ کے ساتھ اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اس شادی کا فوٹو شوٹ اسے کیوں کروانا تھا جس کا انجام طلاق ہی تھا۔ یا سمجھوتہ؟
"روبی... روبی۔" اس نے سکون سے ایک گلاس میں برف بھری۔ پھر پانی ڈالا۔ اسٹرا رکھا۔ اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر اس کی میز تک آئی۔ گلاس اس کے سامنے رکھا اور مقابل کرسی کھینچی۔
روبی نے بھیگی پلکیں اٹھا کے اس سیاہ پی کیپ والی لڑکی کو دیکھا۔ اس کا نیلا لائنر پھیل چکا تھا اور ناک گلابی ہو رہی تھی۔
"ہفتے کے دن میری شادی ہے۔"
وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"میں اس کو ایڈوانس دے چکی تھی۔ اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی دوسرے فوٹوگرافر کو ہائر کروں۔ اور ایک دن کے نوٹس پہ کوئی کام نہیں کرتا یہاں۔ سب بکڈ ہیں۔ بہار کا سارا سیزن بکڈ ہے۔" ٹھنڈے پانی کا ان چھوا گلاس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی بیرونی سطح پر پسینے کے قطرے گرتے رہے۔ وہ لڑکی اسی طرح روئے جا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"
"اس نے تمہارا نام لیا تھا۔" اس نے بچوں جیسے موٹے ہاتھوں سے گال صاف کیے۔ نیلی لکیریں چہرے پر نہروں کی صورت جمی تھیں۔
"میں اس کی کسی فوٹوگرافی کمپنی کا حصہ نہیں ہوں۔" وہ سکون سے سینے پہ بازو لپیٹے ہوئے تھی۔
"اس نے مجھے رات میں ایک میسج چھوڑا تھا۔ کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں تمہارے پاس آؤں۔"
آہ زیاد سلطان۔ اس نے افسوس سے گہری سانس لی۔ اس نے کیف جمال کو غائب ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ ایسے کہ وہ اپنے کام کا ملبہ مالا پہ ڈال جائے۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار تھی۔ وہ اس دن سے اس کے لیے تیار تھی جب اس نے کیف جمال کو ہائر کیا تھا۔ وہ دوسری دفعہ ایک ہی سوراخ سے نہیں ڈسی جائے گی۔ کیا کیف جمال، کیا زیاد سلطان، اور کیا ماہر فرید۔ یہ تینوں اس کی مشکلات بڑھانے آئے تھے کم کرنے نہیں۔ اور وہ اب ان میں سے کسی کے ہاتھوں میں استعمال نہیں ہو گی۔
"مجھے تم سے ہمدردی ہے، روبی۔ لیکن میں کیف کے لیے لائیبل نہیں ہوں۔ میرا اس کے ساتھ ایسا کوئی کانٹریکٹ نہیں ہے جس کے تحت میں تمہاری مدد کر سکوں۔ تمہیں پولیس کے پاس جانا چاہیے یا عدالت میں۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"
"میں کیا کروں؟ میری شادی ہے دو دن بعد۔" وہ پھر سے رو دینے کو تھی۔ اس نے گلاس ابھی تک نہیں چھوا تھا۔
کشمالہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بے بسی سے شانے اچکائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، پیچھے سے گزرتی جے پی زیر لب بڑبڑائی۔
"وزن کم کرو۔ اور کیا۔" اس نے پنجابی میں کہا تھا۔ اور روبی ایک سفید فام لڑکی تھی۔ مگر ایک دم وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور زور سے گلاس کو ہاتھ مارا۔ پانی اور برف کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔
"تمہیں لگتا ہے یہ اتنا آسان ہوتا ہے؟" وہ

حلق کے بل چلائی۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

جے پی ایک دم بوکھلا گئی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ تم غلط سمجھی ہو۔''

لیکن اس ملک میں ہر انسان کو اپنے احساس کمتری کا ترجمہ ہر اس زبان میں آتا تھا جو یہاں بولی جاتی تھی۔

''وزن کم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تم نے میری زندگی نہیں گزاری۔'' وہ اسی طرح چلا رہی تھی۔

مالا نے ملامتی نظروں سے جے پی کو دیکھا۔ وہ بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔ پھر وہ روبی کے قریب آئی۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ریلیکس۔ تم غلط سمجھی ہو۔ وہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔'' نرمی سے کہنا چاہا۔ روبی نے زخمی نظریں اس کی طرف موڑیں۔

''میں وزن کم نہیں کر سکی۔ اور میرا فوٹوگرافر بھاگ گیا۔ میں کیا کروں گی؟'' وہ ایک دم رونے لگی۔ مالا چند لمحے اسے روتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے کندھے پر دباؤ دے کر اسے واپس کرسی پر بٹھایا۔

''تم نے کیف کو مکمل رقم ادا نہیں کی تھی؟'' ساتھ ہی ٹشو اس کی طرف بڑھایا۔ روبی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں۔ ایڈوانس دیا تھا۔'' اس نے ٹشو تھام لیا۔

''اگر تم باقی رقم مجھے ادا کر دو تو میں تمہارا فوٹو شوٹ کر دوں گی۔''

آنکھ کے کنارے صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھہرے۔

''تم فوٹوگرافر ہو؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''نہیں۔ لیکن تمہیں فوٹوگرافر نہیں چاہیے۔ تمہیں کچھ اور چاہیے۔''

''کیا؟''

''سحر۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔ ''ایک الوژن۔''

روبی کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ وہ ٹھہر کے اس کے اگلے الفاظ سنے گئی۔

☆☆☆

روبی کے جانے کے بعد کئی گاہک آئے اور گئے۔ یہاں تک کہ اس کی شفٹ کا وقت ختم ہو گیا۔ آج جے پی بھی قدرے ڈھیلی تھی۔ اس نے ایک دفعہ جتاتے ہوئے انداز میں دو دن کی چھٹی مانگی تاکہ وہ روبی کی شادی کا فنکشن کور کر سکے اور جے پی نے بلا تامل اسے چھٹی دے دی۔ اگر روبی شکایت کر دیتی تو معاملہ کہاں جا پہنچتا، جے پی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''میں کچھ دن میں تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔'' اس نے ایپرن اتارتے ہوئے اسی جتانے والے انداز میں جے پی کو یاد کروایا تھا۔ اس نے محض سر ہلا دیا۔

وہ ٹرنچ کوٹ پہنے، بالوں کو گول مول کر کے کیچر میں لگائے جس وقت شاپ سے نکلی، ماہر فرید سامنے مال کی راہداری میں آتا دکھائی دیا۔

''آج تمہارا باڈی گارڈ نظر نہیں آ رہا؟''

وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ سیاہ پینٹ۔ سفید شرٹ۔ جیبوں میں ہاتھ۔ ماتھے پر بکھرے بال اور بڑھی شیو۔ کیا اس کے پاس پہننے کے لیے ان دو رنگوں کے سوا کچھ نہ تھا؟

''وہ مجھے دھوکہ دے کر بھاگ گیا ہے۔'' مالا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سامنے والی شاپ کو دیکھا جہاں کیف جمال بیٹھا کرتا تھا۔

''لیکن اس نے یہ پہلی دفعہ نہیں کیا۔'' اگلا فقرہ اس نے قدرے زور سے کہا تھا۔

ماہر نے جیبوں سے ہاتھ نکال کے اٹھا دیے۔

''میں کیسے بھول گیا تھا کہ ہر بات میں پہلا قصور ماہر فرید کا ہوتا ہے؟''

وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ ماہر نے ایک نظر کافی شاپ کے شیلف کو دیکھا۔ شیلڈن کے گملے

تلے کوئی نوٹ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔

"اس دفعہ کتنا نقصان کر کے گیا ہے؟"

وہ مال کی راہداری میں آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔

"اس کا دیا نقصان میں تول یا گن نہیں سکتی۔"

"ہم اس کو ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ ملک سے باہر نہیں گیا ہوگا۔ اس جیسا انسان کینیڈا آ کے یونہی واپس نہیں جاتا۔"

"جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی، بتا دوں گی۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ مال کی راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔ چند لمحے یونہی پھسل گئے۔ اس کی خاموشی پہ وہ جیسے زچ ہوگئی۔

"تم کیا سارے شہر کی کافی شاپس بند ہوگئی تھیں جو یہاں آئے ہو؟"

"زیاد سلطان!"

وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ماہر دو قدم پیچھے تھا۔ اس کے ان الفاظ پہ وہ رک گئی۔

"کیا؟" چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

"مجھے زیاد سے ملنا ہے۔" وہ وہیں کھڑا تھا۔ سنجیدہ۔ قطعی انداز۔ وہ فیصلہ کر کے آیا تھا۔

"کیوں؟" اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیونکہ وہ ہلال کے بارے میں جانتا ہے۔ وہ سرکار کو جانتا ہے۔" وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ رکا۔

"ارے ہاں۔ تم اس سے پوچھو گے اور وہ فوراً سب سچ بتا دے گا۔" مالا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"پوچھنے پہ سب سچ نہیں بتاتے، جانتا ہوں۔" وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کیا اسے کوئی شک تھا؟

"میں تمہیں اس کا نمبر بھیج دیتی ہوں۔ جو کرنا ہے کرلو۔ میری زندگی میں اس سے بڑے مسائل ہیں۔" مالا نے چہرہ موڑ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی پلکوں کا ارتعاش دیکھ لے۔

"مثلاً؟" وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ سامنے ایک چمکتی دمکتی شاپ کی شیشے کی دیوار کو۔

"جانتے ہو ہر وقت کسی کے ریڈار کے نیچے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے؟" شیشے کی دیوار میں بہت سے جوتے سجے تھے۔ ہائی ہیلز۔ اسٹائیلیٹو۔ ایک کچے سیب کے رنگ کی بھی تھی۔ اس کی نگاہیں اس پہ جم گئیں۔

"یہ احساس کہ ہر وقت کوئی آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ آپ کو دیکھ رہا ہے۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس غور سے اس کا چہرہ دیکھے گیا۔

وہ مال کی زرد روشنیوں میں مزید زرد دکھائی دیتی تھی۔ کیا وہ بیمار تھی؟ اس کی آنکھوں تلے حلقے تھے۔ چہرہ میک اپ سے پاک تھا اور زخموں کے نشان اب مندمل ہو چکے تھے۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی۔ وہ پریشان تھی۔ یا شاید چوکنی۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ سبرینہ درست کہتی تھی۔ وہ جو سارے زمانے کے انسانوں کو پڑھ سکتا تھا، اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کا لینس دھندلا جاتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے سنا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے بس وہی سنا جو وہ پوچھ رہا تھا۔

مالا نے دھیرے سے سر جھٹکا۔

"مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ چلو گے؟"

اگلے چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ وہ ایک شاپ میں داخل ہوئی۔ سیدھی ایک ریک تک گئی۔ مطلوبہ شے اٹھائی۔ ایک سفید پیکٹ۔ اور کاؤنٹر تک چلی آئی۔ بل پے کر کے وہ باہر نکل آئی۔ وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کیے گیا۔

"ونرز" میں داخل ہونے تک وہ نہیں بولی۔ بس ایک کپڑوں کے سیکشن تک آئی۔ وہاں بہت سے ڈریسز ہینگرز سے آویزاں کیے گئے تھے۔ بیسیوں ڈریسز بھنسے بھنسے سے۔ ایک ایک ہینگر نکالنے میں توانائی لگتی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ

ڈالے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیف غائب ہو گیا ہے۔" وہ ہینگرز الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ وہ مختلف شرٹس اور ٹاپس تھے۔
"تم بتا چکی ہو۔ پھر؟"
"اس نے ایک لڑکی کا اہم دن خراب کر دیا ہے۔ ہفتے کو اس کی شادی ہے۔ وہ اتنی جلدی نیا فوٹو گرافر ارینج نہیں کر سکتی۔"
مالا نے ایک ہینگر نکالا۔ تنقیدی نظروں سے اس پر لٹکا ٹاپ دیکھا۔ پھر واپس لٹکا دیا۔ اور اگلے ہینگرز کھنگالنے لگی۔ وہ اس کے دائیں جانب کھڑا تھا۔ مالا کا نیم رخ اس کے سامنے تھا۔ ماتھے پر بل۔ غصہ۔ بے بسی۔
"پھر؟"
"پھر یہ کہ میں نے اس کا فنکشن کور کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر اس کی طرف پلٹی۔
"لیکن تم فوٹو گرافر نہیں ہو۔" وہ چونکا۔
"فوٹو گرافر تو تم بھی نہیں تھے۔" ایک جتاتی نظر اس پہ ڈال کے وہ واپس ریک کی طرف پلٹ گئی۔ ماہر نے گہری سانس لی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ہر بیس منٹ بعد اس کی ایک غلطی کا طعنہ اس کو نہ دے؟
"تم اس کا فوٹو شوٹ کیوں کرو گی؟ وہ اپنا بندوبست کر لے گی۔ چھوڑو۔"
"مجھے پیسے چاہئیں۔ میں نے جے پی کی رقم ادا کرنی ہے۔"
"پیسے کمانے کے اور طریقے بھی ہوتے ہیں، مالا۔"
اس نے ہینگر نکالتے ہوئے ایک خفا نظر ماہر پہ ڈالی۔
"میرے ابا میرے لیے فرید ہولڈنگ چھوڑ کے نہیں گئے تھے، ماہر بے۔" ہینگر پر آویزاں لباس اونچا اٹھا کے دیکھنے لگی۔ نیلے اور سبز رنگ کا ٹائی اینڈ ڈائی نرم کپڑے کا میکسی ڈریس جس کے گریبان پر قطار میں بڑے بڑے گول بٹن لگے تھے۔
"لیکن تم فوٹو گرافر نہیں ہو۔" اس نے نرمی سے یاد دلایا۔
"اس کو فوٹو گرافی نہیں چاہیے۔ اس کو کچھ اور چاہیے"
"کیا؟"
اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اب قد آور آئینے کے سامنے کھڑی، اس نیلے سبز لباس کو کندھوں پر رکھ کے دیکھ رہی تھی۔ میکسی کا گھیرا اس کے ٹخنوں کو چھو رہا تھا۔
"یہ لے لوں؟"
وہ چونکا۔ وہ ابھی تک آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے ماہر سے اس کی رائے مانگی تھی۔
"ہوں۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ سیاہ اور سفید کے سوا سارے رنگ ایک جیسے تھے۔ البتہ سرخ ہوتا تو۔ خیر۔ وہ اس کو مزید ناراض نہیں کر سکتا تھا۔
"تمہیں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔ وہ لڑکی کوئی بھی فوٹو گرافر ڈھونڈ لے گی۔"
وہ کاؤنٹر پہ پے منٹ کر کے، شاپنگ بیگ لیے اس تک آئی تو وہ پھر سے کہنے لگا۔ مالا نے بس ایک ناراض نظر اس پہ ڈالی۔
"مجھے پیسے چاہئیں۔" اپنی بات دہرائی۔ وہ کچھ کہنے لگا، پھر رک گیا۔
"مگر تمہیں ایک کیمرہ چاہیے ہو گا۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ زندگی میں کچھ کام بہت مشکل تھے۔ کشمالہ نبین کو اس کی مرضی کے خلاف کچھ منوانا ان میں سے ایک تھا۔
"صرف کیمرہ نہیں۔"
وہ لباس کو بازو پر فولڈ کیے اس کی طرف پلٹی۔
"مجھے ایک سیکنڈ فوٹو گرافر بھی چاہیے۔"
اس سارے دن میں پہلی دفعہ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔
ماہر فرید نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔

"چلو دو کیمرے رینٹ پر لیتے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کے شاپ کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔

اس کو ہفتے کے دن بہت سے کام کرنے تھے لیکن وہ اپنا شیڈول خالی کر سکتا تھا۔ مالا نے اسے پہلی دفعہ ایک کام کہا تھا۔ وہ اس کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔

شاید وہ اس کی غلطی معاف کرنے کو تیار تھی۔ شاید وہ اس پہ اعتبار کرنے کو تیار تھی۔

یا شاید وہ اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس کی آنکھ کا عدسہ پھر سے دھندلا رہا تھا۔

☆☆☆

روبی کی شادی کا انتظام کھلی فضا میں ایک سبزہ زار پر کیا گیا تھا۔ دو قطاروں میں کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک سفید پھولوں اور سبز پتوں سے سجا پلیٹ فارم تھا۔ وہاں بہت سی میڈز آف آنر قطار میں کھڑی دلہن کا انتظار کر رہی تھیں۔ مالا ان سے ہٹ کے سبزہ زار پہ کھڑی، منتظر نگاہوں سے داخلی دروازے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے مہمان اندر آ رہے تھے۔ کیمرے کا اسٹریپ گردن میں لٹکائے، بالوں کو جوڑے میں باندھے، وہ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے ہوئے تھی۔ آج موسم قدرے گرم تھا لیکن یہ وین کو ور تھا۔ چند منٹ میں ٹھنڈ ہو سکتی تھی۔

"تم لیٹ ہو۔"

جب وہ دروازے سے اندر آتا دکھائی دیا تو وہ خفا سی بولی۔ اس نے سفید ہڈی پہن رکھی تھی اور کندھوں پر ایک بیک پیک تھا۔ آنکھوں پہ سن گلاسز اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

"خوش قسمتی سے میرے باپ نے میرے لیے فرید ہولڈنگ چھوڑی تھی۔ اور مجھے اس کے کام ختم کرتے کرتے وقت لگ جاتا ہے۔"

وہ اس کے عین سامنے آ کے رکا۔ آنکھوں سے گلاسز اتارے۔ دھوپ اب ماہر کی پشت پہ تھی۔

"اوہ ہاں۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ تم ایک ویڈنگ فوٹو گرافر نہیں ہو، جس کا نام کیف تھا۔" اس نے اپنے کیمرے کو سیدھا کرتے ہوئے ماہر کی جانب سے رخ موڑ لیا۔ وہ اب بھی دھوپ اور اس کے درمیان کھڑا تھا۔

"تم مجھے اس سب کے لیے معاف نہیں کر سکتیں؟"

ماہر فرید نے گہری سانس لے کر افسوس سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ "روبی ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔ اور تب وہ بولا۔

"آئی ایم سوری۔"

مالا نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ اب وہ دھوپ کی طرف تھی اور وہ سائے میں۔ وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کیف جمال بن کے تمہاری زندگی میں آنے کے لیے۔ تمہیں سچ نہ بتانے کے لیے۔ آئی ایم سوری۔"

کشمالہ نے جواب نہیں دیا۔ بس سر ہلا دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

"مجھے زیاد سے ملنا ہے۔" وہ دونوں سبزہ زار کے دہانے پر بنی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے جب وہ بولا۔

"تمہیں میری اجازت چاہیے؟" وہ جیسے اس موضوع سے احتراز برت رہی تھی۔

"مجھے اس کا نمبر چاہیے۔"

"بھیج دوں گی۔"

"بھیجنا ہوتا تو تم کل بھیج چکی ہوتیں۔ مگر تم نہیں چاہتیں کہ میں اس سے ملوں۔"

"تم اس سے مل کے کیا کرو گے؟" اس نے قلعے نما عمارت کا دروازہ کھولا۔ اندر باہر کی نسبت نیم اندھیرا اور ٹھنڈک تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

لبنیٰ آصف





"امی! کچھ منگوانا ہے تو بتا دیں۔ ابو کی دوائیں لینے جارہا ہوں۔"

"ہاں! احمر بیٹا! میرے موبائل کا کارڈ ختم ہو گیا ہے لیتے آنا۔"

"امی! اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو ڈالا تھا۔"

"ہاں! ختم ہو گیا بیلنس تمہاری آپیوں کی خیریت لیتی ہوتی ہے۔ خاندان میں بھی خیر خیریت لیتی ہوتی ہے۔ جانا تو مشکل ہوتا ہے۔ فون پر ہی پوچھ لیتی ہوں۔"

"امی! ویسے تو آپ کا بہت بیلنس خرچ ہو رہا ہے۔ آپ پیکج کر کے بات کرلیا کریں۔ اس طرح بیلنس بھی کم لگے گا اور آپ بے فکر ہو کر بات بھی کرلیں گی۔"

"پیکج کیسے ہوتا ہے؟"

"امی! پیکج دو گھنٹے کا ہوتا ہے آپ اپنے نیٹ ورک پر دو گھنٹے میں جتنی جگہ فون کرنا ہو کر لیجیے گا۔ دونوں آپیوں کا، خالہ، ماموں سب کا نیٹ ورک آپ والا ہی ہے۔"

"اچھا! پہلے کیوں نہیں بتایا؟" ابھی تو کارڈ لا دو۔ پھر مجھے سمجھا دینا۔ ہفتے میں ایک دن کر کے سب کی خیر خیریت لے لوں گی۔"

پھر احمر نے کارڈ لا کر دیا اور پیکج کا ٹائم اور طریقہ بھی سمجھایا کہ اسٹار اور یہ نمبر دبائیں گی تو تھوڑی دیر بعد میسج میں درخواست موصول ہونے کی اطلاع دی جائے گی۔ پھر دوسرا میسج رقم کٹنے اور ٹائم کا ہوگا۔ بس پھر اگلے دو گھنٹے آرام سے کال کیجیے گا۔

آج سویرے ہی سارا کام جلدی جلدی نمٹایا۔ میاں صاحب صبح سے مصروفیت کا جائزہ لے رہے

تھے۔

"خیریت بیگم! آج صبح سے بڑی تیزی سے کام کر رہی ہیں۔ کہیں جانا ہے کیا؟"

"نہیں، آج پیکیج کر کے سب سے بات کروں گی۔ کام پڑا رہتا ہے تو باتوں میں بھی دل نہیں لگتا۔"

"ارے ہم سے باتیں کریں۔ پیکج بھی نہیں کرنا پڑے گا۔"

"کتنی باتیں کروں، سارا دن آپ اور میں ہی تو ہوتے ہیں۔ بیٹا صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ بیٹیاں اپنے گھروں کی ہیں۔"

"کہاں بیگم! سارا دن تو آپ کے کام اور اخبار ہی پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

ابھی مزید کہتے کہ گھورنے پر چپ ہو گئے۔

"مردوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کچھ مصروف ہونا چاہیے۔"

"ہاں بھئی! ہمیں تو ساری عمر کام ہی کرتے رہنا چاہیے۔ آرام کرتے برے لگتے ہیں ناں!"

☆☆☆

کام ختم ہوئے تو جلدی سے احمر کے بتائے طریقے سے پیکج کرنا شروع کیا۔ پہلا میسج درخواست موصول ہونے کا ملا۔ دوسرا میسج رقم کٹنے کا۔

"ارے واہ! سات روپے میں دو گھنٹے آرام سے بات کرو۔ یہ تو اچھا ہے۔ چلو پہلے اریبہ کو کرتی ہوں فون۔"

"ہیلو! السلام علیکم امی! کیسی ہیں! میں خیریت سے ہوں۔"

"تمہیں تو فرصت ہی نہیں کہ ماں کا حال پوچھ لو۔"

"کیا کروں امی! گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ ابھی کچن صاف کر کے فارغ ہوئی ہوں۔ اب کھانا پکانے جا رہی ہوں۔ بچے آجائیں گے ڈیڑھ بجے۔"

"آج احمر نے پیکیج کا بتایا تھا، وہی کیا تھا کہ تم سے بات کروں گی۔"

"آج کیوں کر لیا امی! پیکیج۔ آج تو بالکل فرصت نہیں۔"

"جاؤ جاؤ! کھانا پکاؤ! بچے آنے والے ہوں گے۔"

"خدا حافظ۔" اریبہ نے تو تین منٹ میں ہی فارغ کر دیا۔

"چلو! شفق کو ملاتی ہوں ایک تو یہ بریسٹ کینسر کی تفصیلات۔ اٹھالے شفق فون! سینے میں درد محسوس ہونے لگا۔ گلٹیاں سی محسوس ہونے لگیں۔"

خیر اللہ اللہ کر کے چھوٹی نے فون اٹھایا۔

"کہاں تھیں! بھئی؟"

"اماں چھوٹے کا ڈائپر بدل رہی تھی۔ ہاتھ گندے تھے۔"

"دھو لیے ہاتھ! بدل لیا ڈائپر۔"

"جی جی امی!"

"کیا حال ہیں۔ میاں بچے سب کیسے ہیں؟"

"ارے کیا بتاؤں امی! پوری رات منے نے سونے نہیں دیا ہے۔ پوری رات وقفے وقفے سے موشن کرتا رہا ہے۔ صبح سے بھی مستقل روئے جا رہا ہے۔ ڈاکٹر نے ہر تھوڑی دیر بعد او آر ایس دینے بولا ہے کہ پانی کی کمی نہ ہو جائے۔

سارا کام پڑا ہوا ہے۔ ساگودانہ بولا ہے ڈاکٹر نے دینے کے لیے وہی پکانے جا رہی تھی۔"

"جاؤ! بھئی پکاؤ۔ ٹھیک ہے — اللہ حافظ۔

دو گھنٹے۔ یہاں تو دونوں بیٹیوں نے دو، دو منٹ میں ہی فارغ کر دیا۔

"ارے آپا کو کرتی ہوں۔ بڑے دن ہو گئے۔ سلام آپا! ہاں وعلیکم السلام۔"

"کیسی ہو رضوانہ۔"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں آپا!"

"میں تو ٹھیک نہیں ہوں۔ گھٹنوں کا درد اتنا بڑھ

گیا ہے۔کل لے کر آئی تھی دوا۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا کہا ہے۔ مگر میری جان کو سکون کہاں۔ شام میں منزہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ ماسی نے بھی چھٹی کر لی ہے۔ بہو میکے گئی ہوئی ہے۔ آخری دن چل رہے ہیں۔ ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا۔ اپنی امی کے ساتھ جائے گی۔ میرے تو گھٹنوں میں درد اتنا ہے کہ گھر میں چل لو، وہی بہت ہے۔ منزہ یونیورسٹی گئی ہے۔ آج آخری سمسٹر کا دوسرا پیپر ہے۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہاں سے کام شروع کروں۔ فکر سے سانس لینا بھی محال لگ رہا ہے۔

''جائیں آپا! آپ کام دیکھ لیں۔''

''ہاں بھئی مہمانوں کو بھی پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے آپا۔

خدا حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔''

''آج تو ایسا لگتا ہے سب مصروف ہیں۔ آئے ہائے ابھی تو ایک گھنٹہ چالیس منٹ باقی ہیں۔ اب کس کو کروں۔ ارے بھائی صاحب کو کرتی ہوں۔ بھائی سے تو بات کیے کافی ٹائم ہو گیا۔ ہے بھی نیٹ ورک میرا والا۔''

''سلام بھائی!''

''کون رضوانہ؟ کیسے یاد کر لیا آج۔ سورج کہاں سے نکلا ہے آج؟ تم نے کیسے کر لیا آج فون! تم تو کبھی کرتی نہیں ہو فون۔''

دل میں تو آیا کہہ دیں۔

اور آپ کون سا بہن کی خیریت پوچھتے ہیں۔ فون کر لیا تو گلے باتیں سنانے۔ سوچا لیکن کہا پھر نہیں۔

''بس بھائی! یاد آ رہے تھے آج بہت۔ آنا تو مشکل ہے، سوچا فون کر لوں۔''

''ہاں، اچھا کیا، گھر میں سب خیریت ہے ناں؟''

''جی جی۔ سب خیریت ہے۔''

''چلو رکھتا ہوں فون۔ آج آنکھوں کے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے۔ ابھی نکلوں گا تو وقت سے پہنچوں گا۔ کراچی کا ٹریفک پتا تو ہے تمہیں۔''

''جی جی! بھائی جائیں آپ۔ اللہ نگہبان۔''

ایک بار پھر ذلت مقدر بنی۔

''بھاڑ میں جائیں منٹ! کوئی منہ لگا نہیں رہا۔ سات روپے میں ایسے لگ رہا ہے۔ ذلت خرید لی ہے۔ مگر اب ذلیل ہونے کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔'' منہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ ''سب ہی مصروف ہیں! بس ہم ہی فارغ بیٹھے ہیں۔''

''کیا ہوا بیگم!''

''کچھ نہیں سات روپے میں جی بھر کر ذلیل ہو گئے۔ کسی نے منہ نہیں لگایا۔ سب مصروف ہیں۔ آنے دو اس احمر کے بچے کو۔ پیکج کر لیں۔ بڑی بچت ہو گی۔ ماں کو ذلیل کروا دیا۔''

''ارے اس بچارے کا کیا قصور! وہ تو تمہاری ہی بھلائی میں کہہ رہا تھا۔ ویسے مان لیں بیگم! سب جگہ سے ہار کر آپ ہماری طرف ہی آتی ہیں۔ ایک ہم ہی بیٹھے بچائے آپ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ مگر آپ ہمیں لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔''

''ارے بھئی، کتنی کرواؤں لفٹ۔ صبح ناشتہ بنا کر دیا۔ کھانا پسند کا بتایا ہے۔ چلتے پھرتے آپ سے ہی تو بات کرتی ہوں۔ پھر بھی آپ کی شکایتیں ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اب کیا ہیروئن بن جاؤں۔ گانا گاؤں آپ کے لیے۔ دیوار میں چن جاؤں انار کلی کی طرح تب مانیں گے آپ!''

''ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے بیگم!''

میاں بیوی کی ہنسی ایک ساتھ کمرے میں گونجی تھی۔

ثابت ہوا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہیں۔

☆☆



ہاتھ خالی ہیں ترے شہر سے جاتے جاتے
جان ہوتی تو مری جاں لُٹاتے جاتے

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

اب کے مایوس ہوا یاروں کو رخصت کر کے
جا رہے تھے تو کوئی زخم لگاتے جاتے

رینگنے کی بھی اجازت نہیں ہم کو ورنہ
ہم جدھر جاتے نئے پھول کھلاتے جاتے

میں تو جلتے ہوئے صحراؤں کا اک پتھر تھا
تم تو دریا تھے مری پیاس بجھاتے جاتے

مجھ کو رونے کا سلیقہ بھی نہیں ہے شاید
لوگ ہنستے ہیں مجھے دیکھ کے آتے جاتے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

راحت اندوری

شام ہو اگر

بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل، اسی لمحے بچھڑتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دو گے
جدا ہیں راستے اپنے
مگر تم حوصلہ رکھنا
بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل، اسی لمحے بچھڑتے ہیں

فاخرہ بتول

جنتر منتر، دھاگے شاگے، جادو ٹونے والوں نے
تیری خاطر کیا کیا سیکھا، تجھ کو کھونے والوں نے

ایک طلسمی سرگوشی پر میں نے مڑ کر دیکھا تھا
مجھ کو پتھر ہوتے دیکھا پتھر ہونے والوں نے

اچھے کی امید پہ کتنے مشکل دن کٹ جاتے ہیں
خواب محل کے دیکھے اکثر خاک پہ سونے والوں نے

کتنی ماؤں نے بچوں کو باتوں میں الجھایا تھا
گلیوں میں آوازیں دی ہیں جس وقت کھلونے والوں نے

ایک طرف تو یادیں تھیں اور ایک طرف ویرانی تھی
دیکھ فضا افسردہ کر دی کرب سے رونے والوں نے

اسم یار کا ورد وظیفہ کر کے وقت گزارا ہے
تسبیح ایک بنا دی تیری یاد پرونے والوں نے

کومل جوئیہ

سر بہر حال جھکا، ہم نے قناعت کی تھی
اک تری بار ہی بس رب سے شکایت کی تھی

اس قدر سخت سزا بھی تو نہیں بنتی تھی
ہم نے بچپن سے نکلنے کی شرارت کی تھی

ہوش والوں کی نہ باتوں میں ہم آئے کبھی
ورنہ ہر اک نے سنبھلنے کی ہدایت کی تھی

معتبر تھے کبھی دنیا کی نظر میں ہم بھی
پھر ہوا یوں کہ مری تم نے حمایت کی تھی

ہم نے مانا کہ چلو مرکزی مجرم ہم ہیں!
کچھ دنوں تم نے بھی ہم سے محبت کی تھی

بے وفاؤں سے وفا خبط ہے لاحاصل سا
ہمیں معلوم تھا پھر بھی حماقت کی تھی

نفع نقصان کی باتیں نہیں تھیں ہم کو
ہم نے کب یار ترے ساتھ تجارت کی تھی

کیوں زبانوں پہ فقط نام ترا ہے ابرک
تم سے پہلے بھی تو کتنوں نے بغاوت کی تھی

اتباف ابرک

شگفتہ جاہ



نیک اولاد

میت کے لیے زندوں کی طرف سے نفع بخش چیز اس کے لیے دعائے استغفار کرنا ہے۔ جس طرح زندہ انسان کھانے پینے کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح مردے دعا کے انتہائی محتاج ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ عزوجل جنت میں نیک آدمی کا درجہ بلند فرمائے گا تو آدمی عرض کرے گا۔ "یا اللہ یہ درجہ مجھے کیسے حاصل ہوا؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "تیرے بیٹے نے تیرے لیے استغفار کیا تھا۔"

(مسند احمد)

اس کے علاوہ نیک اولاد کے اعمال کا ثواب بھی بغیر نیت کے والدین کو پہنچتا رہتا ہے۔

اولاد کو قرآن وسنت کا تابع بنا کر مرنے والا قیامت تک اس کی کمائی کو وصول کرتا رہے گا۔

صحابہ کرام کو برا کہنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو میرے صحابہ کو برا کہے گا اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔"

نصیحت

اگر کسی ملازم کو برطرف کرنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ بات اچھی طرح سوچ سمجھ لینی چاہیے کہ ملازمین کو برطرف کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔

(ارسطو کی سکندر اعظم کو نصیحت)

اچھا منصف

جج کے لیے چار باتیں لازمی ہیں۔

(1) غور سے سنے

(2) عقل مندی سے جواب دے

(3) سنجیدگی سے سوچے

(4) غیر جانب داری سے فیصلہ سنائے

بیماری

ارشد میاں اسکول لیٹ پہنچے تو ان کی ٹیچر نے وجہ پوچھی۔ ارشد میاں بولے۔

"امی بیمار تھیں۔ انہیں ہاسپٹل لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا ناشتا خود بنانا پڑا۔ اس لیے دیر ہوگئی۔" ٹیچر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری امی کو کہیں چھوت کی بیماری نہ ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ بیماری ہمیں بھی لگ سکتی ہے۔ فوراً گھر جاؤ اور کل اس بیماری کے بارے میں اچھی طرح پوچھ کر کلاس میں آنا۔"

دوسرے روز ارشد میاں نے کلاس میں آ کر بتایا۔

"امی کہہ رہی تھیں اگر آپ شادی شدہ نہیں ہیں تو یہ بیماری آپ کو نہیں لگ سکتی کیونکہ میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا ہے۔"

ترکی ڈرامہ سیریلز دیکھنے کی شوقین

"انوشہ: مبارک ہو زوبی پوتے کی، کیا نام رکھا ہے؟"

زوبی: "باریفائزان!"

انوشہ: "ارے اس کا کیا مطلب ہے، بہن؟"

زوبی: "اے بی بی! اس کا مطلب ہے ڈوبتے سورج کے وقت حیران و پریشان ہدہد کی کھانسی۔ اچھا بہن تمہارے گھر بھی خیر سے پوتی آئی ہے، کیا نام رکھا ہے اس کا۔"

انوشہ: ارتاناش!

زوبی: (ذرا، چلبلا کر) "ارتاناش اس کا کیا مطلب ہوا بھلا؟"

انوشہ: "اس کا مطلب ہے خوبانی کے خشک

پتوں کی وہ آواز جنہیں شام کے وقت بکری کا چھوٹا سا بچہ منہ مار رہا ہے۔"

بڑھاپا

سبحان صاحب کو پورے پچاس برس بعد اپنا کلاس فیلو اچانک بازار میں نظر آیا تو وہ بڑے جوش سے اس کی جانب لپکے۔
"ارے مشتاق! تم تو بالکل بوڑھے ہو گئے ہو۔"
مشتاق صاحب نے آنکھیں چندھیاتے کہا۔
"معاف کرنا باباجی! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

قابل دید

خاتون نے ایمرجنسی نمبر پر ایمبولینس کو فون کیا۔
آپریٹر نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "یس پلیز"
خاتون نے کہا۔ "میرے پاؤں کی انگلی چائے کی میز سے ٹکرا گئی ہے۔"
آپریٹر ہنستے ہوئے بولا: "اور اس کے لیے آپ ایمبولینس بلانا چاہتی ہیں؟"
خاتون نے کہا: "نہیں ایمبولینس، تو میرے شوہر کے لیے۔ انہیں ہنسنا تو نہیں چاہیے تھا نا۔"

دشمن سے سلوک

خلیفہ منصور کا قول ہے
جب دشمن تیری طرف ہاتھ بڑھائے تو اگر تجھ میں طاقت ہے تو اس ہاتھ کو کاٹ ڈال ورنہ اسے چوم لے۔

شعر

دشت وفا میں پیاس کا عالم عجیب تھا
دیکھا تو ایک درد کا دریا قریب تھا

جھوٹی دنیا

جھوٹی دنیا میں ووٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہو جائے گا اور برے آدمی کو ووٹ دینے والا بھی برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

(واصف علی واصف)

بانو قدسیہ کہتی ہیں

خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، وہ خوف زدہ رہتے ہیں۔
(مرد ابریشم سے اقتباس)

محبت اور غم

"محبت اور غم سے اداسی ضرور پیدا ہو گی وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔"

(اشفاق احمد)

زرد موسم

محبت جب کسی دل میں گھر کر جائے تو وہاں زرد موسم بسیرا کر لیتا ہے۔ یک طرفہ محبت تو اور بھی ستم ڈھاتی ہے خصوصاً لڑکیوں پر جو اظہار نہیں کر سکتی ہیں چپ چاپ سلگتی رہتی ہیں۔

اقوال زریں

☆ بہادر: مقابلے کے وقت آزمایا جاتا ہے
☆ مستقل مزاج: مصیبت کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆ امانت دار: مفلسی کے وقت آزمایا جاتا ہے
☆ عورت کی محبت: فاقہ کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆ بردبار: غصہ کے وقت آزمایا جاتا ہے۔
☆ شریف: معاملہ ٹوٹنے کے وقت آزمایا جاتا ہے۔

نہ جانے

برباد جس کو تو نے پرکھنے میں کر دیا
لمحہ وہ آزمائش حسن نظر کا تھا
جانے وہ کوئی موڑ کہاں پر ہے مڑ گیا
زاہد وگرنہ راستہ میرے ہی گھر کا تھا

☆☆

امت الصبوح

آنچل کی ڈائری

روحیلہ خان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں لکھی پروین شاکر کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کو بھی یقیناً پسند آئے گی۔

گلاب ہاتھ میں ہو، آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبت کا استعارہ ہو

میں گہرے پانی کی اس رو کے ساتھ بہتی رہوں
جزیرہ ہو کہ مقابل کوئی کنارہ ہو

کبھی کبھار اسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو

قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبتوں میں جو احسان ہو! تمہارا ہو

یہ اتنی رات گئے کون دستکیں دے گا
کہیں ہوا کا ہی اس نے نہ روپ دھارا ہو

افق تو کیا ہے، در کہکشاں بھی چھو آئیں
مسافروں کو اگے چاند کا اشارہ ہو

میں اپنے حصے کے سُکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

اگر وجود میں آہنگ ہے تو وصل بھی ہے
میں چاہے نظم کا ٹکڑا، وہ نثر پارہ ہو

پروین شاکر

روبینہ کی ڈائری سے

کلیم عاجز کی شاعری میں روایتی غزل کا عکس بھی نظر آتا ہے اور جدت کے رنگ بھی یہ چیز ان کی شاعری کو موجودہ دور کے شاعروں سے علیحدہ مقام دیتی ہے۔ ان کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

یہ ہنسی خوشی کا موسم، یہ بہار کا زمانہ
تیرے واسطے حقیقت، میرے واسطے فسانہ

تیری بات سب نے مانی، تیرا حال سب نے جانا
میرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ

نہ سنبھل سکی تجھ سے تیری زلف کا یہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

میری خانہ خرابی کا جہاں میں ہے فسانہ
یہ وہ حادثہ تھا جس کو نہ بھلا سکا زمانہ

نگاہ باغباں میں کچھ اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں، جلا ہے آشیانہ

تجھے اے غم محبت، ادھر آ گلے لگا لوں
نہ تیرا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ہوں وہ غریب عاجز کہ گلوں کی انجمن میں
میرے پیراہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے آشیانہ

سحر احمد کی ڈائری سے

چھوٹی بحر کی غزل کہنے میں جون ایلیا کا جواب نہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں روزمرہ محاوروں کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ ان کی یہ غزل پڑھیے آپ کو پسند آئے گی۔

زخم امید بھر گیا کب کا
قیس تو اپنے گھر گیا کب کا

اب تو منہ اپنا مت دکھاؤ مجھے
ناصحو! میں سدھر گیا کب کا

آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں
دل مری جان! مر گیا کب کا

آپ اک اور نیند لے لیجیے
قافلہ کوچ کر گیا کب کا

میرا فہرست سے نکال دو نام
میں تو خود سے مکر گیا کب کا

حبیبہ خان کی ڈائری سے

ہماری معاشرتی اقدار جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں، اسی لیے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اظہر عنایتی کی یہ غزل ان ہی جذبوں کی عکاس ہے۔

جب تک سفید آندھی کے جھونکے چلے نہ تھے
اتنے ہمارے پیڑوں کے پتے گرے نہ تھے

اظہار پر تو پہلے بھی پابندیاں نہ تھیں
لیکن بڑوں کے سامنے ہم بولتے نہ تھے

ان کے بھی اپنے خواب تھے، اپنی ضرورتیں
ہمسائے کا مگر وہ گلا کاٹتے نہ تھے

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

اظہر میرے بزرگ اٹھاتے تھے جب ہاتھ
اپنے لیے ہی صرف دعا مانگتے نہ تھے

زینب ظفر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں بھی "شمشاد پرنم" کی یہ نظم آپ سب کی نذر ہے۔

شام کی خنکی کیسی ہے

چھت پر پھیلا سرمئی سکون، سرمئی آسمان!
اور میرے دھیان کا سفید کبوتر......
انجانی منڈیر پر جا بیٹھا ہے
آج پرندے کہاں گئے ہیں
سارے جیسے روٹھ گئے ہیں
اور میری چشم تخیل کی آغوش میں یادوں کا بھورا سا صندوق
ڈھکن اٹھایا اور سنہری دھند کے ہلکے ہلکے بادل
میرے چاروں سمت میں جیسے پھیل گئے ہیں
جیسے خوشبو۔۔۔ جیسے جادو یاد کے کوہ قاف سے آ کر خواب کی پریاں
میرے گرد گھیرا ڈالے بیٹھ گئی ہیں
پریوں کی گلابی شفاف ہتھیلیوں پر آرزو کی سبز حنا سے
سرخ مہکتے رنگوں میں یہ کیا لکھا ہے میں کیا جانوں
شام میں رات کے تارے کہاں سے آ بکھرے ہیں
ایسے تارے؟ اتنی خوشبو؟ اتنی خنکی؟
دھیان سے چونک کے دیکھا تو۔۔۔ میں چھت پر تنہا بیٹھی تھی

آمنہ زاہد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں موجود "مبشر ہوا" کی میری پسندیدہ غزل آپ سب قارئین کی نذر۔

یقین و گماں بیچ کہیں اٹکا ہوا لگا
وہ شخص اب ملا تو بھٹکا ہوا لگا

لہجہ جو تھا کبھی کسی سمندر سا موجزن
لہجہ بھی اس کا ٹھہرا ہوا لگا

خود بھی کبھی میں گزرا تھا کسی ایسے کرب سے
سو آج مجھے یہ سب بھی دیکھا ہوا لگا

پھر اس سے ہو گئی مجھے محبت ایک بار
کہ وہ شخص مجھ کو مجھ سا ہی ٹوٹا ہوا لگا

مجھ سے گلے ملا وہ بڑے ضبط سے ہوا
لیکن وہ دل کی دھڑکنوں سے رویا ہوا لگا

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

ثمن لیاقت

س۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

ج۔ میں کوئی بھی ڈش بناؤں اپنے بچوں کی پسند کا خصوصی دھیان رکھتی ہوں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کھانا ٹیسٹی اور غذائیت سے بھرپور ہو۔ کھانا خوش رنگ بھی ہو تو کیا بات ہے؟ میرے شوہر چند مخصوص ڈشز ہی پسند کرتے ہیں ان کی چوائس کے مطابق علیحدہ کھانا بنتا ہے۔

س۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کھانے کا وقت ہے ایسی ڈش جو فوری تیار ہو جائے؟

ج۔ گھر میں کبھی اور کسی وقت بھی مہمان آجائیں۔ میں بالکل نہیں گھبراتی ماشاء اللہ پکانے کی اسپیڈ اتنی ہے کہ مشکل سے مشکل کھانا بھی منٹوں میں تیار۔ کوفتوں کی ایکسپرٹ ہوں لیکن یہاں ایک آسان ڈش کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ جو اچانک مہمان آنے پر پیش کی جاسکے۔

چکن پلاؤ

چکن	ایک کلو
چاول	تین پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چمچہ
لال مرچ	ایک چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
گرم مسالا	کھانے کا چمچہ
دہی	ایک پیالی
ٹماٹر، ہری مرچ	حسب ضرورت
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چکن کو فرائی کرکے رکھ لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے پیاز کاٹ کر ڈال دیں براؤن ہونے پہ ادرک لہسن پیسٹ ڈال کر تھوڑا بھونیں پھر پانی کا چھینٹا دے کر اس میں ٹماٹر، ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔ نمک، سرخ مرچ، ہلدی، دہی اور گرم مسالا ڈال کر بھونیں جب دہی نظر نہ آئے تو اس میں چاولوں کے مطابق یعنی تین گلاس چاول ہیں تو پانچ گلاس پانی ڈال دیں۔ ابال آنے پر چاول ڈال دیں۔ جب ایک کنی رہ جائے فرائی کیا ہوا چکن ڈال کر دم پہ رکھ دیں۔ دس منٹ بعد مزے دار چٹپٹا چکن پلاؤ تیار ہے۔ رائتے اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

س۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے؟ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ بکھری ہوئی چیزیں ساتھ ساتھ سمیٹتی جاؤں، یہ عادت اس حد تک

ہے کہ صائمہ (چھوٹی بہن) کہتی ہے ابھی چیزیں استعمال کرنی تھیں بیگم صاحبہ نے اٹھا کر رکھ بھی دی ہیں۔ صفائی کا خبط تو ہے مگر حتی الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ کچن صاف رہے۔

س۔ صبح کا ناشتہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج۔ ناشتہ جسم کے لیے پیٹرول کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ میں ناشتے میں بچوں کو انڈا، پراٹھا یا سینڈوچ بنا کر دیتی ہوں ہم میاں بیوی رات کے سالن کے ساتھ پراٹھا کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن چھٹی کے دن ایک خاص چیز ضرور بناتی ہوں ترکیب لکھ رہی ہوں۔

وائٹ پراٹھا

میدہ	تین پیالی
آٹا	ایک پیالی
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
انڈا	ایک عدد
دودھ گرم (ابلا ہوا)	ایک پیالی
گھی یا آئل	آدھی پیالی سے کچھ کم

ترکیب:۔

میدے اور آٹے میں نمک، میٹھا سوڈا، گھی، انڈہ ڈال کر گرم دودھ سے گوندھ لیں۔ پھر نارمل سائز کے پیڑے بنا کر روٹی بیل لیں۔ توے پہ روٹی کی طرح پکائیں۔ بہت لذیذ اور خستہ وائٹ پراٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنے کے سالن یا کسی بھی سالن کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔

س۔ گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج۔ اکثر تو نہیں، مگر کبھی کبھار باہر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم بھی کسی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے کھانا تو نہیں مگر فاسٹ فوڈز وغیرہ کھانے چلے جاتے ہیں۔

س۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج۔ پکوان کا مزہ موسم کے مطابق ہی آتا ہے۔ سردیوں میں گاجر کا حلوہ۔ کریلا، مچھلی کے پکوڑے کافی کے ساتھ اور گرمیوں میں مختلف فروٹ کے ملک شیک اور کدو کا حلوا بنا کر، موسم کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

س۔ اچھا کھانا بنانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج۔ ہر وہ کھانا جو محنت اور پیار سے پکایا جائے بہت لذیذ بنتا ہے۔ میں بہت محنت اور شوق سے کھانا بناتی ہوں آپ اسے میری ہابی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رضا اور جنید (میرے بھائی) کہتے ہیں، آپ کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ منٹوں میں محنت طلب کھانا بنا کر داد وصول کر سکتی ہیں۔

س۔ کچن کی کوئی ٹپ؟

ج۔ ہرے پتوں والی سبزیاں، بالخصوص ہرا دھنیا اور پودینہ اگر اخبار میں لپیٹ کر فریج میں رکھ دیں تو بہت دیر تک فریش رہتا ہے۔ ورنہ یہ چیزیں نمی سے گل جاتی ہیں۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

ویجی ٹیبل منچورین

ضروری اشیاء

چھوٹے آلو	آدھا کلو
گوبھی	آدھا کلو
گاجر	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک کپ
بینگن	ایک کپ
ہری مرچیں	چھ عدد
چکن کیوبز	دو عدد
کیچپ	ایک کپ
انڈے	چار عدد
گڑ	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	حسب ذائقہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
کالی مرچ	حسب ذائقہ
اناناس کا رس	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن	ڈیڑھ چائے کا چمچہ

ترکیب:

انڈے میں نمک، کالی مرچ اور کارن فلور ڈال کر بیٹر بنالیں۔ آلو، گوبھی، گاجر، شملہ مرچ اور بینگن باری باری اس میں ڈپ کرکے فرائی کرلیں۔ جب سبزیاں گولڈن براؤن ہوجائیں تو نکال کر کچن پیپر پر پھیلالیں۔ ایک چمچہ تیل گرم کرکے اس میں لہسن ڈال کر ساتے فرائی کرلیں۔ اس کے بعد اس میں کیچپ، چکن کیوب، گڑ، سفید مرچ، کالی مرچ، اناناس کا رس ڈال کر پکائیں، گاڑھا کرنے کے لیے ایک چمچہ کارن فلور پانی میں گھول کر ڈالیں اور اچھی طرح پکانے کے بعد اس میں سبزیاں ہری مرچیں ڈالیں، اچھی طرح گرم کرکے اور منچورین کو چاول یا چپاتی کے ساتھ سرو کریں (سوس میں نمک اگر چاہیں تو ڈالیں ورنہ چکن کیوب میں نمک موجود ہوتا ہے۔)

چکن مکھنی

ضروری اشیاء

مرغی	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
مکھن	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر پیوری	ڈیڑھ کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چکن کیوب	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
کھیرا	ایک عدد
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
کریم	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:

مرغی میں دہی، نمک، سفید مرچ، ادرک، لہسن لگا کر ایک گھنٹہ رکھیں، اس کے بعد چکن کو گرل کرلیں۔ ایک پین میں مکھن، تیل، پسے ٹماٹر، نمک، لال مرچ، چکن کیوب ڈال کر پکائیں۔ تھوڑا پکانے کے بعد گرل کی ہوئی چکن ڈالیں اور دومنٹ پکائیں۔

آخر میں ہرا دھنیا اور کریم چھڑک دیں۔ چکن مکھنی تیار ہے۔



لائبہ ایمن ______ آزاد کشمیر

میں کہیں خود کو مار آیا ہوں
میرے ذمے قصاص ہے میرا

فاکہہ سہیل ______ کراچی

جھگڑا تھا سال بھر کا جو پل بھر میں کھو گیا
میں رو پڑی تو اس نے گلے سے لگا لیا

ثمرہ ثاقب ______ گرین سٹی

گمان جس پہ رہا منزلوں کا ایک مدت
وہ رہ گزار بھی منزل پہ لا کے بھول گیا
اب اس سے بڑھ کے بھی طرز تپاک دل کیا ہو
کہ تجھ کو زیست کا حاصل بنا کے بھول گیا

اریبہ منیب ______ کراچی

جن کے لیے چراغ سر شام جل گئے
دنیا کے ساتھ وہ بھی نگاہیں بدل گئے

ندا طارق ______ فیصل آباد

روز مل کے بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے
کس پتے پر اسے تلاش کروں
شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

سحر سہیل ______ کراچی

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

اقرا انس سندھو ______ گوجرہ

اک طرف طلب تیری، اک طرف زمانہ ہے
پوچھتا ہے دل مجھ سے کس طرف کو جانا ہے
آنکھیں بے لہجہ بھی، گفتگو بھی بارودی
سوچیے شفیق، اس سے کس طرح نبھانا ہے

عائشہ ______ محراب پور

آشنا درد سے ہونا تھا کسی طور ہمیں
تو نہ ملتا تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

صدف عمران ______ اسلام آباد

میں بار غم اٹھا سکتی ہوں تنہا
مرے شانے پہ رکھ دے ہاتھ کوئی

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

محبت میں ذرا سی بے وفائی ضروری ہے
وہی اچھا۔ لگتا ہے جو دل سے توڑ دیتا ہے

سعدیہ خان ______ کوئٹہ

پہلے شکوہ تھا یہاں رونق بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پیالہ ہے مگر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار ہی نہیں

تحریم فاطمہ ______ خان پور

یہاں برسے گی اب کرنوں کی بارش
کہ بادل آسمان سے چھٹ گیا ہے
بہت دشوار تھا منزل کا رستہ
خدا کا شکر، لیکن کٹ گیا ہے

حبیبہ خان ______ کراچی

امروز کا پردہ ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو
اک بھید انوکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے

نشاء ادریس ______ کراچی

مجھ کو تجھ میں جگہ نہیں ملتی
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

صائمہ شہزاد ______ حیدر آباد

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذب لہجے
پہلی بارش ہی میں یہ رنگ اتر جاتے ہیں

نادیہ یاسر ______ گوجر خان

فضا ہے معطر ہوا ہے خنک
یقیناً یہ رستہ تیرے گھر کا ہے

بقیہ ہمارے نام

بڑھنے کا رجحان تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔ اگر میں اپنی بات کروں تو میں بھی اسی یوتھ میں شامل ہوں مگر ایک ایسا پلیٹ فارم تھا۔ جس نے مجھے "ادب" کے ساتھ جوڑے رکھا۔ بالکل صحیح سمجھے آپ بلاشبہ وہ پلیٹ فارم "خواتین" ہی تو ہے۔

اگر بات 2024ء کے پہلے شمارے کی بات کی جائے۔ تو سروے میں واقعی نیا سال امید کی کرن لایا ہے۔ مگر شاید ایک لحاظ سے میرے لیے نہیں میں نے ایک افسانہ صراط مستقیم بھیجا تھا۔

اتنی محنت کے بعد نہ شائع ہو تو دکھ کرنا حق تو بنتا ہے ناں۔ "مجھ سے ملیے" میں غنی نام کچھ مختلف سا لگا۔ "سروے" میں اپنے جوابات سب سے زیادہ اچھے لگے (ہاہاہی ہی)

افسانوں میں "کھر اسکہ" بہت معصومانہ سا لکھا ہے عارفہ فضل شاہ نے۔ ویری گڈ ڈیر۔ "گماں دل کے" کیونکہ صغری بیگم جیسا برتاؤ کرنے والے لوگوں کا علاج قدرت نے اپنے پاس رکھا ہوتا ہے۔ "غزل" ندیم صاحب نے خوب لکھی بہت پسند آئی۔

"احد" اسٹوری اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اب اس کے بعد سمیرا حمید یا عمیرہ احمد سے لکھوایئے گا۔ "اسیر یاں" کو آسیہ رئیس نے بہت حساس ہو کر لکھا اچھی کہانی تھی۔

"چلو تم کو بتاتے ہیں" نگہت سیما نے ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔

"اففففف" نمرہ احمد ان کی بہت بڑی مداح ہوں۔ نفسیاتی الجھنوں میں عدنان صاحب نے شبانہ عظیم کو بے حد مفید مشورے سے نوازا ہے جو کہ "رنگ نگار پھول" میں آپ پر واجب نہیں سے مشابہہ ہے، جزاک اللہ "نفسیات کہتی ہے" تیسرا پوائنٹ خاص پسند آیا۔

"خود سے بات کیے بھی اب تو زمانے ہو جاتے ہیں۔"

ج: پیاری سعدیہ! واقعی یہ دکھ کی بات ہے کہ آپ نے محنت کی اور آپ کا افسانہ شائع نہیں ہوا لیکن آپ کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ کوشش کرتی رہیں کامیابی ضرور ہو گی۔

آپ کا افسانہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ آپ نے افسانہ ای میل کیا تھا یا ڈاک سے بھجوایا تھا؟ اور یہ بھی بتائیں کہ کب بھجوایا تھا؟

نصرت جبیں ملک......خوشاب

آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے تک میں خواتین کی باقاعدہ قاری رہی ہوں۔ مارکیٹ میں ابھی خواتین ڈائجسٹ آتا بھی نہیں تھا کہ دو تین مرتبہ چکر لگایا کرتی کہ شاید اب آ گیا ہو پھر بی بی سی اردو کے بیورو چیف پاکستان اختر سمو صاحب نے ڈیلی جناح میں میرا کالم دیکھا تو انہوں نے رابطہ کیا کہ آپ ہمارے اخبار میں کالم لکھیں۔

چنانچہ بی بی سی اردو کا حصہ بنی تو وقت کی کمی کی وجہ سے اپنے پیارے خواتین ڈائجسٹ سے دوری پیدا ہو گئی حالات کی گردش میں محبت دب جاتی ہے، مصروفیت کے رش میں پس پشت چلی جاتی ہے مگر مر نہیں سکتی۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی رات میں مجھے خواتین ڈائجسٹ کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی کہ جب کڑک چائے کا ایک دھواں اڑاتا کپ، گرم بستر، خاموشی اور اس میں خواتین ڈائجسٹ کا ساتھ ضرور تھا۔

سو دوبارہ سے یہ تعلق بحال کرنے کا فیصلہ کیا اور فوراً 15 نومبر کو خواتین کی سالانہ خریدار بن گئی۔ سرورق پر پیاری سی حسینہ موجود تھیں سب سے پہلے مستقل سلسلوں کو پڑھا۔ سب ہی دلچسپی سے بھرپور تھے پھر افسانوں کی طرف گئے تو فاتحہ رابعہ نے "گمان دل کے" میں ان لوگوں کی عکاسی کی جو خود پسندی اور تکبر کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ذات کے جس بناوٹی خول میں قید ہیں، دنیا اس سے بے پرواہ ہو کر پورے جوش سے رواں دواں ہے۔ "کھر اسکہ" میں عائشہ فضل نے معصوم اور سادہ دل لوگوں کو اجاگر کیا۔ واقعی دوہرے معیار والے

معاشرے میں فیکا جیسے کردار کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے گوشی جمال کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اپنی دکان خود چلاتی ہیں، یہ عورتوں کی ہمت کی ایک اچھی مثال ہے۔ باقی افسانے اور ناول ابھی پڑھ رہی ہوں کیونکہ میں اس ماہ کے آخر تک اس تڑکے سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری نصرت! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کا ٹوٹا رشتہ پھر استوار ہو چکا ہے۔ آپ کے افسانے موصول نہیں ہوئے، آپ دوبارہ ای میل کر دیں۔

ایچ ایس ایچ...... سمبڑیال

کیا یہ زیادتی نہیں کہ انتظار کی سولی پہ لٹکتے رہتے ہیں پورا مہینہ اور پھر خط ہی نہ شامل ہو تو کیا بیتتی ہے۔ ہم نے تو سوچ لیا تھا کہ پھر خاموشی اوڑھ لی جائے لیکن پھر ہمیں مجبور کیا تو ریحانہ چوہدری کے سروے نے، ان کی شاعری کا انتخاب بہت بھایا۔ ریحانہ جی کی شاعری نے اچھا اثر ڈالا۔

اب بات ہو جائے صوفیہ بٹ کے ناول ''احد'' کی تو شکر ہے احمل اور اسود کی شادی ہو جاتی ہے۔ احمل کی ماما پہ بڑا ترس آیا، ماں بچوں کی خوشی کے لیے کیسے کیسے طوفانوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ہمایوں کو بھی اس کی محبت واپس مل جائے گی۔ نگہت سیما کے ناول کا بھی مزہ آیا ''اسیر ہیاں'' آسیہ رئیس کا ہر بار کی طرح شان دار بیسٹ ناول تھا۔

افسانے سارے کے سارے ہی بیسٹ تھے ''یادیں باتیں'' کا بہت مزہ آیا انشاء جی اور اے حمید کے بارے میں پہلے بھی پڑھا تھا، جس میں اے حمید اپنی فرینڈ کے بارے میں بتاتے ہیں، وہ بھی پڑھ کر بہت ہنسے تھے، راحت جی کے ناول میں کہانی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے راحت جی اب جلدی سے ارم اور عفان کی شادی کروادیں اور وسیم اس کے بارے میں کیا کہیں، ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں ''میری بیاض سے'' زرینہ خانم لغاری، ارم کمال، نمرہ عاقب اور نایاب سندھو کی شاعری بہت پسند آئی۔

ج: پیاری بہن! آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ کی ناراضی بجا ہے لیکن ہماری مجبوری بھی اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ سارے خط شامل ہوں لیکن پچھلے ماہ چونکہ سروے بھی شامل تھا اس لیے خطوط کے حصے میں کم صفحات آئے۔

حسنہ حسین پاکستانی ہیں۔

طیبہ شوکت...... مریدکے

ٹائٹل گرل بہت پیاری تھی حمد ونعت سے دل کو منور کیا۔ میں ٹھہری چودہ سالہ بچی اب اسے ہر ماہ کون 500 دے تین سو ڈائجسٹ پہ لگ جاتے ہیں سو روپیہ کرایہ اور سو روپیہ خط پوسٹ کا اس لیے ہر ماہ میں خط پوسٹ نہیں کر سکتی، اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، انگنا پھول کھلیں گے میں ثانیہ خود سر کو جتنی بھی محبتیں مل جائیں اس نے کبھی خوش نہیں ہونا۔ صوفیہ جی...... کیا تعریف کروں آپ کی، رہ رہ کے مومنہ پہ غصہ آتا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آپی، میری نیچر بھی ایسے ہی ہے مجھے بھی امیر لوگ پسند ہیں، مالا تو مجھے اب کچھ زیادہ پسند آ گیا کیونکہ اب۔

ماہر اور مالا کی ملاقات جو ہونے لگی ہے مکمل ناول تو مزہ ہی دے گیا، افسانے سب ہی کمال کے میں نے کچھ ماہ پہلے کتابی شکل میں من وسلویٰ پڑھا تھا مگر آخری صفحہ پڑھنے سے پہلے ہی پھٹ گیا، کیا واقعی زینب اور کرم علی مرجاتے ہیں اور ہاں عدنان بھائی کے مجھے مشورے بہت پسند ہیں۔

ج: پیاری طیبہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنی کم عمری کے باوجود بہت اچھا خط لکھا ہے من وسلویٰ میں زینب مرجاتی ہے لیکن کرم علی زندہ رہتا ہے۔

☆☆



حالات بدلنا کس حد تک انسان کے اختیار میں ہے اور کس حد تک مقدر پر منحصر ہے۔ اس بحث سے قطع نظر صرف ایک بات کہنا ہے کہ اگر برے حالات میں ہمت ہار دی جائے تو حالات زیادہ برے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بھی زیادہ مشکلات میں گرفتار کر سکتا ہے۔ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو آخر میں ہر چیز کا نتیجہ بہتر ہی ہوگا۔ پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

تمام ماہرین علم اور ماہرین نفسیات محسوس کرتے لگے ہیں کہ نماز اور مستحکم مذہبی عقیدہ، پریشانی، ڈر، خوف اور اعصابی کشمکش کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کے ذمہ دار ہیں۔

''جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔''

ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے ''پریشانیوں کا شاہی علاج مذہب ہے۔''

ہمارے خیالات و تصورات ہماری شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ اگر ہم خوشی اور مسرت کے خیالات رکھیں تو ہم خوش اور مسرور رہ سکتے ہیں لیکن اگر اپنے خیالات کو بیمار بنا لیں یعنی خیالات کا انداز ایسا ہو جس میں ناکامی، بزدلی، یاسیت اور قنوطیت ہو تو یقینی طور پر ہماری کیفیت بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔

جہاں تک مسائل کا معاملہ ہے ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے لیکن پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ذہنی پریشانی دور کرنے کا بہترین حل یہ ہے کہ سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیں۔ یہ کہ یقین رکھیں کہ اللہ جو کچھ کرے گا بہتر کرے گا اور جو کچھ آج تک ہوا ہے اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ یہ یقین آپ کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا۔

شمائلہ انجم

س: میری عمر بیس سال ہے۔ میرے والدین نے میری شادی کی بات پکی کر دی ہے، اس کو تقریباً دو سال گزر گئے ہیں، مجھے اپنے منگیتر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی وہ سیدھا سادا سا کاروباری انسان ہے۔ شکل و صورت بھی بری نہیں، نہ مجھے وہ پہلے برا نہیں لگتا تھا لیکن اب جبکہ تین مہینے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ وہ زہر لگنے لگا ہے۔

وجہ ہے الف جو بری طرح ہر وقت میرے حواسوں پر سوار رہتا ہے۔ وہ لوگ ہمارے سامنے والے گھر کے اوپری حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے آئے ہیں۔ وہ شخص سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے اس کا مسکرانا، بات کرنا اور مجھے دیکھنا، اب مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے منگیتر سے شادی نہیں کر سکتی۔ الف بھی شاید مجھے پسند کرتا ہے لیکن میں کس طرح اپنا حال دل اس تک پہنچاؤں۔ میری ساس اور امی دونوں کپڑوں کے سلسلے میں میری رائے پوچھتی رہتی ہیں۔ گھر میں شادی کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پر میرا دل کسی بات میں نہیں لگتا۔ جی میں آتا ہے کہ صاف انکار کر دوں اس شادی سے۔

مینا نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں لڑکی ہو کر پہل کروں۔ شاید وہ بھی کسی موقع کا منتظر ہے۔

امی، ابو، بھائی، بھابھی سب گھر والے میری شادی کے حوالے سے بہت خوش ہیں کہ میں اس گھر کی اکلوتی لڑکی ہوں لیکن کوئی میری خوشی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتا، کئی بار اپنے گھر والوں کی خودغرضی پر بھی غصہ آتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

ج: عزیز بہن! جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں یہ سراسر حماقت اور نادانی ہے۔ اس شخص کو اگر آپ میں دلچسپی ہوتی یا وہ آپ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو اپنے گھر والوں کو بھیج کر رشتہ کی بات کرتا۔ اس طرح مسکرانا دیکھنا۔ بات کرنے کی کوشش کرنا صرف وقت گزاری کا مشغلہ ہے اور اس کے کردار کی کمزوری کہ وہ ایک کم عمر لڑکی کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سنجیدہ لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔ وہ سیدھے راستوں سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ابھی آپ بہت کم عمر ہیں۔ آپ کی سوچ ناپختہ ہے۔ ان ہتھکنڈوں کو سمجھ نہیں سکتیں۔ ذرا سوچیں کیا اس نے آپ سے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ آپ کے گھر والوں سے رشتہ کی بات کی؟ پھر کس بنا پر آپ اپنے منگیتر سے بیزار ہیں۔ اس معاملے میں پہل کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اس کا نتیجہ صرف رسوائی ہے۔

س، حور شمائل۔ حیدرآباد

میں اپنے گھر کی بڑی بیٹی ہوں مجھ سے چھوٹے تین بہن بھائی ہیں۔ میرے والد ایک معروف اخبار کے لیے کام کرتے تھے اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں ایک اسکول میں نوکری کرتی ہوں میرا رجحان سیاست کی جانب ہے۔

جب سے الیکشن کا اعلان ہوا ہے مجھ پر ایک ٹینشن سی سوار ہے۔ میری اپنی ساتھی ٹیچرز سے اکثر بحث ہوتی ہے اور بات بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے میری ساتھی مجھ سے خفا رہنے لگی ہیں۔

میری والدہ مجھے بہت سمجھاتی ہیں کہ اپنی جاب پر توجہ دو، کل کو تمہیں دوسرے گھر جانا ہے، یہ سیاسی جنگیں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گی لیکن میرا اپنا موقف ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی ترقی کے لیے سوچنا چاہیے اور آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے۔ میری خالہ جو میری ہونے والی ساس بھی ہیں، وہ بھی میرے سیاسی تبصروں اور بحث سے خائف رہتی ہیں۔ میں کیا کروں؟ کیا میں اپنے لب سی لوں۔ کیا اپنے ملک کو برباد ہوتا دیکھوں؟

ج: عزیز بہن آپ کا موقف غلط نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے موقف کو غلط سمجھتی ہوں۔ موجودہ حالات میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جب انسان دوسرے کی بات ہی نہ سننا چاہے۔ بحث کرنا، یا کسی موضوع پر بات کرنا بےکار ہے۔ آپ اپنی بات ضرور کہیں لیکن نرمی سے کہیں، ان سے کہیں کہ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے اپنا موقف بتا کر خاموش ہو جائیں۔ ویسے زیادہ بہتر ہے کہ سیاست پر بات ہی نہ کریں۔ آپ کی کولیگز کو سیاست سے چڑ نہیں ہے۔ آپ کے موقف سے چڑ ہے۔ ظاہر ہے آپ اپنا موقف نہیں بدل سکتیں تو پھر اس موضوع سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

ایک ضروری بات۔ اپنی خالہ سے تو ہرگز بحث نہ کریں۔ وہ صرف آپ کی خالہ نہیں ہونے والی ساس بھی ہیں۔ رشتوں میں کھٹاس نہیں آنا چاہیے۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

فرحت حسین......ساہیوال

س: میری جلد چکنی ہے، جاتی سردی کا موسم ہے چہرے کی تازگی کے لیے کوئی اچھا سا اور کینک ماسک بتادیں؟

ج: سردی کے موسم میں جلد کے لیے انڈے کا استعمال بہترین ہے یہ خشک اور چکنی جلد کے لیے بہترین ہے۔ انڈے کی زردی میں فیٹی ایسڈ ہوتے ہیں جو جلد کو نمی پہنچاتے ہیں۔ سفیدی میں البومن نامی پروٹین ہوتا ہے، جو مسامات کو کھلنے نہیں دیتا آپ کی جلد خشک ہے۔ آپ ایک انڈا لے کر پھینٹ لیں۔ اسے آدھا کرلیں پھر اس میں ایک چمچہ شہد ڈال کر مکس کرلیں۔ یہ ماسک چہرے اور گردن پر لگالیں۔ جب خشک ہوجائے تو گرم پانی سے دھولیں۔

فریحہ نسیم......ملتان

س: سردیوں میں نہانے کے بعد میری جلد خشک اور روکھی ہوجاتی ہے میں کیا کروں کوئی آسان علاج ہے؟ میری عمر بیس سال ہے۔

ج: سرد موسم جلد کو خشک اور روکھا کردیتا ہے۔ ہر بار چہرہ یا ہاتھ منہ دھونے کے بعد موئسچرائزنگ لوشن ضرور استعمال کریں۔ اپنی جلد کو موائسچرائزر کے ذریعے غذا فراہم کرنے سے نا صرف آپ خشکی اور روکھے پن سے محفوظ رہ سکتی ہیں، بلکہ آپ کی جلد پر عمر رسیدگی کے اثرات، جھریاں بھی قبل از وقت نمودار نہیں ہوں گی۔ گلیسرین ایک اعلاقسم کی موئسچرائزنگ ایجنٹ ہے ایک بوتل میں گلیسرین اور پانی ہم وزن لے کر مکس کرلیں۔ آپ اس محلول کو اپنے ہاتھوں، پیروں اور چہرے کی جلد پر بطور موئسچرائزر استعمال کر سکتی ہیں۔

سردیوں میں زیادہ گرم پانی جلد کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر نہانے کے پانی میں چند قطرے زیتون یا بادام کا تیل ڈال لیں تو غسل کے بعد بھی آپ کی جلد، خشکی اور روکھے پن کا شکار نہیں ہوگی۔ بال دھونے کے لیے بھی نیم گرم پانی استعمال کریں۔

نیلما فراز......کوٹ رادھا کشن

س: میری بیٹی کی اسکن بہت مرجھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اپنی ہم عمر لڑکیوں میں اس کی شخصیت دب جاتی ہے، ابھی میٹرک میں ہے، میں اس کی جلد کے لیے بہت پریشان ہوں؟

ج: آپ کی بیٹی ابھی اسکول میں ہے۔ وہاں دھوپ وغیرہ میں کھیلنے سے بھی جلد پر اثر پڑتا ہے۔ آپ مہنگی کریم اور لوشن کے بجائے آپ غذا سے اس کا علاج کریں۔ ابھی سردیاں ہیں آپ سبزی اور پھل کا استعمال کروائیں۔ اس عمر میں بچیاں تلی ہوئی تیز مصالے والی چیزیں پسند کرتی ہیں، آپ انہیں رسیلے پھلوں کو کھانے کی عادت ڈالیں۔ انار کھلائیں جلد شاداب اور تروتازہ رکھنے میں انار کا کوئی ثانی نہیں اناس میں وٹامن سی کا خزانہ ہے۔ یہ جلد کو قدرتی طور پر صاف وشفاف بناتا ہے، کیلے میں موجود پوٹاشیم نمی سے محروم جلد کو تر کرتا ہے اس میں موجود وٹامن ای اور سی جلد کو چمک دار بناتے ہیں۔ شریفہ کھلائیں اس میں موجود وٹامن اے اور سی جسم میں موجود فری ریڈیکلز سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ جلد کو قدرتی طور پر نمی فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک بہترین قدرتی اسکرب بھی ہے۔ پپیتے میں وٹامن اے کے علاوہ ایسے انزائم پائے جاتے ہیں۔ جو جلد کو چمک دار بناتے ہیں۔ بطور اینٹی اکسیڈنٹ کام کرتا ہے۔

☆☆